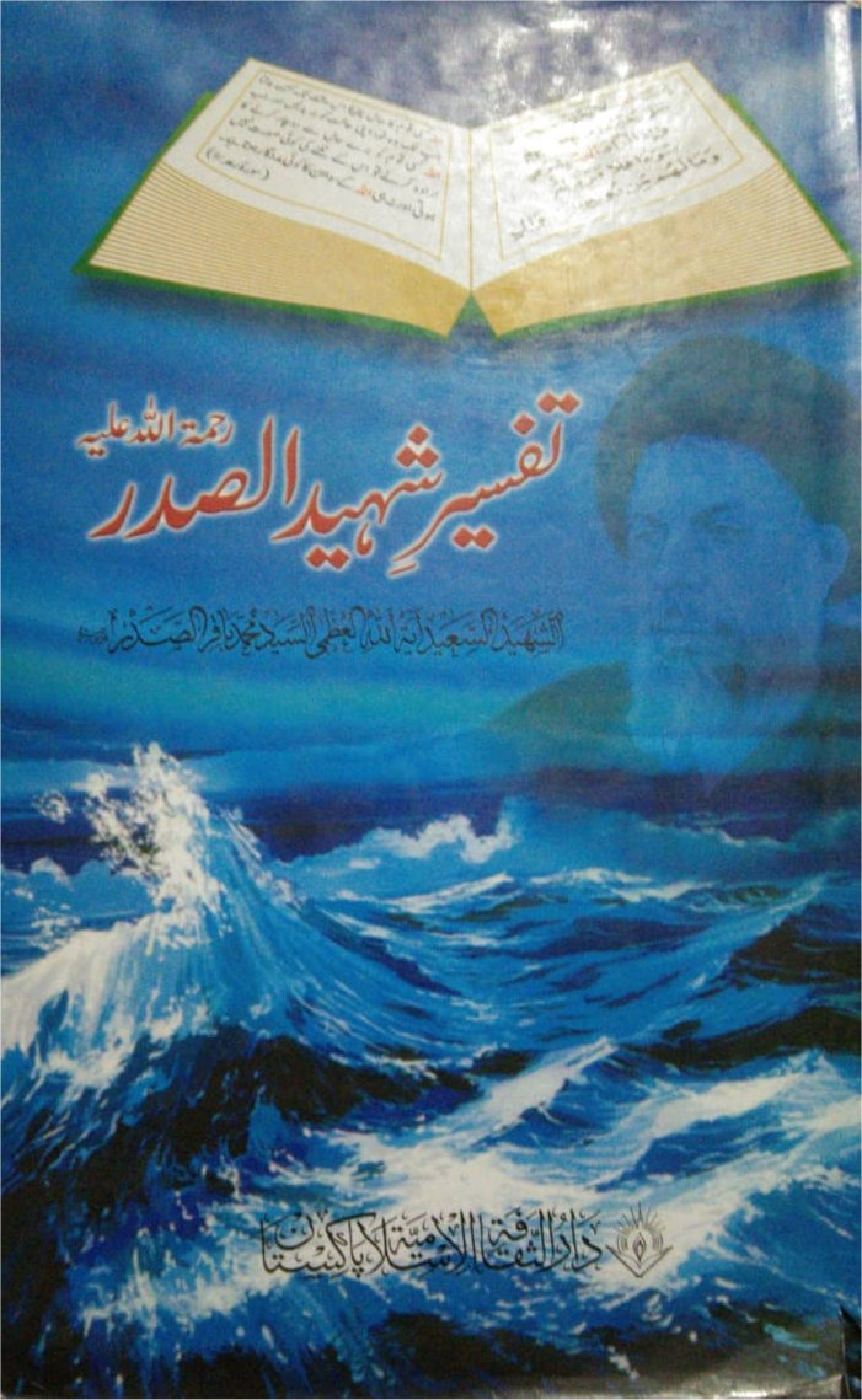
رحمۃ اللہ علیہ
تفسیرِ شہید الصدر
الشہید السعید آیۃ اللہ العظمی السید محمد باقر الصدر
دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

ہم اسلام کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟ (۶)

معارفِ قرآن (۲)

تفسیرِ شہید الصدر رحمۃ اللہ علیہ

تألیف

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الامام الشہید السعید السید محمد باقر الصدرؒ

ترجمہ

سید علی شرف الدین موسوی

دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب ------------------ تفسیر شہید الصدر رحمۃ اللہ علیہ

تالیف ------------------ حضرت آیت اللہ العظمیٰ الامام الشہید السعید السید محمد باقر الصدرؒ

ترجمہ ------------------ سید علی شرف الدین موسوی

ناشر ------------------ دار الثقافۃ الاسلامیہ پاکستان

طبع اول ------------------ محرم الحرام ۱۴۲۴ھ

طبع دوم ------------------ شعبان ۱۴۴۱ھ

ہم اسلام کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَام

وَ مَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ ديناً فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَ هُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخاسِرين

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔اور جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین کا خواہاں ہوگا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور ایسا شخص آخرت میں خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوگا (آل عمران ۱۹۔۸۵)

وَ جَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلى وَ كَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيا

اوراس نے کافروں کا بول نیچا کر دیا اور اللہ کا بول تو اونچا ہی ہے (توبہ۔۴۰)

حضرت علی نے فرمایا:

اللہ نے اپنے رسولؐ کو چمکتے ہوئے نور، روشن دلیل کھلی ہوئی راہ شریعت اور ہدایت دینے والی کتاب کے ساتھ بھیجا اللہ نے آپ کو کفایت کرنے والی حجت، شفا دینے والی نصیحت۔گزشتہ تمام امور (جہالتوں) کی تلافی کرنے والی دعوت کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ذریعہ سے (شریعت کی) نامعلوم راہیں آشکار کیں اور غلط سلط بدعتوں کا قلع قمع کیا اور (قرآن وسنت میں) بیان کئے ہوئے احکام واضح کئے لہٰذا اب جو شخص بھی اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرے گا تو اس کی شقاوت مسلّم اور ریسمان حیات بکھر جائے گی اور اس کا منہ کے بل گرنا سخت و (ناگزیر) ہو جائے گا اور انجام کار دائمی حزن والم اور شدید ترین عذاب ہوگا (نہج البلاغہ خطبہ۔۱۶۱)

لا شرف اعلی من الاسلام اسلام سے بلند تر کوئی شرف نہیں ہے (نہج البلاغہ قصار ۳۷۱)

يا أَيُّهَا الَّذينَ آمَنُوا
إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ وَ يُثَبِّتْ أَقْدامَكُم

اے ایمان والو! اگر تم اللہ (اسلام، شریعت) کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمھاری مدد کرے گا اور تمھیں ثابت قدم رکھے گا (محمد۔۷)

وَ لَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرى‏ آمَنُوا وَ اتَّقَوْا لَفَتَحْنا عَلَيْهِمْ بَرَكاتٍ مِنَ السَّماءِ وَ الْأَرْض

اور اگران بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے (اعراف،۹٦)

قُلْ إِنَّما أَعِظُكُمْ بِواحِدَةٍ أَنْ تَقُومُوا لِلَّهِ مَثْنى‏ وَ فُرادى‏

اے نبیؐ کہہ دیجئے کہ میں تمھیں صرف ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں کہ تم اللہ کیلئے اکیلے اکیلے اور دو دو مل کر اٹھ کھڑے ہو (سباء۔۹٦)

اے نبیؐ، کہہ دو کہ اگر تمھارے باپ، اور تمھارے بیٹے، اور تمھارے بھائی، اور تمھاری بیویاں، اور تمھارے عزیز و اقارب، اور تمھارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں، اور تمھاری وہ تجارت جس کے بند ہونے کا تمھیں خوف ہے اور تمھاری پسند کے مکانات اگر تمھیں اللہ اور اس کے رسولؐ اور راہ اللہ میں جہاد سے عزیز ہیں تو ٹھہرو! یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمھارے سامنے لے آئے، اور اللہ فاسقوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔ (المائدہ۔۲۴)

حضرت علی نے فرمایا:

ان لوگوں (انصار) نے اللہ کی قسم اپنی دولت کے ساتھ ساتھ اپنے فیاض ہاتھوں اور اپنی تیر کی طرح چلتی زبانوں سے، اسلام کی اس طرح پرورش کی جس طرح ایک سالہ بچھڑے کی پرورش کی جاتی ہے۔ (نہج البلاغہ قصار۔۴٦٦)

یاد رکھو کہ کسی بندہ اللہ پر اگر زمین و آسمان کے راستے بند ہو جائیں اور وہ تقوائے الٰہی اختیار کر لے تو اللہ اس کیلئے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکال دے گا۔ دیکھو تمھیں صرف حق سے انس، دلچسپی اور باطل سے خوف و وحشت ہونی چاہیئے (نہج البلاغہ۔۱۳۰)

۱۔بعض لوگ منکرات کا انکار دل، زبان اور ہاتھ سب سے کرتے ہیں تو یہ خیر کے تمام شعبوں کے مالک ہیں۔

۲۔بعض لوگ صرف زبان اور دل سے انکار کرتے ہیں اور ہاتھ سے روک تھام نہیں کرتے تو انہوں نے نیکی کی خصلتوں کو حاصل کیا اور ایک خصلت کو برباد کر دیا۔

۳۔بعض لوگ صرف دل سے انکار کرتے ہیں اور نہ ہاتھ استعمال کرتے ہیں اور نہ زبان تو انہوں نے دو خصلتوں کو ضائع کر دیا ہے اور صرف ایک کو حاصل کیا ہے۔

۴۔بعض وہ ہیں جو نہ زبان سے، نہ ہاتھ سے، اور نہ ہی دل سے برائی کی روک تھام کرتے ہیں، یہ زندوں میں (چلتی پھرتی ہوئی) لاشیں ہیں۔ (نہج البلاغہ قصار۔۳۷۴)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

ناشران کتب کسی کتاب کونشر کرتے وقت کتاب اوراس کے مؤلف سے متعلق چندصفحات کتاب کے ابتدائی حصّہ میں پرعرض ناشر کےعنوان سے رقم کرتے ہیں تاکہ وہ کتاب قارئین کرام کی زیادہ سے زیادہ توجہ کا سبب بنے۔دارالثقافۃ الاسلامیہ پاکستان نے بھی اسی سنتِ حسنہ کو جاری رکھتے ہوئے ہر کتاب میں جتناممکن ہوسکا عرض ناشر کےعنوان سے چندصفحات بیان کرنے کی سعادت حاصل کی۔

اس دفعہ خداوند متعال نے ہمیں یہ توفیق عنایت کی ہے کہ اس صدی کی ایک عظیم شخصیت کے آثار علمی اوروہ بھی قرآن عظیم سے متعلق جو اپنے موضوع اورنوعیت دونوں حوالوں سے منفرد اورنئ تخلیق ہے نوزاد ہیں آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت نصیب ہو رہی ہے یہ حضرت آیت اللہ شہید سید محمد باقر الصدر (رضوان اللہ علیہ) کے آثارقرآنی ہیں۔موضوع کتاب اورمولف دونوں کی تعریف ہماری بساط بیان واحاطۂ قلم میں نہیں آتی کہ اس سلسلہ میں کچھ تعریف کروں کیونکہ جوشخص انواع واقسام خصوصیات وامتیازات کا حامل ہواس ے بارے میں کچھ لکھنا سورج کے نور کے مقابلے میں کھڑے ہوکراس کی حدود وابعاد کا جائزہ لینے کے مترادف ہے یعنی جس طرف کھڑے ہیں اس سمت کو دوسرے سمت پر ترجیح نہیں دے سکتے۔عام طور پراس حوالے سے جوسنت اورطریقے رائج ہیں وہ یہی ہیں کہ اس شخصیت کی تاریخ پیدائش،ان کے والدین،خاندان، اساتید بزرگوار،محیط وماحول،مدرسہ اورحوزے کے کردارکوتحریر میں لاتے ہیں اور یہ شخصیت کن شخصیات سے متأثر ہوئی ہے اسکا ذکر کیا جاتا ہے۔اس عظیم الشان شخصیت کے بارے میں اس انداز سے تعریف ایک حوالے سے تکرار ہوگی۔عالم اسلامی کا کوئی بھی بینا و دانا

بالخصوص قارئینِ صفحاتِ علمی کی نظروں سے چندین باران سے متعلق تحریریں گزری ہونگی لہذا ان کے لئے ہماری تعریف تحصیل لاحاصل ہوگی کیونکہ اس عظیم ہستی کے آثاریاان کی سوانح حیات کو پیش کرنے والی ہماری یہ پہلی اشاعت نہیں بلکہ ہمارے ادارے کو خداوند متعال نے یہ توفیق والطاف عنایت کی ہے کہ اس عظیم ہستی سے منسوب چندین بار ملکی اورعلاقائی سطح پر سیمینارومجلس مذاکرہ کے ساتھ ان کے چند آثار کوبھی زیورطباعت سے آراستہ کیا ہے۔

اسی طرح اس عظیم ہستی کی شخصیت سازی میں ان کے گھرانہ وخاندان،محیط وماحول،حوزہ اورشخصیات کے کردار کو بیان کرنا بھی قرین قیاس سے خارج ہے کیونکہ اس خاندان اوراس پر محیط ماحول اورحوزے سے سینکڑوں شخصیات اعلیٰ پایہ کے علمی شہرت حاصل کرنے والی وابستہ ہیں اورکسی نہ کسی موضوع میں امتیازِ خاص رکھنے والی شخصیات ہیں لیکن وہ سب اس عظیم شخصیت کی خصوصیات اورامتیازات کے مقابلے میں بہت فاصلے پر ہیں۔اس شخصیت کی خصوصیات اور امتیازات کے مصدروماخذ کونہ خاندان،نہ محیط وماحول اورنہ ہی حوزہ یااعلیٰ پایہ کے اساتید سے منسوب کیا جاسکتا ہے کیونکہ ایک سانچہ سے نکلنے والی پیداوار میں مماثلت ہوتی ہے ان میں کوئی انوکھا نہیں ہوتا۔ ان کے اساتید بزرگواروں میں سے ایک ان کے برادر بزرگ حضرت علامہ اسماعیل الصدر تھے جن کوعلمی میدان میں انھوں نے انکی حیات میں ہی پیچھے چھوڑا ان کے علاوہ آپ کے اوربھی اساتید برجستہ تھے لیکن نہ ان کے اساتید نہ ہی ان کے سینکڑوں شاگردمیں سے کسی نے بھی ان کی نبوغ علمی اوردیگرخصوصیات ابداع وابتکاری اوردیگرمزایا کے ساتھ دور کا بھی واسطہ یارابطہ نظر نہیں آتا بلکہ ہم اتنا کہنے پر اکتفا کریں گے کہ یہ شخصیت اس صدی کے لئے خدائے قادرومتعال کی طرف سے ایک خاص موہبت تھی جو اپنی نوعمری میں تمام کمالات وفضائل کی منازل طے کرنے کے بعد شہید ہونے والے یحییٰ ءِ زمان تھے لیکن یہ ہستی معصوم نہیں تھے کیونکہ معصوم کا تسلسل محدود اوراسکے سلسلہ پرختم کی مہرثبت ہوگئی ہے۔

کتاب ہٰذا شہید الصدرؒ کی ان تلخ اور نا گوار حالات اور ماحول کے بارے میں ان کی اندرونی دل سوزی اور کرب واضطراب کی ترجمان ہیں۔ایسے حالات سے گزرنے والا انسان اگر مومن نہ ہوتو خودکشی کرتا ہے اگر خدا وآخرت دین ودیانت پر عقیدۂ راسخ رکھنے والا ہے تو خود کو شہادت کیلئے آمادہ کرتا ہے۔ یہ انکی زندگی بھر کی اسلام و مسلمین کی درد اور دوا کی تشخیص کا آخری خلاصہ اور نچوڑ ہے۔ایک چوتھائی صدی زحمت ومشقت کے ساتھ بابرکت زندگی گزارنے کے بعد زندگی کے آخری لمحات کو اپنے گردونواح میں اسلام و مسلمین کیلئے تنگ وضیق، کفر وشرک اور باطل کے بڑھتے ہوئے تسلط کے بارے میں اپنے آپ کو سورۂ مبارکہ نور کی ان آیات کریمہ کے مصداق پایا اور دین ومکتب کی سربلندی کو فلسفہ تاریخ کے حقیقی ادراک اور تشخیص میں پاکر چودھویں صدی ہجری کے سورج کے غروب کے موقع پر یہ آپ کا شفقتہ تھا۔فلسفہ تاریخ شہید الصدرؒ کی اختراع واکتشافات میں سے نہیں ہے لیکن فلسفہ تاریخ کو قرآن کریم کی آیات کریمہ کی بنیادوں پر پیش کرنے کا اعزاز وافتخار آپ ہی کو حاصل رہا ہے۔لیکن کس شکل وصورت اور انداز میں پیش کیا اس کی تفسیر وتشریح سے پہلے ضروری ہے کہ تاریخ اور فلسفہ تاریخ میں تمیز کریں۔

تاریخ زمانہ میں وقوع پذیر ہونے والے حادثات کو کہتے ہیں۔یہ حادثات جو انسانی اجتماع اور معاشرے سے متعلق ہیں انہیں تاریخ اقوام وملل کہتے ہیں۔وہ واقعات اپنی جگہ زمان ومکان سے مخصوص ہیں وہ کسی زمان ومکان میں قابل نقل وانتقال نہیں ہیں۔ بطور مثال سنہ ۶۱ ہجری کو سرزمین عراق کے دریائے فرات پر وقوع ہونے والے حادثہ کو آپ کسی بھی دوسرے زمان ومکان میں منتقل نہیں کرسکتے۔حسین ابن علیؑ اور آپؑ کا یاران اب کسی یزید وابن سعد کی رسائی میں نہیں ہیں وہ اس عالم وحشت اور درندگی سے عالم جنت رضوان میں امن خدا میں منتقل ہوئے ہیں۔یزید وابن زیاد، شمر وسنان جہنم برزخ میں غلاّظ وشداد کے تازیانوں کے نیچے حسرت وندامت، آہ وفغان میں دبے ہوئے ہیں۔سرزمین کربلا اب بھی اسی جگہ پر ہے وہاں سے کہیں ایک انچ کے فاصلہ پر بھی منتقل نہیں

ہوئی۔سورج جس دن جسد پاکِ حسینؑ وشہداءِ کربلا کی زیارت کرنے کے بعد غروب ہوا تو پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ بلکہ وہ ہمیشہ کی مانند نئے افق سے طلوع ہوا ہے۔لیکن تاریخ کے یہ واقعات بطور صُدفہ یا اتفاقی کے طور پر وقوع پذیر نہیں ہوتے بلکہ کسی اسباب وعلل کے نتیجے میں رونما ہوتے ہیں۔

فلسفہ تاریخ:۔

کسی واقعہ یا حادثہ کے اسباب وعلل کا علم ہونے کے بعد ایسا واقعہ دوبارہ کسی اور مکان وزمان میں پیش آنے کے بارے خدشہ ظاہر کرنے یا پیش گوئی کرنے کو فلسفہ تاریخ کہتے ہیں یعنی یہ حادثہ جو وقوع پذیر ہوا ہے وہ ان اسباب وعلل کے تحت وجود میں آیا ہے اس کے تحت یہ اسباب وعلل کسی بھی دوسرے مکان وزمان میں وجود میں آئے تو ایسا واقعہ تکرار ہوگا اس تکرار کا حکم دینے کو فلسفہ تاریخ کہتے ہیں۔مثال کے طور پر واقعہ کربلا میں ایک فریق امام حسینؑ ہیں اور دوسرا فریق یزید ہے اور آپس میں نقطہ اختلاف اور جنگ کا سبب خلافت مسلمین ہے۔امام حسینؑ یزید کی تخت نشینی سے راضی نہیں ہیں اور یزید اپنے خلاف امام حسینؑ کے اس اقدام سے راضی نہیں ہے۔فلسفہ تاریخ کے طالب علم کا ایک گروہ اس کی روشنی میں دیکھے گا کہ یزید صفت حاکم کو برسر اقتدار لانے کیلئے کن اسباب وعلل سے متوسل ہونا چاہئے۔فلسفہ تاریخ کا دوسرا گروہ بھی یہ تحقیق کرے گا کہ اسلام و مسلمین کی تقدیر بدلنے اور ابتری، بدتری روکنے کیلئے کن اسباب وملل کو مزید آگے بڑھنے سے روکنا ہی واحد علاج ہے۔فلسفہ تاریخ کے ماہرین کے نزدیک ایسے واقعات اچانک بطور صُدفہ یا طفرہ وجود میں نہیں لاسکتے اور نا ہی اسباب وعلل کے فراہم ہونے کے بعد اس کے آثار و نتائج کو روکا سکتا ہے۔اس واقعہ کے حامی اور مخالف دونوں گروہ کو اسباب وعلل کو آگے بڑھانے یا روکنے میں معاون ہوگا۔اس واقعہ سے بچنے کیلئے ان اسباب وعلل کو آگے بڑھنے سے روکے یا پیچھے کھینچے۔

امت اسلامی کو درپیش مسائل کیا ہے اور شہید صدرؒ ان مسائل کا حل آیت قرآنی کے رو

سے کیا بیان فرماتے ہیں؟ شہید الصدرؒ کے مطابق عصر حاضر میں امت اسلامی کو در پیش سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ دنیا کی کفر وشرک اور ظلم پیشہ قوتیں اس کی قیادت ورہبری کررہے ہیں یا خود امت کی یہ خواہش ہے کہ وہ ان کی تاسی اور پیروی کریں تاکہ ان کے خیال کے تحت اس کے ذریعہ دنیا کے تمدن وترقی کے منازل سے قریب ہوسکیں ۔اس افسوس ناک صورت حال سے بچنے کیلئے شہیدؒ نے اس کا لائحہ عمل آیات قرآنی سے استنتاج اور استخراج کرکے عام فہم زبان میں پیش کیا ہے۔انھوں نے ان اسباب وعلل کو سنن اجتماعی یا سنن تاریخی کا نام دیا ہے۔یہ سنن قرآن کی ان آیات سے ماخوذ ہیں جن میں کلمہ سنت استعمال ہوا ہے ۔تاریخ کا کلمہ قصص قرآنی کی آیات سے ماخوذ ہے۔کتاب حاضر اس قانون کی تعریف اور طریقہ استعمال کا نیا مسودہ ہے جسے شہیدؒ نے اپنے آخری ایام میں پیش کیا ہے۔شہید الصدر رضوان اللہ تعالیٰ علیہ نے امت اسلامی کی موجودہ صورت اور حالت زار کو ان نکات میں خلاصہ فرمایا ہے:

۱۔ امت اس وقت مغربی یورپی سیاست کی اندھی پیروی پر گامزن ہے۔

۲۔ اپنے ملک میں زمین کے اندر موجود ذخائر اور زمین کے باہر سرحد سے مارکیٹ تک اقتصاد کے تمام دروازے مغرب والوں کیلئے کھول رہے ہیں۔

۳۔ فکر، ثقافت، بودوباش میں ان کی پیروی کو اپنے لئے اعزاز وافتخار قرار دیتے ہیں۔

امت اسلامی کے بارے میں شہیدؒ کے ملاحظات اور تأثرات کو ہم نے اپنے ملک میں معلیٰ پڑھا، دبنگ آواز میں سنا، سیرت جلی میں دیکھا، بعض مسلمان ومومن کہ جن کے بارے میں یہ تأثر تھا کہ یہ اس ملک میں دین وامانتداری کا نمونہ پیکر ہیں لیکن ان کے دین ودیانت چند رکعت نماز اور چند دیگر رسومات تک محدود رہے اور اسلام کے خلاف اس ملک میں ہونے والی مہم جوئیوں کے خلاف کوئی کردار پیش کرنے کے بجائے ساری جائداد فروخت کرکے مغرب کی طرف یہ کہہ کر ہجرت کی کہ وہاں جینے میں سہولت ہے۔اسی طرح کچھ حلقے ،گروہ، اہل ایمان کو اسلام کے بارے میں سبز باغ دکھارہے تھے لیکن ان کے

آئین سازی اور فیصلوں کے اوراق میں دین کے بارے میں کوئی آئین ولائحہ عمل کا ذکر تو درکنار ان کے تاریخ نشر واجراء کے بارے میں اسلامی تاریخ، مغربی تاریخ پر جاگزین نہیں ہوئی۔ان کے دعوے صرف اسلام کے سبز باغ تھے اور باقی تمام بودوباش اور ثقافت ،آرزوؤں کا خلاصہ یہ تھا کہ ہماری ترقی اور تمدن کی گاڑی مغرب میں ہی جاکر رکتی ہے۔ان حقائق وپس منظر، تلخ حالات کو سامنے رکھتے ہوئے کسی گروہ یا سرپرست کے انتظار میں رہنا فریضۂ دینی سے تساہل برتنے کے مترادف ہے۔ ہر شخص جہاں بھی ہو جس سطح پر بھی ہے اپنی استطاعت وگنجائش کے تحت قرآن کی صدا کو بلند کرنے کی ضرورت ہے۔یہی وصیت امیر المومنین علیؑ بھی ہے اور ان کے بعد انکے راستے پر چل کر شہید ہونے والے شہداء کا پیغام بھی ہے اور قیامت کے دن پیغمبر اکرمؐ کے حضور میں حاضری دیتے وقت ان کے لئے ان کا پسندیدہ تحفہ ہے اور ان کی غیظ وغضب اور نفرین سے نجات کا واحد ذریعہ ہے۔

تمہید

الحمد لله الذی جعلنا من ا لمتمسکین بالقرآن العظیم و بنبیہٖ وصفیہٖ ونجیبہٖ وحبیبہ وسیدنا و امامنا و امام الانبیاء والائمۃ المعصومین محمدؐ و عترتہٖ الطاھرین صلواۃ اللہ وصلواۃ المصلین نَتبرا من اعدائھم و اعداء اللہٖ اجمعین من الآن الیٰ قیام یوم الدین.

موضوع معارف قرآن کریم ان موضوعات میں سے نہیں جسے کسی مایۂ ناز، علمی تبحر کی حامل شخصیت سے اس کے دقائق وباریکیوں کی موشگافی یااس کی شرح صدر کر کے ،مغزلب کونکال کر،تشنگان وگرسنگان کے لئے سفرۂ خوان پر رکھیں اور قیصری وآملی جیسے آ کر فصوص الحکم کے سینے کو چاک کر کے عرفان کے بھوکے فقراء کے مائدہ پر رکھیں تا کہ ایسی کتابوں کے پیچیدہ اور غریب الفاظ کے نیچے موجود معارف کونکال سکیں اور قارئین ومدرسین کے لئے تحیر وسرگردانی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوجائے کیونکہ ان معارف اور بندگان کے درمیان واحد رکاوٹ یہی الفاظ وکلمات ہیں جبکہ قرآن کریم ایسی کتاب نہیں ہے، جیسا کہ خوداسی کتاب میں تکرار ہے کہ ’’یہ ایک واضح اور عیاں زبان میں بیان ہوا ہے‘‘

قرآن اوراس کے معارف کے تشنگان کے درمیان حائل رکاوٹ اس کے وہ الفاظ نہیں ہیں جو عربی حروفِ تہجی سے بنے ہیں بلکہ اس کے کلمات ،کلمات اللہ ہیں جن کے بارے میں سورۂ کہف کی آیت نمبر ۱۰۹ میں فرمایا ہے: ﴿قل لو کان البحر مدادًا لکلمٰت ربی لَنفدالبحر قبل ان تنفد کلمٰت ربی ولو جئنا بمثلہٖ مددًا﴾ ’’کہہ دیجئے: میرے پروردگار کے کلمات (لکھنے) کے لئے اگر سمندر روشنائی بن جائیں تو سمندر ختم ہوجائیں گے لیکن میرے رب کے کلمات ختم نہ ہوں گے اگر چہ ہم اتنے

ہی مزید سے کمک رسائی کریں‘‘ ﴿ولوانما فی الارض من شجرۃ اقلامٌ والبحر یمدہ من بعدہٖ سبعۃ ابحرٍ ما نفدت کلمٰتُ اللہ ان اللہ عزیز حکیم.﴾ اور اگر زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور سمندر کے ساتھ مزید سات سمندر مل (کر سیاہی بن) جائیں تب بھی اللہ کے کلمات ختم نہ ہوں گے۔ یقیناً اللہ بڑا غالب آنے والا حکمت والا ہے۔(لقمان/ ۲۷)اس کے بیان کی تحریر میں سمندروں کی سیاہی ،درختوں کے قلم ناکافی ہیں کوئی غواص اس بحر بے کراں کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا ہے چنانچہ اس کتاب کے پہلے شاگرد علی ابن ابی طالبؑ نے اپنے بعض بیان میں فرمایا ہے:

﴿وان القرآن ظاھرہ انیق وباطنہ عمیق لاتفنیٰ عجائبہ ولاتنقضی غرائبہ ولاتکشف الظلمات الابہ﴾ ’’یہ قرآن وہ ہے جس کا ظاہر خوبصورت اور باطن عمیق اور گہرا ہے اس کے عجائب فنا ہونے والے نہیں ہیں؟ اورتاریکیوں کا خاتمہ اس کے علاوہ اور کسی کلام سے نہیں ہوسکتا ہے‘‘

(نہج البلاغہ خطبہ/ ۱۸اص ۵۸)

اس کے عمق اور گہرائی تک کوئی نہیں پہنچ سکتا ہے۔ہم اس بات سے اختلاف نہیں کرتے کہ جس طرح ہم نے پہلے بیان کیا ہے کہ قرآن سمجھنے کے لئے آسان کتاب ہے جس طرح سمندر کی کسی جگہ سے بھی کوئی پانی پی سکتا ہے غواصی کرسکتا ہے لیکن اس کی تہہ تک محدود افراد ہی جاسکتے ہیں اسی طرح قرآن بھی اوقیانوسِ معارف ہے کہ جس میں داخل ہونے والے کو مشرق ومغرب، اوپر اور تہہ کا پتہ نہیں چلتا۔سورج سمندر سے طلوع ہوتا ہے اور سمندر میں ہی غروب ہوتا ہے نیچے پانی ہے اوراوپر دیکھیں تو پانی کا رنگ منڈھلایا ہوا ہے ،سمندر میں غوطہ لگانے والا خود کو پابرہوا محسوس کرتا ہے۔فہم وادراک قرآن کریم پہلے مرحلے میں دوحصوں میں تقسیم ہوتا ہے ایک قرآن کے متن سے باہر یعنی اس کتاب کے گردونواح اس کے گوشہ وکنار لیکن اسی سے متعلق مسائل اور مباحث میں بحث وتحقیق کرنا ہے۔اس قسم کی بحث کو اصطلاح قرآن فہمی کے تحت علوم قرآن کہتے ہیں۔ یہاں سے مناسب ہوگا کہ

اس زاویئے کی کچھ وضاحت اور معلومات قارئین کرام کی خدمت میں پیش کریں۔

علوم قرآن:۔

اسلامی علوم میں سے ایک علوم قرآن ہے لیکن یہ اصطلاح کب سے شروع ہوئی؟ مشہور یہ ہے کہ یہ اصطلاح ساتویں صدی سے شروع ہوئی۔ لیکن صاحب کتاب مناھل العرفان تالیف علامہ محمد عبدالعظیم زرقانی نے اپنی کتاب کی پہلی جلد صفحہ ۲۷ پر لکھا ہے کہ مجھے ایک قلمی کتاب دارالکتب المصری سے ملی ہے جسکے مؤلف علی ابن ابراہیم بن سعید حوفی متوفی ۳۳۰ھ ہیں جسکا نام البرھان فی علوم القرآن ہے اور یہ ۳۰ جلدوں پر مشتمل ہے لیکن ہم نے صرف ۱۵ جلدیں دیکھیں۔ علوم قرآن کے نام سے لکھی گئی چند کتابوں کا تذکرہ پیش خدمت ہے:

☆منهج القرآن فی علوم القرآن تالیف شیخ محمد سلامه .

☆منهج العرفان فی علوم القرآن تالیف سید احمد حسین بن رحیم علی امرهوی متوفی ۱۳۲۸ھ

☆مناهل الفرقان فی علوم القرآن تالیف استاد محمد العظیم زرقانی .

☆مباحث فی علوم القرآن تالیف دکتر صبحی صالح.

☆البرهان فی علوم القرآن تالیف امام بدر الدین محمد ابن عبد الله زرکشی متوفی ۷۹۴ھ

☆التحبیر فی علوم التفسیر تالیف جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ

☆الاحسان فی علوم القرآن تألیف ابو عبد الله جمال الدین محمد ابن احمد ابن سعید مکی متوفی ۹۳۰ھ

☆ابان بن تغلب متوفی ۱۴۱ھ (صحابیٔ امام سجادؑ تھے) نے قرآئت کے بارے میں کتاب لکھی

☆الکشف عن وجوه القرآئات السبع: ابو محمد مکی بن ابی طالب ۴۳۷ھ.

☆حجة القرآءٰت: قاابو ذرعه عبدالرحمٰن بن محمد متوفی ۴۱۰ھ.

☆البیان فی غریب اعراب القرآن: ابی البرکات ابن انباری متوفی ۵۷۷ھ.

☆املاء مامن به الرحمٰن فی وجوه الاعراب والقرآءٰت: ابو البقاء عبدالله بن الحسین العکبری متوفی ۶۱۶ھ.

☆جمال القُرّاء وکمال الأقراء: علم الدین علی بن محمد السخاوی متوفی ۶۴۳ھ.

☆النشر فی قرآءٰت العشر وغایة النهایة فی طبقات القراء وفضائل القرآن: ابو الخیر شمس الدین محمد بن محمد معروف به ابن الجوزی متوفی ۸۳۳ھ.

☆بدایع البرهان فی وصف حروف القرآن: شیخ مصطفی بن عبدالرحمٰن بن محمد الاء زمیری متوفی ۱۱۵۵ھ.

☆الاتحاف فضلاء الأمة فی القرآءآت السبع: حسن بن علی بن احمد المنطاوی متوفی ۱۱۷۰ھ.

☆حجیة ظواهر الکتاب مولی محمد باقر بن محمد اکمل معروف بی استاد اکبر متوفی ۱۲۰۶ھ.

بعض علوم کی حیثیت قصۂ پارینہ جیسی ہے اور اس میں مصروف رہنا وقت کا ضیاع اور تحصیل لا حاصل ہے اور اس سے کوئی نتیجہ ثابت نہیں ہے جیسے جمع قرآن، علم قرآئت، قراء سبعہ وغیرہ غرض اس سلسلہ میں قارئین کے معلومات میں اضافہ کی خاطر اس سلسلہ میں مسلمانوں کی کاوش کا ترتیب وار فہرست پیش کرتے ہیں:

علم تفسیر:۔

متن قرآن، آیات کریمہ کے مفاھیم اور معنی سمجھنے کو تفسیر کہتے ہیں۔ سابق زمانے میں علماء اعلام علوم قرآن اور تفسیر قرآن کو مخلوط طور پر تصنیف و تالیف فرماتے تھے۔ بعد میں ان دونوں کی الگ سے تالیف ہوئی۔ جو علم خود قرآن کریم سے باہر لیکن قرآن سے

متعلق ہوا سے علوم قرآن کے نام سے پیش کیا لیکن جو متن قرآن ہے اسے تفسیر قرآن کے نام سے پیش کیا۔ جو علم قرآن سے پہلے پیش ہونے والی موضوعات ہیں اس میں خود ایک قسم کی تقسیم بندی ہے۔ بعض بالکل غیر ضروری بلکہ قرآن سے دور رکھنے کا سبب اور قرآن اور مسلمانوں کے درمیان ایک ختم نہ ہونے والا اور نہ اٹھنے ولا حجاب کی مانند ہے۔ لیکن مسلمانوں کی طرف سے اس کے بارے میں دی گئی اہمیت کی وجہ سے اسے جو مقام حاصل ہے وہ خود قرآن کو حاصل نہیں ہو سکا۔ اس سلسلہ میں کچھ تفصیل و توضیح آگے پیش کریں گے۔ بعض مسائل و معلومات اس قرآن کی سند اور دلائل ہیں اور یہ اپنی جگہ کچھ حد تک ضروری ہے لیکن بدقسمتی سے مسلمان ان مسائل سے ابھی تک فارغ نہیں ہوئے ہیں۔ ابھی تک اسی تحقیق میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں مزید تحقیقات کیلئے آثار قدیمہ کی تلاش جاری ہے۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ ہم خود قرآن کی دریا میں داخل ہوسکیں۔ معلوم نہیں وہ وقت ہمارے نصیب میں ہے یا نہیں۔ تیسری بحث خود قرآن کریم کی آیات کے فہم اور ادراک سے متعلق ہے۔ اس سلسلے میں بھی علماء نے اس دریا میں اپنی کشتی کو داخل کرنے کیلئے چھوٹی چھوٹی نہریں نکالی ہیں۔ اُن میں اپنی کشتی کو اتارا ہے۔ وہاں سے اس سمندر میں داخل ہونے کے خواہشمند ہیں۔ غرض ہم علوم قرآن اور اسکے طریقہ فہم یعنی انواع و اقسام تفسیر سے متعلق کچھ توضیحات پیش کریں گے تاکہ ہمارے اس عظیم شہید کی منتخب اور پسندیدہ تفسیر قرآن کی خصوصیات اور لذات اسے آشنا ہوسکیں۔ ذیل میں علوم قرآن کے بارے میں موضوعات کا اجمالی تعارف ملاحظہ فرمائیں۔

(۱) مقدمہ غیر مصدقہ :۔

ایک علم بنام علم قرآئت یا تجوید سے معروف ہے۔ شہید صدرؒ کا کہنا ہے کہ قرآن کریم کو پڑھنا دوسری عربی زبان کی کتابوں کو پڑھنے جیسا نہیں ہے۔ اس کو پڑھنے کا اپنا ایک مخصوص طریقہ ہے یہ قرآءِ عشرہ یا قرآءِ سبعہ (سات قرآء) میں سے کسی ایک کی قرآئت کے مطابق پڑھنا چاہئے۔ اس علم میں بھی امت اسلامی کی ایک طویل عمر کو ضائع

و برباد کیا جا رہا ہے کہ جس کو سیکھنے پر عمر، دولت، توجہ، اعزاز و جائزے اور تصنیف و تالیف سب خرچ ہوئے آخر میں محققین و مدافعینِ علماءِ اسلام نے یہ ثابت کیا کہ اس کے بھی پاؤں حقیقت میں زمین علوم قرآن پر نہیں ٹکے بلکہ ہوا میں ہیں۔ یعنی ان کو طریقہ قرآئت پر پڑھنا ضروری اور حتمی نہیں ہے کیونکہ یہ قرآءِ نزول قرآن کی دوسری صدی سے تیسری صدی کے افراد ہیں۔ ان کے اسماء، تاریخ ولادت و وفات یہ ہیں:

۱۔ **عبداللہ بن عامر الدمشقی**: سنہ ۸ھ میں پیدا ہوئے۔ وہ عبدالملک بن مروان کے دور خلافت میں قاضی رہے اور سنہ ۱۱۸ھ کو وفات پائے۔

۲۔ **عبداللہ بن کثیر بن عمرو هرمزمکی**: سنہ ۴۵ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۲۰ھ کو وفات پائے۔

۳۔ **عاصم بن بهدلة الکوفی**: یہ سنہ ۱۲۷ھ یا ۱۲۸ھ میں وفات پاگئے۔

۴۔ **ابو عمرو البصری زبان بن العلاء بن عمار المازنی البصری**: سنہ ۶۸ھ کو پیدا ہوئے اور سنہ ۱۵۴ھ میں وفات پائی۔

۵۔ **حمزة الکوفی ابن حبیب بن عماره بن اسماعیل التمیمی**: یہ سنہ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۲۲۹ھ میں وفات پائی۔

۶۔ **نافع المدنی عبدالرحمٰن بن ابی نعیم**: سنہ ۱۲۰ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۲۲۰ھ میں وفات پائی۔

۷۔ **الکسائی الکوفی علی بن حمزة بن عبداللہ بهمن بن فیروز الاسدی**: سنہ ۱۸۹ھ میں وفات پائی۔

یہ تھے قرآءِ سبعہ جن کی قرآئت کو بہت اہمیت دی گئی ہے اور کتنی ہی کتابیں لکھی گئی ہیں اور قرآن سے متعلق ان قرآئت کی اہمیت کو مسلمات دین میں گردانا گیا ہے جبکہ علماء و محققینِ اہل سنت و شیعہ نے اس کو مسترد کیا ہے ”کتاب البیان“ میں مرحوم آیت اللہ العظمیٰ خوئی (رضوان اللہ علیہ) ان قرآئتوں کے مسترد ہونے کے بارے میں چند دلائل پیش کی

ہیں کہ یہ ایک اخبارِ احاد ہیں اوران کی اپنی اجتہاد ہے۔ان کی قرآئت صحیح ہونے کی سند کسی سے نہیں ملتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض نے ابن عامر کو،بعض نے حمزہ کو،بعض نے ابن عمروکواور بعض نے ابن کثیر کومسترد کیاہے۔ اورزرکشی نے کہاہے کہ تواترقرآن اورتواترقرآئت قرآءِ سبعة دومتناقص چیزیں ہیں۔اس کے علاوہ خودقرآء میں بعض ایک دوسرے کے مخالف ہیں اور بنی امیہ اور بنی عباس کی حکومت کے عہدوں پر فائض رہے ہیں۔ایسے مشکوک عمل کے لئے کتنا اہتمام کیا جاتا ہے لیکن جو قطعی ویقینی اور حتمی واجب ہیں جن کے حقائق ومعارف کواجاگر کرنے میں دین ودنیا کی سعادت کی ضمانت ہے وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہیں۔

سات قرآء میں سے ایک کی قرآئت کے مطابق تلاوت کرنا چودہ سوسال کے بعد بھی علوم قرآن کریم میں نوبل جائزہ ،انعام حاصل کرنے اوراس علم وفنو کتاب میں مہارت حاصل کرنے کا واحد موضوع قرار پایا ہم اصل حسن قرآئت کے خلاف نہیں ہیں اور ہم کسی بھی زاویہ سے قرآن کا نام بلند ہو جائے غنیمت سمجھتے ہیں۔لیکن جس مقصد کیلئے صاحبِ کتاب نے اسے انسانوں کے ہاتھوں میں نزول فرمایا تھاوہ یہ ہے کہ انسان اس کے ذریعے سے ظلمت وتاریکیوں سے نکل کرروشنی کی طرف آئے اورزندگی کی مشکلات اورصعوبتوں سے تنگ آکرموت کے انتظار کے لمحات گذارنے کے بجائے اس کتاب کو زندگی کا آئینِ حیات سمجھ کراس پرعمل کرے اسی سلسلہ میں ہماری یہ کوششیں بھی کوئی قابل ذکر نہیں۔

☆**سنہ ۱۱۰ھ حسن ابن ابی الحسن یساربصری** نے تعدادآیات کے بارے میں کتاب لکھی۔

☆**عبداللہ بن عامریحسبی متوفی ۱۱۸ھ** مصاحف شام،حجاز،عراق نے معطوع وموصول اوروصل کے بارے میں کتاب لکھی۔

☆**محمد بن صائب کلبی متوفی ۱۴۶ھ** نے احکام قرآن لکھی۔

☆**مقاتل بن سلیمان متوفی ۱۵۰ھ** نے آیات متشابہات پر کتاب لکھی۔

☆**یحییٰ بن زیادفراء متوفی ۲۶۰ھ** نے معانی قرآن اختلاف اہل کوفہ،بصرہ وشام جمع تثنیہ درقرآن لکھی۔

☆**ابوعبیدئہ قاسم بن سلام متوفی ۲۲۴ھ** نے غریب القرآن ناسخ ومنسوخ کے بارے میں لکھی۔

☆**علی بن مدینی متوفی ۲۳۴ھ** نے اسباب نزول پر کتاب لکھی۔

☆**ابومحمدعبداللہ بن مسلم بن قتیبہ متو فی ۲۷۶ھ** نے تاویل مشکل قرآن ،تفسیر غریب القرآن لکھی۔

☆**ابوعبداللہ محمدبن ایوب بن ضریس متوفی ۲۹۴ ھ** نے فضائل قرآن اورآیات مکی اورمدنی کے بارے میں کتاب لکھی۔

☆**ابو القاسم سعدبن عبداللہ اشعری قمی متوفی ۲۹۹ھ** نے اصناف آیات قرآن کے بارے میں کتاب لکھی۔

☆**ابومحمدحسن بن موسیٰ نوبختی متوفی ۳۱۰ھ** نے **تنزییۂ متشابہات** قرآن کے بارے میں کتاب لکھی۔

☆**ابی عبداللہ محمدبن ادریس (امام شافعی)متوفی ۳۴۰ھ** نے احکام قرآن لکھی۔

☆**علامہ جلال الدین سیوطی "اتحبیرفی علوم التفسیر"** لکھی اس کے بعد کتاب "اتقان فی علوم القرآن" لکھی جس میں انہوں نے ۱۸۰ انواع علوم قرآن درج کی ہیں۔

☆**اتحاف فضلاء البشرفی القراء آت الأربعة عشر:ابن البناء احمدبن محمددمیاطی متوفی ۱۱۱۶ھ**

☆**غریب القرآن :ازابوبکرمحمدابن حسن الازدی ،معروف بہ ابن دریدمتوفی ۳۲۱ھ.**

☆**البیان فی علوم القرآن وعجائب علوم القرآن :ابوالبرکات عبدالرحمٰن بن سعیدانباری متوفی ۲۳۸ھ.**

☆فضائل القرآن :محمدابن یعقوب کلینی متوفی ۳۲۹ھ.

☆غریب القرآن :ابوبکرمحمدبن العزیزالسجستانی ۳۳۰ھ.

☆اعراب القرآن وناسخ ومنسوخ ومعانی القرآن :ابوجعفراحمدبن محمدنعاس متوفی۳۳۸ھ.

☆صنوف آیات قرآن :محمدابن ابراهیم معروف به ابن ابی زینب متوفی ۳۵۰ھ.

☆نکت القرآن :ابومحمدالقصاب محمدبن علی کرخی متوفی ۳۶۰ھ.

☆ثواب القرآن وتنزیل والتحریف :ابوعبدالله احمدبن محمدبن سیارمتوفی ۳۶۸ھ.

☆احکام القرآن:ابوبکراحمدبن علی رازی جصاص متوفی ۳۷۰ھ.

☆احکام القرآن :ابوالحسن عبادبن عباس طالقانی متوفی ۳۸۵ھ.

☆الاستغناء درعلوم القرآنی: محمدبن علی الادفوی متوفی ۳۸۸ھ.

☆بیان العجازالقرآن :ابی سلیمان حمدبن محمد بن ابراهیم خطابی بستی متوفی۳۸۸ھ.

☆اعجاز القرآن :قاضی ابوبکرمحمدبن الطیب الباقلانی متوفی ۴۰۳ھ.

☆البیان فی انواع علوم القرآن:شیخ مفیدابوعبدالله محمدبن محمدابن انعمان متوفی۴۱۳ھ.

☆متشابه القرآن:وتنزیه القرآن عن المطاعن :ابی الحسن عمادالدین قاضی عبدالجبارمتوفی ۴۱۵ھ.

☆خصائص القرآن: ابوالقاسم حسن بن علی متوفی ۴۱۸ھ.

☆البرهان فی علوم القرآن :ابوالحسن علی ابن ابراهیم بن سعیدالحوفی متوفی ۴۳۰ھ.

☆المحکم والمتشابه فی القرآن:ابوالقاسم علی بن الحسین سیدمرتضیٰ معروف به علم الهدیٰ متوفی۴۳۶ھ.

☆الاحکام القرآن:ابی بکرمحمدبن عبدالله معروف به ابن عربی متوفی۴۵۳ھ.

☆مقدمۂ تفسیرالبیان:ابوجعفرمحمدبن الحسن الطوسی متوفی ۴۶۰ھ.

☆اسباب النزول وفضائل القرآن:ابوالحسن علی بن احمدواحدی متوفی ۴۶۸ھ.

☆الرسالة الشافیه:ابی بکرعبدالقاهرجرجانی متوفی ۴۷۱ھ.

☆المفردات فی غریب القرآن:ابوالقاسم حسین بن محمدالراغب الاصفهانی متوفی۵۰۲ھ.

☆وجوه القرآن :ابوالفضل جیش بن ابراهیم بن محمدالتفلسی متوفی۵۵۸ھ.

☆فقه القرآن:قطب الدین ابو الحسن سعیدهبة الله الراوندی متوفی۵۷۳ھ.

☆متشابهات القرآن ومختلفه :رشیدالدین ابوجعفرمحمدبن علی بن شهرآشوب سروری متوفی ۵۸۸ھ.

☆رساله ای موجز پیرامون لغات قبائل درقرآن:ابوالقاسم متوفی ۶۵۰ھ.

☆بدیع القرآن :ابن ابی الاصبح عبد العظیم بن عبدالواحدمتوفی۶۵۴ھ.

☆مجازالقرآن:ابومحمدعبدالعزیزبن عبدالسلام معروف به العزّ متوفی ۶۶۰ھ.

☆سعدالسعودفی مختلف شؤن القرآن وتاریخه وتفسیرومشکله:قدوة العارفین رضی الدین ابوالقاسم علی بن موسیٰ بن جعفربن طاووس متوفی۶۶۴ھ.

☆ المرشدالوجیزفیمایتعلق باالقرآن العزیز:ابوشامه شمس الدین عبدالرحمٰن بن اسماعیل متوفی۶۶۵ھ.

☆اسئلة القرآن المجیدوأجوبتها (قرآن کے آیات غریبہ کے بارے میں بارہ سوسوالات وجوابات):محمدبن ابوبکررازی متوفی۶۶۶ھ.

☆کشف المعانی عن متشابهات المثانی:بدرالدین محمدبن ابراهیم معروف به ابن جماعه متوفی ۷۳۳ھ.

☆فضائل القرآن:ابوالفداء اسماعیل بن عمرمعروف به ابن کثیرمتوفی۷۴۴ھ.

☆الناسخ والمنسوخ:کمال الدین عبدالرحمٰن بن محمدالحلی معروف به ابن العتائقی متوفی ۷۷۰ھ.

☆البرھان فی علوم القرآن:امام بدر الدین محمدبن عبداللہ زرکشی متوفی ۷۹۴ھ.
☆مواقع العلوم فی مواقع النجوم:جلال الدین بلقیسی متوفی ۸۲۴ھ.
☆کنز العرفان فی فقه القرآن :فاضل سیوری ابوعبداللہ المقدادبن عبداللہ الحلی الاسدی متوفی۸۲۶ھ.
☆الناسخ والمنسوخ :شهاب الدین احمدبن عبداللہ بن سعیدبحرانی معروف به ابن متوج متوفی ۸۳۶ھ
☆الاتقان فی فضائل القرآن:ابوالفضل احمدبن علی بن حجزعسقلانی متوفی ۸۵۲ھ.
☆التحبیرفی علوم التفسیر:جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ.
☆معترک القرآن :جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ.
☆الاتقا ن فی علوم القرآن :جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ.
☆فتح الرحمٰن بکشف مایلتبس فی القرآن :قاضی زکریابن محمدانصاری متوفی ۹۳۰ھ.
☆الاحسان فی علوم القرآن:ابوعبداللہ جمال الدین محمدبن احمدبن سعیدالمکی متوفی ۹۳۰ھ
☆احکام القرآن:مولی احمدبن محمدمشهوربه مقدس اردبیلی متوفی ۹۹۳ھ.
☆مرآة الأنواروشکاة الأسرار:مولی ابوالحسن بن محمدطاھربن عبد الحمیدالنباطی الفتونی متوفی۱۱۳۸ھ.
☆ارشادالرحمٰن :شیخ عطیة الأجهوری متوفی ۱۱۹۰ھ.
☆حل مشاکل القرآن:مولی محمدبن جعفربن سیف الدین استرآبادی متوفی ۱۲۶۳ھ.
☆رساله ای درحجیت ظواھرکتاب:استادمتأخرین مولی مرتضیٰ ابن محمدامین انصاری شوستری متوفی ۱۲۸۱ھ.
☆خلاصة البیان فی مشکلات القرآن:مولی محمدتقی هروی اصفهانی متوفی ۱۲۹۹ھ.
☆حجتیة القراءت السبع وحجتیة ظواھرالکتاب:میرزامحمدسلیمان تنکابنی متوفی

۱۳۰۲ھ.
☆ایضاع المشتبهات فی تفسیرمشکل قرآن:مولی محمدتقی بن محمدحسین کاشانی متوفی ۱۳۱۶ھ.
☆مناھج العرفان فی علوم القرآن:سیداحمدحسین بن رحیم علی امروھی متوفی ۱۳۲۸ھ.
☆نثرالمرجان فی رسم القرآن:(سات جلدیں)محمدغوث النائطی الأوکانی.
☆منهج الفرقان فی علوم القرآن:شیخ محمدعلی سلامه.
☆مناھل الفرقان فی علوم القرآن:استاد محمدعبدالعظیم زرقانی.
☆تحفة الأحباب :حیدرعلی بن نورمحمدمعروف به سردارکابلی.
☆النباء العظیم :دکترمحمدعبداللہ دراز.
☆نظرات فی القرآن:استادمحمدغزّالی.
☆تاریخ القرآن:استادمحقق شیخ ابوعبداللہ زنجانی .
☆اعجازالقرآن:استادمصطفی صادقی رافعی.
☆أضواء علی متشابهات القرآن:(۱۲۰۰ سوال وجواب)شیخ خلیل یاسین عاملی.
☆مباحث فی علوم القرآن:دکترصبحی الصالح.
☆التصویرالفنی فی القرآن ومشاھدالقیامة فی القرآن:استادسیدقطب.
☆مقدمه تفسیرالاء الرحمٰن:امام وعلامۂ مجاھدشیخ محمدجوادبلاغی.
☆مقدمۂ تفسیرالبیان:مرجع بزرگ حضرت آیت اللہ خوئیؒ
☆قرآن دراسلام :علامۂ بزرگ سیدمحمدحسین طباطبائی (مولف المیزان)
☆التمهید فی علوم القرآن:(شش جلد)فاضل فرزانه آقائی محمدھادی معرفت.

(۲) مقدمات بعید:۔

یعنی یہ علوم قرآن کی عمیق اور باریک فہم میں کردار رکھتا ہے یہ علوم مختص بہ علم قرآن نہیں ہے لیکن قرآن فہمی میں بڑا کردار رکھتے ہیں جیسے علم لغت وقواعد واصول لغتِ عربیہ علم صَرف

نحو، معانی، بیان بدیع وغیرہ۔ یہ علوم لغت عربی پر عبور اور تسلط قائم کرنے کے لئے مختص ہیں یا ہر وہ موضوع جو زبان عربی میں ہو جیسے احادیث وکتب تاریخ اسلامی یا علماء کی اس زبان میں لکھی گئی کتب یا جاہلیت عرب کی شعر وشاعری یا اس زبان سے وابستہ انسانوں سے گفتگو کے لئے ہو۔ اس کی افادیت میں سے ایک فہم ودرکِ دقائق وحقائق قرآن ہے گرچہ ایک عرصے سے بعض مسلمانوں نے دانستہ یا نادانستہ طور پر بیت المال مسلمین کی کثیر رقم کو اس جزئی زاویہ کے مقدماتی علم پر خرچ کیا ہے اور کر رہے ہیں اور اس کے علاوہ ان علوم پر قدسیت کی چادر چڑھا رہے ہیں تا کہ اسے ایک خاص قدسیت حاصل ہو۔ یہاں اتنا سا عرض کرنے پر اکتفا کرنا مناسب ہوگا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ذوالمقدمہ سے لوگوں کو باز رکھ کر مقدمے میں خود اور امت کی عمر کو فنا کر رہے ہیں۔

علم تفسیر ان علوم کی طرف کس حد تک محتاج و نیاز مند ہیں اس سلسلہ میں شہید صدرؒ فرماتے ہیں کہ مفسر قرآن جس زاوئے سے قرآن کی تفسیر کرنا چاہتے ہیں اس حوالے سے اسکی نیازمندی میں فرق پیدا ہوتا ہے۔ یعنی فقہ قرآن حاصل کرنے والے کی ان علوم کی طرف نیازمندی اور قصص قرآنی کی تفسیر وتحقیق کی نیازمندی میں فرق ہے۔ قصص قرآنی فقہ قرآنی کی بہ نسبت زیادہ دقیق اور باریک ہیں ان میں قواعد وضوابط سے آگاہ ہونے کی ضرورت ہے۔

(۳) مقدمات قریب:۔

یعنی قرآن کریم سے متعلق ان حقائق سے آگاہی وآشنائی یا کسی نقطہ نظر منفی یا مثبت تک پہنچنا ضروری ہے کیونکہ یہ دونوں قرآن کے فہم ودرک میں دخالت رکھتے ہیں۔

۱) جمع قرآن: یعنی آیات قرآنی کی جمع وترتیب عام انسان کی صوابدید پر ہوئی ہے جس میں خدا اور اس کے رسول کا کوئی کردار نہیں یا جس طرح اس کے اصل میں بشر کا کوئی دخل نہیں ہے اسی طرح اس کی جمع اور تنظیم میں بھی کسی بشر کا کوئی دخل نہیں ہے۔ پہلا نظریہ اور دوسرا نظریہ دونوں فہم کتاب میں دخل رکھتے ہیں۔

۲) آیات قرآنی کی باطنی تفسیر: صوفی اور اسماعیلی مسلک سے تعلق رکھنے والوں کا یہ نظریہ ہے کہ آیات قرآنی کا ظاہر قطعاً مراد مقصود خدا نہیں ہے۔ لہٰذا ہمیں آیت کی تہہ اور باطنی معانی کی تلاش وجستجو کرنی چاہئے اور وہ بھی ہر شخص نہیں جانتا سوائے مخصوص ذوات کے۔ اس سلسلے میں وہ آئمہ طاہرینؑ سے واردان بعض روایات کو سند میں پیش کرتے ہیں چونکہ یہ (روایات وفکر) ان کے مذموم مقاصد کیلئے معاون و مددگار نظر آتی ہیں۔ اگر ان کا یہ دعویٰ ثابت ہو جائے تو قرآن کریم عام لوگوں کیلئے کتاب ہدایت ہونے کے درجے سے قط ہوگا۔

۳) صیانت قرآن: یعنی قرآن کریم کی موجودہ تعداد آیات وہی کل آیات قرآن ہیں کہ جس میں کسی قسم کا غیر قرآنی یا آیات کا اضافہ یا کمی نہیں ہوئی ہے یہ بھی فہم ودرک یا نتیجہ لینے میں دخالت رکھتے ہیں۔ صاحب شریعت وحامل کتاب اور امت کے درمیان موت حائل ہونے کے بعد دشمنان اسلام بالخصوص حسب تصریح قرآن کریم یہود نے اسلام اور اس کے مصادر و مآخذ قرآن کریم اور سنت رسولؐ کے خلاف کسی بھی مہم جوئی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اسی سلسلے میں سب سے اہم کوشش مختلف کمین گاہوں اور ذرائع سے قرآن کی محبت اور اعتبار کو گرانے کی مہم جوئی ہے اور ان مہم جوئیوں میں سے ایک مہم قرآن کی آیات میں کمی بیشی یعنی قرآن تحریف شدہ کتاب ہے کے طور پر پیش کرنا ہے۔ یقیناً ایک ایسی کتاب کو کسی بھی مدعا کو ثابت کرنے کیلئے سند کے طور پیش نہیں کر سکتے۔ لیکن ہمارے بزرگ علماء نے قدیم دور سے عصر حاضر تک اس سازش سے پردہ اٹھایا ہے اور اس سے دشمن اسلام کے مذموم عزائم سے مسلمانوں کو باخبر کیا ہے۔ یہ مسئلہ اس حد تک قابل دفاع ہے لیکن اس مسئلہ کو ہمیشہ جاری رکھنا اور اس میں غرق رہنا اور خود امت میں تفرقہ و انتشار کیلئے زندہ رکھنے کی کوئی منطق نہیں ہے۔ قرآن سے متعلق مذکورہ بالا بحث وگفتگو کی اصل ضرورت کو تسلیم کرنے کے بعد مزید اس میں امت کا وقت اور امت کو اس میں مصروف ومشغول رکھنے کی کوئی منطق ودلیل نہیں ہے۔ دشمن کی یہ خواہش ہوگی کہ ہم اس میں الجھے

رہیں، بلکہ ہمیں چاہیئے کہ اپنی توانائی کوخود قرآن کریم کی آیات میں غوّاصی کر کے اس سے گراں بہا موتیوں کونکال کر عالم انسانیت کیلئے بے مثال نمائش پیش کرنے کی کوشش کریں اوراس کتاب کی اہمیت کوگرانے اوراس کی حجت کولاحق خدشات سے دفاع کرنے پرمربوط ومرکوز رکھیں۔

موضوع تحریف قرآن دانشمند و بیدار مسلمان کے ایک فرد یا گروہ سے اس موضوع کوزیادہ پھیلانا، اچھالنا اپنے وہم وگمان میں اسلام اورقرآن عظیم کی خدمت گردانتا، بحیثیت ایک عام مسلمان اورعظمت قرآن کے معتقد ہونے کے حوالے سے یہ ہمارے گلے میں کھٹکتا تھا۔لیکن یہ خدا کے الطاف وعنایات میں سے ہے کہ مجھے اپنے اعتقاد کے بارے میں ایک قسم کی تائیدِ ربانی اس وقت محسوس ہوئی جب میں نے مجلّہ ''المعارج'' کا مطالعہ کیا جوکہ قرآنی موضوعات کیلئے مختص ہے اور لبنان کے ایک جیّد عالم شیخ حسین احمد شحادۃ کی اشراف ونگرانی میں صادر ہوتا ہے۔اس مجلّے کی چوتھی جلد شمارہ ۱۸ سے ۲۰ سنہ ۱۴۱۴ھ اور ۱۴۱۵ھ ماہ محرم ،صفر، ربیع الاول کے صفحہ نمبر ۶۷ پر ایک موضوع ''موقف شیعہ من تحریف القرآن'' کے نام سے چھپا ہے۔یہ موضوع پورے عرب دنیا کے مشہور و نامور خطیب، صاحب گرانقدر تالیفات وتصنیفات علامہ شیخ احمد وائلی دامہ بقاۂ کی پیشکش ہے۔انھوں نے لکھا ہے کہ اس موضوع پر قلم اٹھانے میں میرا ضمیر میرا ساتھ نہیں دیتا بلکہ میرا خیال ہے کہ کوئی بھی مسلمان جو خدا اور رسولؐ اوراس قرآن کی حقانیت وعظمت کے بارے میں عقیدۂ راسخ رکھتا ہو وہ بھی یہ عنوان سننا برداشت نہیں کرے گا۔اس عنوان کا صرف مفروضہ کی حد تک زبان پر جاری کرنا، صفحات کاغذ پرتحریر میں لانا، ایک مسلمان کی ضمیر و وجدان میں جو تقدس اس قرآن کے بارے میں موجزن اور شعلہ ور ہے اسے ٹھنڈا کرنے اوراس میں ایک قسم کا جمود پیدا کرنے کے برابر ہے۔یہ موضوع ان موضوعات میں سے ہے جو دشمنان اسلام کے ہاتھ میں آنے کے بعد انھوں نے اس میں امت کے جسم کیلئے سمِ قاتل اورقلعہ ٔاسلام کیلئے دھماکہ خیز نایاب مواد قرار دے کر اس کو ہر طرف سے

اٹھانے کی مہم چلائی۔بدقسمتی سے یہ بات یہاں تک پہنچی کہ انھوں نے اس شوم اور منحوس نظریہ کو پھیلانے کیلئے خود مسلمانوں میں سے بعض کوخریدا اورانہیں جس طرح روزمرہ اخبار کے دفاتر میں خبریں اور کالم لکھنے کیلئے بعض ضمیر فروش ،دین ووطن کے سوداگروں کوتھوڑی قیمت میں خریدکران کے قلم کوجنبش میں لاتے ہیں۔اسی طرح بعض علماء کومختلف فرقوں سے اٹھا کراس گاڑی میں سوار کیا اورانھیں شاید یہ بھی پتہ نہ ہوکہ یہ گاڑی انھیں کہاں اتارے گی۔شاید کہیں جہنم کے دروازے پر نہ اتاردے۔ ہمارے اس نامور محقق نے دشمنان اسلام کے اس فعل کے ماوراء عزائم کے بارے میں چند مفروضات پیش کئے ہیں:

۱۔مسلمانوں کے نفوس کے اندر قرآن کے ساتھ اہانت وجسارت کی حرکات اوراقدامات کے موقع پر غیرت وحمیت کے جوش وجذبہ کوٹھنڈا کریں تا کہ اس سے زیادہ اہانت اورا سے گرانے کی صورت میں جزئیات میں نہ آجائیں۔

۲۔اس شبہۂ تحریف قرآن کا مسلمان کے ذہن میں داخل ہونے کے بعد، چونکہ اسلام کے خلاف یہ ایک ناقابل بخشش جرم وجنایت ہے، ہر ایک فرقہ ،گروہ اس کاارتکاب کرنے کی ذمہ داری دوسرے فرقے پرڈالے گا تو وہاں سے آپس میں جنگ وجدال کا سلسلہ شروع ہوگا۔

۳۔ یہ شبہہ اٹھانے کے بعد قرآن کریم کی کسی بھی آیت سے کسی مدعا کوثابت کرنے کیلئے آیات سے استدلال میں شکوک وشبہات اورخدشات پیدا ہوں گے۔

۴۔قرآن کریم کے اندر موجود معارف وحقائق سے روگردانی اور کتاب کے باہر سے خود اسی کتاب کی حیثیت کوثابت کرنے کے موضوع میں سرگرم رکھیں گے۔

یہاں ہم ان سطور کے قارئین کرام کی خدمت میں ایک سوال پیش کرنے سے پہلے اس کا جواب پیش کرنے کی اجازت چاہیں گے وہ یہ ہے کہ حقیر نے آج سے دس سال پہلے اس وقت کے حالات کے تناظر میں کہ جہاں یہ تہمت تحریف قرآن شیعوں پرڈالنے کی مہم شروع ہوئی تھی تو ہم نے اس جرم وجنایت سے بیزار اورانکار کرنے کے بارے میں مکتب تشیع

سے تعلق رکھنے والوں کیطرف سے ایک کتابچہ شرکاءِ سیمینار کیلئے پیش کیا تھا لیکن ہم نے اس تہمت کے بارے میں تنہا مکتب تشیّع کا دفاع نہیں کیا بلکہ پوری امت اسلامی کا دفاع کیا تھا۔

انہی خدشات کو مدنظر رکھتے ہوئے ارباب فکر وقلم کی خدمت میں دست بستہ التجاء ہے کہ وہ اپنے جرائد ومجلّات کے صفحات کو اس جیسی دیرینہ وپارینہ بے ثمر موضوعات سے پاک اور گریز کرتے ہوئے نتیجہ خیز اور بارآور موضوعات کو اٹھائیں کہ جس طرح ہمارے عظیم امام شہید باقر الصدر رضوان اللہ تعالیٰ علیہ نے حوادث اجتماعی کے تاریخوں کے قانون اور سنن کو پہلی بار آیات قرآنی کی روشنی میں پیش کیا۔

مذکورہ بالا عنوانات کے بارے میں بحث وگفتگو اپنی جگہ مستحسن ہے لیکن قرآن میں وارد ہونے کیلئے یہ تمام عنوانات ایک مقدمہ، وسیلہ اور ذریعہ ہیں یہ عقل اور وجدان کے سراسر خلاف ہے کہ فرد کی عمر نہیں بلکہ امتوں کی عمر اس مقدمہ میں ختم ہوجائے اور اصل مقصد اور ہدف میں داخل ہونے کی کوئی نوبت نہ آئے۔ یہ انتہائی افسوس ناک اور لمحہ فکریہ ہے۔

۴) **ناسخ ومنسوخ:** بعض کلمات قرآن کے بعض کلمات اور روایات کثیرہ علماءِ اعلام کے نزدیک شبہ مسلمات میں سے ہیں کہ قرآن میں ناسخ ومنسوخ ہے۔ جب تک ان دونوں کی شناخت نہیں ہوگی آیات قرآنی سے استدلال یا نتیجہ اخذ کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہاں سے ایک اور بحثِ قرآنی کی ضرورت کو محسوس گردانا گیا ہے کہ کون سی آیات مکی اور کون سی آیات مدنی ہیں فہم قرآن سے پہلے ان کے بارے میں کسی نتیجہ پر پہنچنا ضروری ہے۔

۵) **حجیتِ ظواہر قرآن:** قرآن کریم کے ظاہری الفاظ وکلمات سے فہم ومعنیٰ اپنی جگہ حجت ہیں اور اس فہم پر عمل کرنا ذمہ داری سے بری کرتا ہے اور اس فہم کو ترک کرنا اپنی جگہ باعث جواب طلبی کا بنتا ہے۔

مجلّہ رسالۃ القرآن شمارہ اصفحہ ۱۷ میں مناہج تفسیر کے عنوان پر لکھے گئے مقالوں میں آیت اللہ جعفر سبحانی لکھتے ہیں کہ اب تک دوہزار دوسو (۲۲۰۰) تفاسیر کی اعداد و شمار ہمارے ہاتھ آئی ہیں۔ ان اعداد وشمار کو سامنے رکھنے کے بعد ہمیں آیت اللہ سبحانی کی

طرح قرآن کے بارے میں مسلمانوں کی وابستگی کو قدر کی نگاہ سے دیکھنا چاہیئے یا ان اعداد وشمار قرآن سے وابستگی میں سستی اور کاہلی سمجھا جائے یا کہ اپنی ذوق وسلیقہ کی بنیاد پر فیصلہ کرسکیں لیکن ہمیں ایک اور زاویّے سے اظہار تأمل کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ دوہزار دوسو میں تکرار طریقہ اور موضوع کی دستہ بندی کرنے کے بعد اصل تفسیر کتنی باقی رہ جاتی ہیں سابق زمانے میں تفسیر کے انواع واقسام بیان کرتے تھے ان کی چند مثال ذیل میں پیش کررہے ہیں لیکن دور حاضر میں علماءِ تفسیر تفسیر کو دو حصوں میں بیان کرتے ہیں:

۱۔ تفسیر ترتیبی قرآن ۲۔ تفسیر موضوعی

علوم قرآن میں سے بنیادی علم خود فہم ودرکِ قرآن ہے:۔

اس سلسلہ میں علماءِ تفسیر میں سے ہر ایک نے اپنی صلاحیت وقابلیت، ذوق وسلیقہ اور ذہنی ترجیحات کی بنیادوں پر ایک جداگانہ طریقہ اپنایا ہے۔ بعض نے آیات قرآنی کو روایات سے تعبیر کرنے پر انحصار کیا ہے جبکہ چندین لحاظ سے علماء نے اس طریقہ پر خدشہ کا اظہار کیا ہے مثلاً ضعفِ روایت اور اسرائیلی روایات، قرآن مخالف روایات اور صحیح روایات کا ناکافی ہونا وغیرہ۔

بعض نے کلمات قرآن کا عربی حوالے سے تبدیل کلمہ، اعراب کلمہ پر انحصار کیا ہے بعض نے علوم جدیدہ کی روشنی میں تفسیر کی ہیں، بعض نے ظواہر قرآن کو چھوڑ کر باطن آیات کی تفسیر اور رموز یا اعداد وشمار کی تفسیر پر توجہ دی ہیں اور بعض علماءِ اعلام نے جنہیں ایک قسم کی مقبولیت حاصل ہے اور خدشہ واشکالات سے کافی حد تک محفوظ ہیں وہ آیات قرآن کا خود قرآن سے تفسیر کرنا ہے جسے تفسیر قرآن با قرآن کہا ہے۔

ایک نئے طریقہ تفسیر کا بھی اضافہ ہوا ہے جو تفسیر موضوعی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس تفسیر کے بارے میں وضاحت کرنے سے پہلے ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کی ترکیبی حیثیت کا مفہوم اسکے اجزائے ترکیب پہلے واضح کروں۔ یہ عنوان دو کلمے سے مرکب ہے ایک کلمہ تفسیر اور دوسرا کلمہ موضوعی۔

(۳) خودفہم قرآن:۔

مقدمات فہم قرآن کے بارے میں کسی منفی یامثبت نتیجہ پرپہنچنے کے بعدخودآیات قرآن کے سمجھ اوردرک کے بارے میں کون ساطریقہ یاذریعہ زیادہ معاون اورموٴثر ہے۔ اس سلسلہ میں بھی علماءِ اعلام کی کوشش اورنطقہ نظرمختلف ہیں۔ذیل میں ہم ان کے ترجیح کردہ اقسام کوبیان کریں گے:

تفسیر بروزن تفعیل:۔

کلمہ تفسیر مادہ فسر سے ہے جسکا معنٰی جدا کرنا،کشف کرنا،اظہارکرنا کے ہیں مادہَ فسرکلمہ سُفر کا الٹا ہے یعنی عورت کے چہرے سے پردہ ہٹانے کوکہتے ہیں۔ یہاں سے فسر معقول معانی کے اظہار کے لئے آیاہے سفرہ مادی پردہ ہٹانے کے لئے استعمال ہوتا ہے گرچہ تفسیر کسی بھی کلام کی توضیح وتشریح کے لئے استعمال ہوتا تھالیکن بعدمیں علماء نے اسے قرآنی الفاظ ومعانی کے بیان اورکشف کے لئےمختص کیاہے۔یہیں سے ابوریحان اندلسی نےتفسیر کےمعنٰی میں لکھاہے کہ تفسیراس علم کو کہتے ہیں جس میں قرآن کے الفاظ کےطریقہَ نطق اوراس کے معانی اوراحکام کودرک کرتے ہیں۔

(ا)۔تفسیر ترتیبی آیت آیت کا جداگانہ تفسیر کرنا:

یہ تفسیر قدیم زمانے سےعصرحاضرتک رائج ہےاوراس سلسلہ میں تفاسیرلکھی گئی ہیں۔

تفسیر ترتیبی قرآن:۔

قدیم دور سےعصرحاضرتک قرآن فہمی سےشوق وشغف رکھنے والوں نےتفسیر آیات ابتداء سےانتہاہرآیت دوسری سے الگ اورجدا معانی ومفہوم واضح اورروشن کرنے کی وکوشش کی ہے۔تفسیرقرآن کی اس نہج پر چلنے والے بہت سے کاروان اورقافلوں میں سے بہت کم افرادکویہ توفیق نصیب ہوئی ہے کہ وہ آغازقرآن سے اختتام قرآن کی تفسیرمکمل کرسکیں۔اس میں درمیان سے ہمت ہارنے والے،توقف کرنے والے یا قابضین ارواح

ملک الموت کی طرف سےفرصت چھن جانے والےمفسرین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

شہید باقرالصدرؒ نےاس نہج تفسیری کی چندایک حسن وخوبی کوتسلیم کرنے کے بعد اسکی خامیوں کی طرف اشارہ کیاہے جواس کےحسن پرتعداد کےحوالے سے غالب ہے منجملہ اس کی اہم خامیوں میں سےایک آیت قرآنی میں تضادوتناقص نظرآتا ہے۔اس بنیاد پرفرقہ اورمذہب تراشی کرنے والوں کیلئےاس نوع تفسیری سے مذہب کی صحت کے بارے میں بہت سی معاونت اورسندملی ہے۔

۱) **تفسیرادبی قرآن**:یعنی قرآنی کلمات کودوسرے عام فہم کلمہ عربی میں پیش کرنایادوسری زبان میں اس کلمہ کامعنٰی پیش کرناجسے عام اصطلاح میں ترجمہ کہتے ہیں۔

قرآن کریم کی آیات کواس کےلغوی معانی کی حیثیت سےسمجھنے کیلئے ہونے والی کوشش کو تفسیرادبی قرآن کہتے ہیں اورایک کلمہ عربی کودوسری زبان میں بیان کرنےکوترجمہ کہتے ہیں۔قرآن کریم نےمتعددآیات میں اپنی تعریف میں کہاہے یہ کتاب عربی میں ہےاوروہ بھی واضح اورروشن زبان ہے۔بعض آیات میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ عربی زبان کی ادائیگی میں جوپیچیدگی اجمال ومبہم گوئی ملتی ہے۔وہ اس کتاب مین نہین ہے۔اس کی آیات میں کسی قسم کا اجمال،ابہام اورپیچیدگی وغیرہ کا وجودنہیں ہے یہی وجہ ہے کہ اصل نزول قرآن میں عرب کے بدواوردانشمند دونوں ان آیات سےلطف اندوز ہوتے تھےاور لذت اٹھاتے تھےلیکن گذشتِ زمان کےساتھ اس کےکلمات امت کی سماعت سے دور ہوتے ہوتے امت کیلئےایک غریب اوراجنبی کلام کی شکل اختیارکرچکے ہیں۔یہاں سے امت کےعلماءودانشوروں کوقرآن کےکلمات کواپنے دورکی زبان میں شرح وتفسیر کرنے کی ضرورت پیش آئی۔آپکو بہت سی کتابیں ملیں گی جن کا نام غریب القرآن ہے۔اس سلسلے میں چندکتابوں کے نام ملاحظہ کریں یہاں سےآپ کواندازہ ہوگا کہ امت کتنی جلدی اس قرآن سےاجنبی ہوئی۔

۱.اختصار غریب القرآن — تالیف شیخ ابراھیم کفعمی

۲. الغريب بما فی القرآن من الغريب تاليف ابی العرج عبد الرحمٰن بن علی ابن حوزی متوفی ۵۹۲ھ

۳. العشاره فی غريب القرآن تاليف ابی بكر محمدا بن الحسن ابن محمد نقاش متوفی ۳۵۱ھ

۴. النموزج القيوم فی تفسير غريب القرآن

۵. ايضاح المشكلات تاليف محمد تقی بن محمد حسين كاشانی ۱۳۱۶ھ

۶. بحر البحران فی مشكلات معانی القرآن

۷. البيان فی شرح غريب القرآن

۸. التبيان فی تفسير غريب القرآن

۹. ترجمه الغريب القرآن

۱۰. تفسير الغريب القرآن

۱۱. تغريب الغريب

الغرض سینکڑوں کتابیں قرآن کے کلمات کو دوسرے کلمات میں بیان کرنے میں لکھی گئی ہیں۔ چودہ سو سال گذر چکے ہیں۔قرآن کے حقائق اور معارف پر غور کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ آئندہ زمانے میں ہم مزید قرآن سے دوری اختیار کر جائیں گے اور قرآن ہمارے لئے اجنبی اور انجان صورت اختیار کر چکا ہوگا کیونکہ اگر سابق زمانے میں قرآن کے کلمات سے آشنائی کیلئے درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا تو اب وہ بھی ختم ہو چلا ہے۔ اب قرآنی درس کی سطحی تلاوت جو ایک رمق کی صورت میں کہیں موجود ہے۔اسے مدارس میں سکھانا علماء مدارس کی توہین سمجھتے ہیں۔ مساجد کے منتظمین اسے مسجد میں داخل کرنے کی اجازت اس بہانے سے نہیں دیتے کہ اس سے مسجد کے تقدس کو دھچکا لگتا ہے اب وہ ہر لحاظ سے غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔

۲) تفسیر روائی: اہل تسنن سے وابستہ مسلک اہل حدیث اور تشیع سے وابستہ

اخباری مسلک اور بعض غالیت اور نصرائیت کے داعیان نے اہل تشیع کو قرآن کریم کی آیات سے مستفیض ہونے سے باز رکھنے کی خاطر قرآن فہمی کا واحد راستہ روایات سے محصور کیا ہے۔جبکہ تفسیر قرآن کے بارے میں جمع شدہ روایات اپنی ضعفِ سند، اسرائیلوں کی خیانت کاری یا تاویل اور معانی باطنی بیان کرنے اور اس میں تکراری روایات کو سامنے رکھنے کے بعد قرآن کی ایک تہائی آیات کی بھی تفسیر روایات صحیح اور مصدقہ سے ممکن نہیں ہے۔ خاص طور پر ان میں سے بعض روایات قدیم دور سے عصر حاضر تک کے محققین علماء و فقہاء کے نظریہ عدم تحریفِ قرآن کے سراسر خلاف ہے۔اس کا مطلب یہ نہیں صرف قرآن ہی کافی ہے۔ یہ خود قرآن اور حدیث متواتر ثقلین کے تحت شریعت کے دو مصدر ہیں جسے امت اسلامی میں سے کوئی بھی گروہ انکار نہیں کر سکتا۔لیکن قرآن کریم کی تفسیر روایت کے بغیر ممکن نہ ہونا یہ دوسرے انداز میں حسبنا روایات ہے۔ روایت سے آیت کے معنی واضح کرنے اور تفسیر کرنے کیلئے اصل روایت کا موجود ہونا اور قبول روایت کی دیگر شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے۔ لیکن جن تفسیر روائی کو اس سلسلے میں پیش کیا جاتا ہے وہ اپنی کمی کے ساتھ مخدوش روایات سے بھری ہوئی ہیں۔ روایات سے بھرے ہوئے ترجمے اور حاشیہ والے قرآن ہمارے ہاں وحی منزل سمجھے جاتے ہیں اسکے ہوتے ہوئے اگر ہمیں قرآن کریم کی تحریف کے قائل ہونے کا الزام یا تہمت لگائیں تو ضرور انھوں نے کسی چیز سے تمسک کیا ہے گرچہ ہمارے محققین کے نزدیک وہ خس و خاشاک کے برابر ہو لیکن انکے لئے یہ اپنے وہم کے تحت ایٹم بم کے برابر ہے دشمن ہمیشہ اپنے فریق کے خلاف معمولی سند کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔

۳) تفسیر علمی: یعنی قرآن کریم کو جدید تحقیقات و تجرباتِ بشری کی روشنی میں تفسیر کرنا جیسے ایک زمانے میں علم بشر نے زمین کو چاند، سورج اور دیگر ستاروں کا مرکز قرار دیا تو آیات قرآنی کو بھی اسی تحقیق سے تفسیر کیا اور جب بشر کی تحقیقات بدل گئیں اور مرکز سورج کو قرار پایا تو زمین سے متعلق آیات کی تفسیر اسی نظریہ کے مطابق بدل گئیں۔

قرآن کریم کی آیات کریمہ کو علوم جدیدہ کی نئی انکشافات اور تجربات کی روشنی میں تفسیر کرنے اور اس طریقہ کار کو غیر مشروط طور پر تفسیر قرآن میں شامل کرنے سے محققین، علماء اور اسلام کی فکری سرحدوں کے محافظین و نگہبانوں نے منع کیا ہے اور اس سلسلے میں بہت سی تحفظات اور شرائط عائد کی ہیں کیونکہ انسانی تجربات طبیعت کے بارے میں بدلتے رہتے ہیں اور قرآن کریم کی آیات زمان و مکان کی قید و بند سے آزاد ہستی مطلق کا کلام ہے جس کے بارے میں خود اسی کتاب میں یہ واضح بیان ہے اسکے چہار سو میں سے کسی بھی طرف سے اسکو باطل یا معانی کو توقف کرنے والے نظر نہیں آئیں گے۔

۴) **تفسیر قرآن بہ قرآن:** ایک آیت کی تفسیر دوسری آیت سے کرنا یہ بھی ایک تفسیر قرآن ہے جسے دور حاضر میں سب سے پسندیدہ افضل وارفع قرار دیا۔

آیات قرآنی کے کلمات کے ظاہری معنیٰ، قطعاً خدا کا مراد و مقصود نہیں ہے لہٰذا ہمیں اس کے باطن اور تہہ میں موجود معانی تک رسائی حاصل کرنا چاہیئے۔

کسی بھی موضوع کے بارے میں پورے قرآن کریم میں اس موضوع سے متعلق موجود آیات کو جمع کرکے ان سے قرآن کے نقطہ نظر کو حاصل کرنے کو دور جدید نے تفسیر موضوعی کا نام دیا ہے۔

(۲) تفسیر موضوعی:۔

تفسیر:۔

تفسیر جس کی تفصیلی بحث آئندہ صفحات میں خود شہید رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کی بحث تفصیلی میں آئیں گی۔ ہم یہاں پر آئندہ بحث سے آشنائی کی خاطر تمہیدی حدود میں چند جملے ان کے نقطہ و نظر کے مطابق پیش کرتے ہیں

شہیدؒ تفسیر کے معنائے لغوی میں وہی معنیٰ پیش کرتے ہیں کہ جو کتب لغت میں

آیا ہے۔ لیکن اصطلاحی طور پر آپ دیگر علوم قرآن کے ماہرین اور علماءِ تفسیر کی وضاحت اور شرائط سے اتفاق نہیں کرتے۔ آپ فرماتے ہیں کہ جہاں وہ کہتے ہیں (جہاں لفظ میں ابہام نہ ہو تو تفسیر نہیں کہیں گے اور جہاں لفظ میں ابہام پایا جاتا ہو اسے تفسیر کہتے ہیں)۔ جس کے بارے میں شہیدؒ فرماتے ہیں کہ تفسیر ہمیشہ افراد، سامع اور مخاطب کیلئے ابہام ہوتا ہے یعنی کلام ابہام نہیں ہے لیکن سننے والے کیلئے ابہام ہے لہٰذا کلام کی تقسیم بندی صحیح نہیں ہے۔ کلام کے بیان کو تفسیر کہا جاتا ہے جس کیلئے آپ نے ایک مثال پیش کی ہے: باپ بیٹے سے کہتا ہے کہ ہر روز ''بحر'' (دریا) کی طرف جاؤ۔ یہاں کلام کا معنیٰ واضح ہے۔ یہاں تفسیر صدق نہیں آتی لیکن ایک اور جگہ بیٹے سے کہتا ہے: ''بحر'' کی طرف جاؤ اور اس کا کلام سنو۔ یہاں کلام میں ابہام پایا جاتا ہے کہ لفظ کا معنیٰ واضح نہیں ہے لہٰذا محتاج تفسیر ہے۔ شہید فرماتے ہیں کہ لفظ میں ابہام اور اجمال نہیں ہوتا ہے۔ اجمال و ابہام شخص و سامع کو لاحق ہوتا ہے۔ ایک اور جگہ پر شہید بعض علوم قرآن و مفسرین کے اس نقطہ و نظر سے اختلاف کرتے ہیں کہ تفسیر و تاویل کا معنیٰ بعض مواقع پر ایک جیسا ہے یعنی دونوں ہم معنیٰ ہیں۔ شہید فرماتے ہیں تاویل کا معنیٰ کبھی بھی تفسیر نہیں ہے۔ خلاصہ کلام شہید کی نظر میں کلمات قرآن اپنے بیان لفظی میں شخص کیلئے معنیٰ واضح و روشن ہیں قرآن کا اس کے بارے میں بیان صریح و عیان ہے کسی قسم کی تردید و شک کی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا آیات قرآنی کیلئے تفسیر ایک معنائے اضافی ہے جو اس کلام کو اپنے گرد و نواح یا لفظ سے باہر حالات سے پیش آتا ہے جیسا کہ پہلے ایک مثال میں پیش کیا کہ ''بحر کی طرف جاؤ اور اس کا کلام سنو'' یہاں محتاج تفسیر ہے کیونکہ کلام سنو کا حکم بحر پر صدق نہیں آتا ہے بحر کلام نہیں کرتے۔ لہٰذا بحر اپنے لغوی معنیٰ میں استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ بحر سے مراد عالم ہے اس کا قرینہ دوسرا جملہ ہے جس میں کہا گیا کہ اس کا کلام سنو۔

تفسیر مادۂ فسر سے ہے اور فسر سے کشف یا بیان معنیٰ کیا ہے۔ راغب اصفہانی نے اس کے معنیٰ میں ایک اور اضافہ کیا ہے کہ اظہار معنائے معقول ہے۔ کلمہ تفسیر، فسر میں

مبالغہ کے لئے لایا گیا ہے چنانچہ یہ کلمہ سورۂ فرقان کی آیت نمبر۳۳ میں آیا ہے:
﴿**ولا یاتونک بمثلٍ الا جئنٰک بالحق و احسن تفسیرًا**﴾ اور یہ لوگ جب بھی آپ کے پاس کوئی حجت لے کر آئیں تو ہم آپ کو حق کی بات اور بہترین وضاحت سے نوازتے ہیں''۔

علماء کی اصطلاح میں تفسیر اس علم کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ آیات قرآنی کے معانی اور حق سبحانہ تعالیٰ کے مراد و مقصود کو انسان کی اپنی طاقتِ بشری کے حدود میں کشف کرنے کو کہتے ہیں۔

موضوع:۔

مادہ وضع سے لیا ہے اور یہ کسی چیز کو کسی مکان میں رکھنے کو کہتے ہیں یا کسی چیز کو کہیں پھینکنے یا استقرار دینے کو کہتے ہیں۔

موضوع سے مراد شخصِ مفسر اپنے آپ کو ایک خاص معین معنیٰ سے مربوط کرتا ہے اور اس سے تجاوز نہیں کرتا۔ علماء کی اصطلاح میں تفسیر موضوعی اس تفسیر کو کہتے ہیں کہ شخص مفسر انسانی زندگی سے متعلق ایک پہلو یا زاویہ کو اٹھاتا ہے اور اس سے متعلق قرآن کریم میں وارد آیتوں کو جمع کرتا ہے اور ان تمام آیات کو ایک دوسرے سے ربط دینے کے بعد زندگی کے اس شعبہ یا پہلو کے بارے قرآنی نقطۂ نظر کو کشف کرتا ہے۔ اسے تفسیر موضوعی کہتے ہیں۔ تفسیر کا آغاز اسی صدی یا اس سے کچھ عرصہ پہلے ہوا ہے۔ ہماری اس کتاب تفسیر کا موضوع یہی تفسیر ہے جس کے بارے میں ہم بعد میں وضاحت کریں گے۔

تفسیر موضوعی:۔

تفسیر موضوعی کے انواع واقسام کے بارے میں جہاں تک ہمارے علم میں آیا ہے کہ وہ تین قسم کی تفاسیر ہیں:

ا۔ ایک سورہ کو ابتداء سے انتہا تک ربط دے کر اس میں موجود تمام بحثوں سے

ایک نتیجہ اخذ کرنا۔

یہ نظریہ اس وقت قابل قبول ہوگا جب ہم اس نظریہ کو قبول کریں گے کہ آیات قرآنی میں اپنے ترتیب کے حوالے سے آپس میں گہرا ربط اور انتساب پایا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں مصر کے علوم قرآن کے ایک عالم محمد غزالی نے اپنی ایک کتاب ''نحو تفسیر موضوعی لسور القرآن'' تصنیف کی ہے جس میں انہوں نے سورۂ فاتحہ سے لے کر سورۂ ناس تک ہر ایک سورے کو ایک موضوع قرار دیا ہے۔ اس کی دوسری کتاب **نظم الدرر فی تناسب الایات و السور الامام برهان الدین البقاعی** المتوفی ۸۸۵ھ۔

۲۔ دین وشریعت سے متعلق آیات قرآنی کو جمع کر کے ہر ایک آیت پر بحث کر کے ایک نتیجہ یا نظریہ اخذ کرنا۔

اس قسم کی تفسیر موضوعی کا نمونہ آیت اللہ ناصر مکارم شیرازی کی کاوش کو قرار دیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اس سلسلہ میں ''پیام قرآن'' کے نام سے موضوعات قرآنی کی جمع بندی شروع کئے ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ کی دوسری کوشش آیت اللہ استاد جعفر سبحانی کی ہے کہ انہوں نے ''منشور جاوید'' کے نام سے ایک موضوع میں وارد آیتوں کو جمع کیا ہے۔

۳۔ تیسری تفسیر موضوعی کی تصویر ہمارے امام شہید آیت اللہ العظمیٰ سید محمد باقر الصدر (رضوان اللہ تعالیٰ علیہ) نے پیش کی ہے۔ یہ تفسیر دوسروں کی تفسیر موضوعی کی نوع سے مختلف ہے کہ انہوں نے جو تصویر پیش کی ہے وہ یوں ہے کہ آپ جس موضوع کو اٹھائیں، اس میں انسانی تجربہ اور معلومات کو جمع کر کے ایک نظریہ قائم کریں، پھر اس کو قرآن کے سامنے رکھیں اور قرآن سے اس نظریہ کے بارے میں حل یا جواب طلب کریں۔

تفسیر موضوعی کے اس مفہوم ومعنی کو امام شہید صدر (رضوان اللہ علیہ) نے ۱۳۹۹ھ میں ایک بحث قرآن کی تفسیر موضوعی کے تعارف کے طور پر پیش کیا اور اس کی تفسیر وتوضیح کے بعد قرآن میں تفسیر موضوعی کی اہم اور ضروری موضوعات میں سے ایک موضوع قرآن

کی رو سے قانون تاریخ کو پیش کیا جو چودہ دروس پر مشتمل ہے جس میں سے دو درس خود تفسیر کے بارے میں اور گیارہ درس قانون تاریخ کی تفسیر وتوضیح کے بارے میں ہیں۔ یہ موضوع ایک نئی فکر، نیا باب ہونے کے حوالے سے بعض قارئین کیلئے سمجھنے اور درک کرنے میں مشکل پیش آنے کے احتمال کے تحت ہم نے اس قانون سے متعلق کچھ مزید تفسیر وتوضیح کتاب کی تمہید میں پیش کرنا ضروری سمجھا۔ چنانچہ وہ وضاحت یہ ہیں۔

البتہ اس طریقہ کار میں بھی علماءِ اعلام کے نقطۂ نظر ایک دوسرے سے مختلف ہیں:

ا۔ بعض نے موضوع کو اٹھانے، اس سے متعلق تمام آیات کو جمع کرنے کے بعد ایک معنیٰ اخذ کرنے پر اکتفا کیا ہے اور دوسرا نقطۂ نظر وہ ہے جسے ہمارے نابغۂ روزگار شہید رابع حضرت آیت اللہ سید محمد باقر الصدر (رضوان اللہ تعالیٰ علیہ) نے اپنایا ہے۔ آپؒ تفسیر موضوعی کی تعریف میں لکھتے ہیں کہ تفسیر موضوعی وہ تفسیر ہے کہ جہاں مفسر زندگی سے متعلق مسائل کا انسانی تجربہ کی روشنی میں بغور مطالعہ کرتا ہے پھر اس سے متعلق آیات قرآنی کو جمع کر کے اس موضوع سے متعلق قرآن سے استفسار اور استنتاج کرتا ہے یہ طریقہ انہوں نے مولا امیرالمومنینؑ کے اس کلمہ سے اخذ کیا ہے۔ ﴿ذٰلِکَ الْقُرآنُ فَاسْتَنْطِقُوْهُ وَلَنْ يَنْطِقَ.﴾ اور وہ یہی قرآن ہے۔ اسے بُلوا کر دیکھو اور یہ خود نہیں بولے گا۔ (خطبہ ۲/۵۸) شہید اس طریقۂ کار کے کتاب ہٰذا شہید صدر کی اس تفسیر موضوعی کا نمونۂ کامل ہے۔ بارے فرماتے ہیں کہ اس طریقہ میں خوبی یہ ہے کہ شخصِ مفسر اپنے مسائل کو بہتر طریقے سے قرآن سے پوچھتا ہے اور یہاں پر وہ سائل اور قرآن جواب دھندہ ہے۔ ہم یہاں پر قائین کرام کے انظار محترم کی توجہ کی خاطر کچھ موضوعات جو انسانی زندگی سے گہرا تعلق رکھتے ہیں پیش کریں گے انشاء اللہ۔

قانون تاریخ آیات قرآنی کی رو سے:۔

آیت اللہ شہید باقر الصدرؒ تفسیر قرآن میں تفسیر تجزئی (یعنی اول سے آخر تک آیات کی ترتیب وتسلسل سے تفسیر) کرنے پر تفسیر موضوعی کو چند وجوہات کی بنیاد پر ترجیح فرماتے تھے اور خود تفسیر موضوعی کے محرکات میں سے قانون تاریخ کو سب پر مقدم اور ترجیح دی۔ کیونکہ یہ موضوعات دیگر موضوعات کی بہ نسبت ہدف نزول قرآن کریم اور اس کتاب عظیم کے حامل حضرت محمدؐ کے مبعوث ہونے کا فلسفہ انسانی معاشرے میں تبدیلی لانا تھا کسی معاشرے کی دگرگونی اس میں تغیر بطور صدفہ نہیں ہے بلکہ ہر انسان کا اس میں اختیار ہے۔

شہید صدرؒ فرماتے ہیں کہ جسطرح دنیا کے دیگر شعبوں میں قانون اور نظام حاکم ہیں ان سے بغاوت سرکشی یا انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اسی طرح تاریخی حوادث میں بھی تاریخ کو دگرگونی سے بچانا یا اس میں تبدیلی لانا تاریخ کے میدان پر حاکم قانون کے دروازے سے ہی ممکن ہے۔ اکثر قارئین کیلئے دین اور علوم قرآنی میں ایک نیا باب ہونے کی وجہ سے انکے اذہان اس سے نا آشنا ہیں۔ لہذا ہم نے ضرورت محسوس کی کہ اس موضوع سے متعلق پہلے کچھ وضاحت پیش کریں۔ تاریخی حوادث پر کوئی نظام قانون حاکم ہے یا نہیں اس سلسلے میں دور قدیم سے لیکر عصر حاضر تک پوری دنیا کے دانشور علماء تین نظریات وآراء میں تقسیم ہوتے ہیں۔ تاریخ کی تفسیر وتوضیح کے سلسلہ میں ہمارے پاس تین نظریات یا زاویئے اس وقت رائج ہیں:

پہلا نقطۂ نظر:۔

فہم ودرک تاریخ کو کلی طور پر مسترد کرنا، کہ تاریخ میں کوئی ایسا حتمی قانون اسباب وعلل ہے جو فیزکس اور کیمسٹری وغیرہ میں موجود ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ انسان کا ارادہ ہی قانون بناتا ہے۔ انسان خود آزاد وخودمختار ہے اس کے مقابلے میں قانون جام ہے اور انسان کے ارادے نے قانون سے حتمیت اور کلیت کو چھین لیا ہے۔ اس نظریہ کے داعی

تاریخ کی حرکت میں قانون علّتِ سبب وعلل کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ممکن نہیں کہ ہم تاریخ کے حوادث و واقعات کے سامنے خاضع ہو جائیں کہ جس طرح قانون فیزک وکیمسٹری وطبیعت خاضع ہو جاتے ہیں۔ بطور مثال جب درجہ حرارت سو پر پہنچتا ہے تو پانی ابل جاتا ہے اس تجربہ سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ جہاں بھی درجہ حرارت سو پر پہنچتا ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ پانی ابل گیا ہے۔ یہاں پر حرارت سو پر پہنچنا علّت ہے اور پانی کا ابلنا اس کا حتمی نتیجہ ہے۔ جبکہ ایسا قانون تاریخ میں جاری نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ تاریخ میں انسان کا کردار اس کا ارادہ ہے۔ وہ خود مختار ہے۔ وہ قانون علّت کو روک سکتا ہے اور اس کے اثر کو کم کر سکتا ہے۔ لہٰذا ہم یہاں سے حتمی طور پر قانون کو نہیں سمجھ سکتے، اس کو کلیت نہیں دے سکتے۔ یہاں سے ہم تاریخ کے مستقبل کے بارے کوئی پیشین گوئی نہیں کر سکتے اور میدانِ کیمیا اور طبیعت میں جو تجربہ حاصل ہے اس کو تاریخ میں نہیں لے سکتے۔ لہٰذا یہاں یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ علم قانون اسباب وملل اور تاریخ میں یگانگی اور وحدت پائی جاتی ہے وہ غلط ہے احکام طبیعت کو قانون پر نافذ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا نقطہ نظر:۔

قانون حوادث تاریخ کا اس طریقے سے تفسیر وتوضیح کرتے ہیں کہ جس طرح ایک عالمِ فیزکس فیزک کی تفسیر وتحلیل کرتا ہے کہ قانون اسباب وعلل تاریخ پر حاکم ہے اور تاریخ قانون اسباب وعلل سے خارج نہیں وہ بھی اسباب وعلل کے سامنے اتنا ہی خاضع ہے جتنا فیزکس، کیمسٹری، طبیعت۔ اور جو کلّیت وہاں ہے وہی کلیت یہاں موجود ہے۔ اس نظریہ کے حامل اور داعی کے نزدیک قانون کے بارے میں یا قانون کو چلانے، قانون کو متأثر وخاضع کرنے کے لئے قانون طبیعت سے ہٹ کر کوئی اور سبب وعلّت نہیں ہے اور اس نظریہ والوں کے نزدیک انسان اور اس کے ارادے اور اختیار کا تاریخ بنانے میں کوئی کردار نہیں ہے ان کا کہنا ہے کہ تاریخ اسی طریقے سے چلتی ہے کہ جس طرح عالم طبیعت چلتی ہے اور خود انسان تاریخ کے محکوم ہیں ان کا کہنا ہے کہ ماضی اور حاضر ایک

دوسرے سے متصل ہیں اور ایک دوسرے میں جدائی نہیں ڈال سکتے ہیں اور حرکت تاریخ حرکت جبری ہے کہ انسان اپنے اجتماع اور معاشرہ سے نجات وفرار نہیں کر سکتا اور ان کے نزدیک اجتماعی زندگی افراد کے فکر سے نہیں بنتے اور فرد اجتماع کے سامنے محکوم ہے۔

تیسرا نقطہ نظر:۔

انسان کا ارادہ تاریخ پر حاکم ہے یعنی تاریخ بھی قانون علّت کے اندر ہے لہٰذا ہم انسانی ارادہ اور قانون اسباب وعلل کے تحت قانون کو سمجھ سکتے ہیں۔

تیسرا نقطہ نظر کے مطابق انسان نہ قانونِ اسباب وعلل کو رد کرتا ہے اور نہ انسانی کردار کو، نہ قانونِ علّت کو رد کرتا ہے اور نہ کلیت کو ان کے نزدیک تاریخ قانون علّت اور انسانی ارادہ واختیار سب مل کر چلتے ہیں اس نظریہ کے تحت حرکت تاریخ کی اپنی حیثیت، قدر و قیمت ہے۔ یہاں مشیت جبری نہیں ہے۔ تاریخ کو انسان کے ارادہ کے سامنے خاضع کیا جا سکتا ہے اور انسان علّت کے رخ کو موڑ سکتا ہے۔ انسان خود علّت کا نگران ہے۔ یہ تفسیر وہی ہے جسے علماء، فلسفۂ الٰہی اور اسلامی فلاسفہ نے اپنایا ہے اور اس سلسلہ میں تاریخ کو تین بنیادوں پر قائم کیا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے تاریخ دو بنیادوں پر قائم نہیں رہ سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم صرف قانون علت کی بنیاد پر تفسیر نہیں کر سکتے اسی طرح صرف ارادۂ انسانی کی بنیاد پر بھی تفسیر نہیں کر سکتے بلکہ ان دونوں کے ساتھ ارادہ ومشیتِ الٰہی ومداخلتِ ربانی بھی ہیں۔ ان کا نظریہ ہے کہ ہم انسانی اجتماع اس کی ترقی وتمدن کو کائنات کے دیگر امورات سے الگ نہیں کر سکتے اور ہم اسے قانون اسباب وعلل سے خارج نہیں کر سکتے لہٰذا تمام قانون اسباب وعلل اس سے مربوط حتمیت، عمومیت اور قدر وقیمت سب جاری ہیں جو کچھ قانون اسباب وعلل طبیعت میں نافذ ہیں اسی طرح یہاں بھی قانون اسباب نافذ ہیں اور یہیں سے قانون حوادث اجتماعی، بڑے چھوٹے معاشرے میں پیدا ہونے والے انقلابات انسانی زندگی میں جمود وحرکت، کامیابی وناکامی، فتح وہزیمت، علم وجہل، زوال وفنا تمدن وپسماندگی یہ سب اجتماعی حرکت کا مظاہرہ ہیں جو خود بخود بغیر کسی سبب وعلت کے

وجود میں نہیں آتے بلکہ ماضی کا نتیجہ ہیں اور تمدن وترقی ایک تسلسل ہے جو اپنے ماضی سے مربوط ہے اور اپنے مستقبل کے لئے سبب بنتا ہے۔

قارئین کرام اور علماءِ اعلام! لکیر کے فقیر نہ رہیں اور اگر گذشتہ علماءِ اعلام نے ''العذاب فی القرآن'' لکھا ہے تو آپ بھی اس پر لکھیں اور اگر کسی نے ''ملائکہ، جن یا انسان فی القرآن'' لکھا تو آپ بھی اسی موضوع پر لکھیں یا ہمارے شہید بزرگوار نے جہاں ''تاریخ فی القرآن'' لکھا ہے آپ بھی اسی پر لکھیں۔ یہ کوئی معقول عمل نہیں بلکہ یہ ایک جمود ہے تحصیل حاصل جمع معلومات ہیں ممکن ہے کہ آپ کچھ اوراق کا اس میں اضافہ کریں، کچھ اور آیات نکالیں اور چند مسائل میں اپنا ذاتی نوٹ لکھیں۔لیکن اس انسان بے چارہ سے کوئی قابل قدر چیز نہیں ملے گی بلکہ خود کو بھی ایک انسانِ عاقل، صاحب فہم وادراک، صاحب سماعت وبیان لب وعقل تسلیم کر کے نئے موضوعات کا اضافہ کریں۔انسان جو اس وقت مغربی الحاد کے پے در پے حملوں کی وجہ سے زخمی حالت میں ایمرجنسی روم میں ہے انہیں مزید ضرب طعن کے ساتھ سب ودشنام اور تنزیہ اور فرسودہ اور وحشی قرار دیتے ہیں لہٰذا ان روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ جس میں کہا ہے کہ ''قرآن کے بعد فقر نہیں''، ''جس کے پاس قرآن ہے وہ غنی ہے'' زندگی کے لئے اعلیٰ اصولوں کا حاصل اپنے قلم وبیان سے ثابت کریں۔

تفسیر موضوعی:۔

جسے تفسیر توحیدی بھی کہتے ہیں شہید ان دونوں اصطلاحات کی توجیہ میں فرماتے ہیں کہ ہم اس کو اس لئے موضوعی کہتے ہیں کہ یہاں ابتداء ایک موجود خارجی سے شروع کرتے ہیں لیکن برگشت قرآن پر ہوتی ہے۔ چونکہ وجود خارجی سے شروع کیا ہے اس وجہ سے موضوعی کہتے ہیں اور توحیدی اس لئے کہتے ہیں کہ اس تفسیر میں انسانی تجربہ اور قرآنی نقطہ نظر میں ہم آہنگی نظر آتی ہے۔توحیدی کہنے کی ایک اور توجیہ میں فرماتے ہیں کہ مختلف آیات میں ہم آہنگی کا پایا جانا ہے۔

پیش درس اول:۔

(۱) اقسام وانواع تفسیر قرآن میں دو تفسیر علماء کے توجیہات کا مرکز بنی ہوئی ہیں:

۱۔طریقہ تفسیر تجزئی: ترتیب سورہ وآیات کے تحت ابتداء سے آیہ کو یک بعد دیگر تفسیر کرنے کو تفسیر تجزئی کہتے ہیں یہاں مفسر کی توجہ آیت کے لفظی معنی کو کشف کرنا ہوتا ہے۔

۲۔تفسیر موضوعی: زندگی کو درپیش مسائل کی تقسیم بندی کر کے اعتقادی، اجتماعی، تکوینی میں سے ایک موضوع خارجی کے بارے میں حاصل معلومات کو قرآن کریم کے محضر میں پیش کر کے اس سلسلہ میں وارد آیتوں کو جمع کر کے اس سے ایک نظریہ قرآنی پیدا کرنے کو تفسیر موضوعی کہتے ہیں۔

(۲) ہمارے ہاں فقہ میں اس قسم کی موضوعیت عرصے سے جاری ہے تاہم اس کی پیش قدمی میں جمود اور وقفہ پایا جاتا ہے جبکہ ہمارے ہاں قرآن کریم سے متعلق تجزئی طریقہ ہی حاوی ہے۔

(۳) ان دونوں تفاسیر کا موازنہ اور مقابلہ میں تفسیر تجزئی میں مفسر کا کردار صرف سماعت ہے اس کے علاوہ کوئی اور کردار نہیں جبکہ تفسیر موضوعی میں مفسر کا کردار مثبت ہے۔

(۴) تفسیر تجزئی میں آیت کی تفصیلی معانی کی اصول تک محدود ہے جبکہ تفسیر موضوعی سے متعلق قرآنی نقطہ نظر قائم کرنا ہے۔

(۵) تفسیر موضوعی افضل وارجح ہے تفسیر تجزئی کے مقابلے میں کیونکہ اس میں انسانی تجربہ اور قرآنی نقطہ نظر دونوں حاصل ہیں۔

(٦) قرآنی نقطہ نظر کو حاصل کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی ہے کیونکہ دور پیغمبرؐ میں فکر پیغمبرؐ اور فہم امت میں جو واسطہ تھا وہ خالص اور صاف عربی زبان میں تھا جبکہ گزشت زمان کے ساتھ وہ خطاب جوامت سے تھا آنے والے نسلوں کے لئے زبان قرآن اپنے معروف سے خارج نظر آتا ہے جس کی واضح مثال ابتداء زمانہ میں عربی بولنے والوں کے لئے عربی قواعد کو سیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی جبکہ اس وقت عرب خود اپنی زبان کو سیکھنے

کے لئے صرف ونحو کے نیاز مند ہیں اسی طرح زمان نزول قرآن اور ہمارے درمیان جتنا فاصلہ ہوتے جائیں گے ہمیں قرآنی نقطہ نظر کی وضاحت کرنے کی مزید ضرورت ہوگی۔

ترجمہ تفسیر شہید الصدرؒ:۔

مترجم اس کتاب قیم ومبارک کو اردو زبان میں منتقل کرنے کے لئے تمام ضروری شرائط عالی سے عاری ہیں کیونکہ ترجمہ میں دونوں زبان پر عبور وتسلط کے علاوہ فکر سے بھی مالوف ومانوس ہونا بنیادی شرائط ترجمہ ہے؟ حقیر ان تینوں شرائط کے حامل نہ ہونے کے باوجود اس عمل میں اس لئے وارد ہوا کہ یہ تفسیر اس مبارک صدر سے نکل کر ایک ربع صدی گزرنے والے ہیں لیکن ابھی تک اس کتاب کے اندر موجود گراں قدر انسان وتاریخ ساز افکار ونظریات سے اس خطے والے محروم ہیں یہ دیکھ کر میں نے خود کو اس نابغہ روزگار سے موازنہ کیا جو اپنی فاقد صلاحیت اور عدم قابلیت سے پریشان غور کر رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک چیونٹی پر پڑی جو زمین سے ایک بلندی کی طرف صعود کر رہی تھی لیکن درمیان سے گر جاتی تھی چندین بار گرنے کے بعد اس چیونٹی نے چوٹی کو سر کیا۔ یہ دیکھ کر اس نابغہ روزگار کی ہمت بڑھی اور بعد میں نابغہ روزگار بنے اسی طرح ہم نے بھی اس چیونٹی کی مانند ہمت کی ہے لیکن ہمارا مقصد نہ کسی چوٹی کو سر کرنا ہے اور نہ نابغہ روزگار بلکہ ادائے فرض کرتے ہوئے اس قانون معروف ومشہور سے تمسک کرتے ہوئے جہاں کہتے ہیں کہ میسر وممکن کُل کے ناممکن سے ساقط نہیں ہوجاتے۔ ہم نے اپنی محدود توانائیوں کو کام میں لاکر اور ساتھ دیگر برادران سے معاونت لیتے ہوئے اس کی نقل زبانی کرنے کی کوشش کی ہے اگر تمام ممکن نہ ہو تو نصف سے محروم رکھنے کی کوئی منطق نہیں بنتی۔ اس اصول کے تحت اس عمل میں ہاتھ بڑھایا ہے۔

آثار قرآنی:۔

آثار قرآنی امام شہیدؒ کا ترجمہ اس عزم اور ارادے سے نہیں کیا کہ ہم ترجمہ کرنے کی صلاحیت وقابلیت کے حامل ہیں یا اس امید سے بھی ترجمہ نہیں کیا کہ اس کا سو فیصد یا اسّی فیصد حق ادا کریں یا اس نیت سے بھی نہیں کیا کہ ہم اس شہید کا کچھ حق ادا کریں گے بلکہ ہم نے اس نیت سے ترجمہ کیا ہے کہ جو درّ وجواہر قرآن کریم سے متعلق اس شہید کی زبان سے نکلے ہیں اگر اس کا سو فیصد نتیجہ نہیں لا سکتے تو یہاں کے مسلمان کیوں کر پچاس فیصد سے محروم رہیں۔ ہم نے اس پچاس فیصد نتیجہ کی امید سے اس میدان میں قدم رکھا ہے کہ کم سے کم پچاس فیصد معارف قرآن سے یہاں کے مسلمان آشنا ہوجائیں گے۔ شہید باقر الصدر کی تفسیر قرآن سے متعلق اس آثار کو ترجمہ کرنے کی اہلیّت اور صلاحیت سے فاقد ہونے کے باوجود اور اپنی نااہلی کا اعتراف کرتے ہوئے یہ سعی اس منطق کے تحت کی کہ کم از کم پچاس سے ساٹھ فیصد تک مقصود مفہوم قارئین تک پہنچ جائے۔ یہ منطق میری اپنی اختراعی یا خودساختہ منطق نہیں بلکہ یہ سنّت قدیم دور سے عصر حاضر تک حلقۂ علم ودانش میں جاری وساری ہے۔ کتاب زخیم ہونے کی وجہ سے چھاپ نہ سکنے سے کہیں تشنگان علوم ومعارف یا بکل محروم نہ رہیں اس کتاب کا خلاصہ کر کے پچاس فیصد میں پیش خدمت ہے۔ اس طرح اور بھی ایسی ہزاروں کی تعداد میں کتابیں آپ کو ملیں گی جو شعوری اور غیر شعوری طور پا مصنف کے مطالب کو خام اور ناقص انداز میں پیش کرتے رہے ہیں۔ ان میں سے اکثر وبیشتر کی خواہش حُسن نیّت پر قائم رہی ہے، اور اس نظریّہ پر کہ جتنا ممکن ہو سکے اُسے تو سامنے لایا جائے۔ اس سے واضح اور روشن ایک اور مثال پوری دنیائے انسانیّت، اُمت مسلمہ اور غیر مسلمین تک قدیم زمانے سے عصر حاضر تک رہی ہے اور اسّی فیصد کو اعتراف بھی ہے کہ کتاب خدا یعنی قرآن کریم کا ترجمہ کسی اور زبان میں صحیح معنوں میں کامل اور تام صورت میں کرنا کسی کی امکانی قدرت اور توانائی میں نہیں۔ شاید اس اعتراف کی دلیل میں وہی آیات ہوں گی جن میں خداوند عالم نے جن وانس کو اس جیسی لانے سے عاجز اور

ناتوان قرار دیا۔ تمام علماء، فقہاء اور عقلائے عالم اس بات پر متفق ہیں کہ قرآن کریم کا ترجمہ دوسری زبان میں کرنے میں حرج نہیں بلکہ مستحسن ہے کہ عربی تک رسائی نہ رکھنے والوں تک معارف پہنچیں۔ ان دو وجوہ کو سامنے رکھتے ہوئے خاکسار نے بھی جرأت کی اور ہمّت باندھی ہے کہ اس عظیم نابغۂ روزگار کی کتاب اور وہ بھی قرآن کریم سے متعلق اور ایسا موضوع جو اس وقت اس خطہ میں ہماری اُمت مسلمہ کے جسم کو لاحق زخم میں سیاسی، اجتماعی، ثقافتی ابتری اور برتری جیسے رستے ہوئے زخموں کیلئے ایک نسخہ الٰہی تھا جسے ایک طبیب نہو تو اسکا معاون ہنگامی مریض کو ہنگامی طور پر ابتدائی علاج کرتا ہے۔ احقر نے بھی ایسا کیا ہے۔ اگر ہمارے معاشرے میں صلاحیت واہلیت کے حامل افراد موجود ہیں جو ان آثار کے شایانِ شان ترجمہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں وہ آگے بڑھیں۔

قرآن کریم سے متعلق امام شہید کے آثار جو تین حصوں میں دستیاب ہوئے ہیں۔

۱۔ ایک حصہ ان ابتدائی آثار ہیں جو ''مقدمات تفسیر یا علوم قرآنی سے آشنائی'' کے موضوع پر آپ نے کلیہ اصول دین کے لئے علوم قرآنی کی نصاب کے طور پر تحریر فرما کر پیش کیا تھا۔

۲۔ دوسرا موضوع مجلّہ ''الاضواء'' جو کہ جماعت علماءِ نجف اشرف کی نگرانی میں نشر ہوتا تھا ان کے طلب کی بنیاد پر قرآن سے متعلق پیش کئے گئے مقالات ہیں۔

۳۔ تیسرا موضوع وہ سلسلہ دروس ہیں جو آپ نے اپنی شہادت سے چند سال پہلے اپنے حلقۂ درس میں شریک شاگردوں کے لئے دیئے تھے جو کیسٹ میں رکارڈ تھے اور بعد میں ''مدرسہ قرآنیہ یا تفسیر موضوعی کے نام سے نشر ہوا ان تینوں کو ہم نے اپنی صوابدید کی بنیاد پر تنظیم وترتیب دی ہے ورنہ کسی ترتیب میں نہیں تھے۔''

شہید صدر کی فکر اور زبان کو دوسری زبانوں میں کما ہو حقّہٗ منتقل کرنا ایک مشکل اور گراں محل ہونے کے بارے میں کچھ وضاحت سابقہ سطور میں آپ کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے۔ کتاب ہذا کو موجودہ شکل وصورت تک لانے میں میری تنہا کوشش نہیں ہے۔ بلکہ

اس کتاب کو قارئین کرام کے حضور پیش کرنے اور حقیقی معنوں میں معارف اسلام وقرآن کے تشنگان کی خدمت میں پیش کرنے کیلئے بہت سے برادران سے مدد لی گئی ہے۔ جنہوں نے اس کتاب میں میری معاونت کی ہے ان کا ذکر کرنا بھی عدل وانصاف کا تقاضا سمجھتا ہوں خاص کر بعض برادران کی خدمات انتہائی قابل قدر اور نا قابل نظر انداز ہیں۔ اگر ان برادران کی معاونت نہیں ہوتی تو میرے لیئے یہ ناممکن تھا کہ اس کتاب کو اس صورت میں پیش کروں جن برادران نے میرے ساتھ اس ترجمہ میں معاونت کی ہیں ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

جناب برادر خادم حسین صاحب۔ جناب برادر عرفان صاحب۔ جناب محمّد باقر صاحب۔ جناب سیّد ناصر شاہ صاحب۔ جناب رسالت حسین کوثر صاحب۔ جناب سیّد محمّد باقر صاحب۔ جناب سیّد محمّد سعید موسوی صاحب۔

ان برادران کی کوششوں سے یہ کتاب اپنی طبیعی مراحل سے گزرتے ہوئے کتاب کی صورت میں آئی ہے۔ ہم ان کیلئے اس دنیا میں مزید اس کتاب عظیم کو ہر پہلو سے بلند کرنے کی توفیقات کیلئے دست بدعا ہیں ساتھ ہی ان کی خدمات کو اس درگاہ میں قبولیّت سے نوازنے کیلئے بھی دعا گو ہیں۔ آخر میں تمام قارئین کرام سے وہی جملہ تکرار کرتے ہیں کہ جو ہم ہر کتاب کی تمہید میں پیش کرتے ہیں۔ اگر میرے قلم وزبان سے کوئی لغزشیں یا کوتاہیاں ہوئی ہیں تو اس کی اصلاح کا متمنی ہیں۔ اگی حق وحقیقیت پر مبنی ہے اور واقعے سے مطابقت رکھتی ہے تو مزید توفیقات کے ساتھ درگاہ الٰہی میں قبولیّت کیلئے بھی ملتمس ہیں۔

سید علی شرف الدین موسوی

ذی القعدہ الحرام ۱۴۲۳

قرآن کریم کے اسماءِ حسنیٰ

قرآن کریم وہ کلام معجز ہے جو وحی کی صورت میں نبی اکرمؐ پر نازل ہوا جو ابھی مصحفوں کی شکل میں موجود ہے۔ یہ آپؐ سے تواتر سے نقل ہوا ہے جس کی تلاوت ایک تعبدی عمل ہے۔ جس طرح عرب اپنے کلاموں کے لئے اسم وضع کرتے تھے۔

خداوند عالم نے اپنے نبیؐ پر وحی کئے جانے والے اس کلام معجزہ کے لئے کچھ اسماء انتخاب کئے ہیں۔ لیکن خدا نے ایک خاص محدود اسماء دینے کا اہتمام کیا ہے اور خود قرآن کے لئے نئی اصطلاحات کے تحت اسماء دیئے ہیں یہ اسماء دینے کا عمل اس سیرت سے مطابقت رکھتا ہے جس پر اسلام چلا ہے یعنی اسلام میں جو حقائق اور مفاہیم پائے جاتے ہیں ان کے لئے اپنا ایک طریقہ اور اپنی ایک روش ہے۔ دور جاہلیت میں اسماء دینے کے لئے جو روش رائج و استعمال تھی اس پر خدا کی اس نئی روش کو ترجیح دینا اسلام کی روح سے موافقت رکھتی ہے اس کے دو اسباب ہیں:

۱۔ وہ کلمات جو دور جاہلیت کے عرف عام میں زیادہ رائج تھے اسلامی مفاہیم کو امانتداری کے ساتھ ادا نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہ کلمات دور جاہلیت کی جاہلانہ فکر اور اسی دور کی ضرورت کی پیداوار تھے۔ وہ اسلامی افکار کو بیان کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے کیونکہ اسلامی مفاہیم کا ان کی اس فکر سے کوئی ربط نہیں ہے۔

۲۔ نئی اصطلاح ایجاد کرنے اور اس نام سے پکارنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سے اسلام کی پہچان ہوتی ہے اس سے نئی شکل وصورت پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے اور ساتھ میں اسلامی ثقافت اور غیر اسلامی ثقافت کے درمیان موجود بنیادی فرق واضح ہوجاتا ہے۔

لہٰذا خداندعالم نے اپنی کتاب کے لئے کچھ محدود اور مخصوص اسماء وضع فرمائے ہیں:

(۱) کتاب:۔

خدا نے اس کا نام کتاب رکھا: ﴿ذالک الکتٰب لاریب فیہ ھدًی للمتقین﴾ ''یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی طرح کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں، ہدایت ہے تقویٰ والوں کے لئے'' (بقرہ/۲)

(۲) قرآن:۔

اسکا قرآن نام رکھا ہے: ﴿وما کان ھٰذاالقراٰن ان یّفترٰی من دون اللہ ولکن تصدیق الّذی بین یدیہ وتفصیل الکتاب لاریب فیہ من رّب العالمین﴾ ''اور یہ قرآن کسی غیر خدا کی طرف سے افترا نہیں ہے بلکہ اپنے ماسبق کی کتابوں کی تصدیق اور تفصیل ہے جس میں شک کی گنجائش نہیں ہے یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے'' (یونس/۳۷) اپنے کلام کو کتاب رکھنا اس معنی ومفہوم کی طرف اشارہ ہے کہ اس کی مضامین کے آپس میں گہرا ربط اور اس کی اہداف اور ترجیحات اور یگانگی ہے یہاں تک کہ وہ سب کتاب واحد کہنے کا مستحق ہے۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ اسم اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کا کلام سطروں میں جمع ہوا ہے کیونکہ کتابت حروف کو جمع اور الفاظ کو لکھنے سے وجود میں آتی ہے۔

اس کو قرآن کہنا اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ زیادہ قرائت وتلاوت سے سینوں میں محفوظ ہوا ہے۔ قرآن مصدر ہے قرائت کا اور زیادہ قرائت کرنا نص کی اظہار کے لئے ہوتا ہے۔ پس کلام الٰہی کو کتابت اور حفظ دونوں امتیاز حاصل ہے۔ یہ اپنی صیانت اور حفظ میں نہ تنہا کتابت پر منحصر ہے اور نہ حفظ وقرائت پر بلکہ بیک وقت یہ کتاب بھی ہے اور سینوں میں محفوظ بھی۔

(۳) فرقان:۔

اس کا ایک اور اسم فرقان ہے ﴿تبٰرک الذی نزل الفرقان علٰی

عبدہٖ﴾ ''بابرکت ہے وہ خدا جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا ہے'' (فرقان/۱)
کلمہ فرقان تفرقہ کا معنیٰ دیتا ہے۔ گویا اس کتاب کو فرقان کہنا اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ حق و باطل کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے اس نے حقیقت شناسی کے لئے جو مقیاس اور اصول اپنائے ہیں کے تحت ہر وقت اس کے ذریعہ سے حق اور باطل میں تمیز کیا جاسکتا ہے۔

(۴) ذکر:۔

اس کا ایک اسم ذکر ہے ﴿وھٰذا ذکر مبارک انزلنٰہ﴾ ''اور یہ قرآن ایک مبارک ذکر ہے جسے ہم نے نازل کیا'' (انبیاء/۵۰) جس کا معنیٰ شرف و افتخار ہے جیسا کہ سورۂ انبیاء آیت نمبر ۱۰ میں ''ذکر'' شرف کے معنی میں آیا ہے: ﴿لقد انزلنا الیکم کتٰبًا فیہ ذکرکم﴾ ''بیشک ہم نے تمہاری طرف وہ کتاب نازل کی ہے جس میں خود تمہارا بھی ذکر ہے''
اس کے علاوہ اور بھی الفاظ و کلمات ہیں جن کا اطلاق قرآن کریم کے وصف کے طور پر ہوتا ہے نہ کہ اسم کے طور پر جیسے مجید: ﴿بل ھو قراٰن مجید﴾ ''یقیناً یہ بزرگ و برتر قرآن ہے'' (بروج/۲۱)

(۵) عزیز:۔

﴿وانہ لکتٰب عزیز﴾ ''اور یہ ایک عالی مرتبہ کتاب ہے'' (فصلت/۴۱)

(۶) اَعلیٰ:۔

﴿وانّہ فیۤ امّ الکتٰب لدینا لعلیٌّ حکیم﴾ ''ہمارے ہاں بڑی بلند مرتبہ اور حکمت سے لبریز کتاب ہے '' (زخرف/۴)

علوم قرآن:۔

قرآن سے متعلق تمام معلومات، بحث و گفتگو کو علوم قرآنی کہتے ہیں۔ یہ تمام علوم اسی جہت سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں جس جہت سے وہ قرآن سے ربط رکھتے ہیں۔ قرآن کے متعدد تعبیرات ہیں اور ہر تعبیر کیلئے ایک خاص موضوع گفتگو ہے۔ اوران تمام تعبیرات میں سے اہم تعبیر خود قرآن ہے اس حیثیت سے کہ یہ ایک کلام ہے جو کسی معنیٰ پر دلالت کرتا ہے۔ قرآن اس صفت کے حوالے سے علم تفسیر کا موضوع ہے۔ پس علم تفسیر قرآن کے بامعنیٰ کلام ہونے کے اعتبار سے بحث و گفتگو پر مشتمل ہوتا ہے لہٰذا اس میں اس کے معانی کی تشریح ہوتی ہے۔ اس کے دلائل اور مقاصد کو بیان کیا جاتا ہے۔ اسی حوالے سے علم تفسیر تمام علوم قرآن میں سب سے اہم اور بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔
قرآن اس صفت کے حوالے سے کہ وہ نظام شریعت کے مصادر میں سے ہے۔ اس زاویہ سے یہ علم بہ آیات احکام کا موضوع ہے۔ ایک خاص علم ہے جو قرآن کی آیات واحکام سے مختص ہے۔ اس علم میں ان احکام کے بارے میں پڑھایا جاتا ہے کہ جو ممکن ہے ان آیات کا باقی ادلہ شرعی (سنت، اجماع اور عقل وغیرہ) سے موازنہ ہونے کے بعد استخراج ہوسکے اور کبھی کو قرآن پیغمبر اکرمؐ کی نبوت کی دلیل کے طور پر لیتے ہیں تو اس وقت یہ علم کا اعجاز موضوع بنتا ہے۔ اعجاز قرآن وہ علم ہے کہ جس میں اس بات کی تشریح ہوتی ہے کہ قرآن کریم وحیٔ الٰہی ہے اور صفات اور خصوصیات کے ذریعے استدلال ہوتی ہے کہ جس کے ذریعے بشری کلام سے تمیز اور فرق نمایاں کرسکیں۔
کبھی قرآن پر اس حوالہ سے بحث ہوتی ہے کہ یہ نص عربی ہے جو لغت عربی کے مطابق ہے۔ اس اعتبار سے یہ علم اعراب قرآن، علم بلاغت قرآن کا موضوع بنتا ہے اور یہ دونوں وہ علم ہیں کہ جن میں آیات قرآنی پر نحو اور بلاغت کے قواعد اور نظام کے تحت بحث کرتے ہیں۔ اور کبھی قرآن پر اس حوالہ سے بحث ہوتی ہے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں رونما ہونے والے واقعات اور حوادث سے مربوط ہے۔ اس نقطہ اور نظریہ

سے یہ علم اسباب نزول کا موضوع ہے۔

کبھی قرآن لفظ مکتوب ہونے کے حوالہ سے موضوع بحث ہوتا ہے تو اس وقت یہ علم رسم القرآن کا موضوع ہے اور یہ وہ علم ہے جس میں رسم قرآن اور اس کی کتابت کے طریقہ کار کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں۔ کبھی قرآن ایک پڑھا جانے والا کلام ہونے کے حوالہ سے مورد بحث وگفتگو ہوتا ہے تو یہ علم قرآئت کا موضوع ہے کہ یہ وہ علم ہے کہ جس میں حروفِ قرآن اور اس کے حرکات اور طریقہ قرآئت اور دیگر چیزوں کے بارے میں جو قرآن سے متعلق ہیں بحث کرتے ہیں اور یہ تمام ابحاث ایک نکتہ میں مشترک ہیں اور ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں وہ نکتہ قرآن کا موضوع بحث وگفتگو ہوتا ہے اور اس حوالہ سے کہ قرآن کریم کے جس پہلو کا لحاظ رکھا جاتا ہے یہ سارے ابحاث ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

تفسیر ایک علم:۔

تفسیر اپنی جگہ ایک علم ہے اور اس حوالے سے قرآن کریم کے بارے میں بحث وگفتگو کرتے ہیں اور نیز اس حوالے سے بھی کہ یہ خداوند عالم کا کلام ہے۔

اس کی توضیح کچھ یوں ہے: خود قرآن کریم کے لئے چند زاویئے ہیں:

قرآن کریم کا کبھی اس حوالہ سے ملاحظہ ہوتا ہے کہ کچھ حروف ہیں جو ایک ورق پر لکھے گئے ہیں، کبھی اس حوالہ سے ہے کہ یہ ایک آواز ہے جسے ہم پڑھتے ہیں اور زبان سے آواز کی صورت میں نکالتے ہیں اور کبھی اس حوالہ سے کہ یہ کلام خدا ہے۔

قرآن کریم کو ان تینوں اعتبارات اور ملحوظات سے دیکھیں تو ان میں سے ہر ایک ایسے علم کا موضوع بن جاتا ہے جس میں ان تینوں پر الگ الگ بحث ہوتی ہے:

۱۔ قرآن کریم جو کہ حروف کے لحاظ سے کہ جو لکھا جاتا ہے علم رسم قرآن کا موضوع ہے جس میں آیات قرآنی کی کتابت کے قواعد اور اصول سکھاتے ہیں۔

۲۔ قرآن اس لحاظ سے کہ اس کی تلاوت ہوتی ہے علم قرائت اور علم

تجوید کا موضوع ہے۔

۳۔ قرآن کلام اللہ ہونے کے لحاظ سے علم تفسیر کا موضوع ہے۔

پس علم تفسیر میں وہ تمام ابحاث شامل ہیں جن میں قرآن پر بحیثیت کلام خدا بحث وگفتگو ہوتی ہیں لہٰذا علم تفسیر میں کتابت حرف پر بحث شامل نہیں ہوتی اور نہ طریقہ نطق پر بحث اس میں شامل ہوتی ہے کیونکہ قرآن کی کتابت اور نطق پر بحث اس کے کلام اللہ ہونے کے اعتبار سے نہیں ہے۔ نہ تو کتابت اور قرائت قرآن کے خصوصی اوصاف میں سے ہے اور نہ کیفیت کتابت اور قرائت میں کلام اللہ ہونا کوئی دخل رکھتا ہے۔

جی ہاں علم تفسیر کی وضاحت میں مندرجہ ذیل ابحاث شامل ہیں:

۱۔ قرآن کریم کے ہر لفظ اور جملے کے معنی اور مفہوم میں بحث کرنا کیونکہ لفظ قرآنی کا مدلّل یہ معنی یا وہ معنی ہونا قرآن کریم کے صفات میں اس اعتبار سے ہے کہ یہ کلام اللہ ہے لیکن حروف اور آواز محض حروف اور آواز ہونے کے اعتبار سے قرآن کریم کی صفات میں سے نہیں ہیں۔

۲۔ اعجاز قرآن کے بارے میں بحث وگفتگو اور قرآنی اعجاز کے مختلف پہلوؤں کو کشف کرنے کے لئے بحث کرنا کیونکہ قرآن کا اپنے مقصود پر دلالت کرنے والا کلام ہونے کے اعتبار سے قرآن کریم کے اوصاف میں سے اعجاز ایک وصف ہے۔

۳۔ قرآن کے اسباب نزول پر میں بحث وگفتگو:

جب ہم سبب نزول کے حوالہ سے آیت پر بحث کرتے ہیں تو اس کو ایک کلام کے عنوان سے ملاحظہ کرتے ہیں یعنی ایک مفید لفظ ہے جو اپنے معنی پر دلالت کرتا ہے کیونکہ جو چیز کلام نہ ہو وہ کسی معنی پر دلالت نہیں کرتا اور اس کا کسی واقعہ سے کوئی ربط نہیں ہوتا ہے کہ وہ واقعہ آیت کے نزول کا سبب بنے۔

۴۔ ناسخ ومنسوخ، خاص وعام، مقید ومطلق پر بحث: یہ سب نص قرآنی کے اندر شامل ہیں اس کے ایک معنٰی پر دلالت کرنے والے کلام ہونے کی حیثیت سے۔

۵۔ تاریخ پر قرآن کے اثرات کے بارے میں بحث وگفتگواور انسانیت کو بنانے اوراس کو ہدایت کی طرف لے جانے میں قرآن کے کردار پر بحث: کیونکہ قرآن کے اثرات اور کرداردونوں کی برگشت قرآن کے کلام اللہ کے لحاظ سے فعالیت اور عملی ہونے پر ہے فقط حروف کہ جنھیں لکھا جاتا ہے یا آواز کہ جسے حلق سے نکالا جاتا ہے اثرات اور کردار نہیں رکھتے ہیں۔ان کے علاوہ کچھ ایسے بھی ابحاث ہیں جو قرآن سے اس کے کلام اللہ ہونے کے لحاظ سے ربط رکھتے ہیں تفسیر کی اس تعریف کے ضمن میں ہم نے اس کی موضوع کو بھی واضح کیا اور وہ قرآن ہے اس لحاظ سے کہ وہ کلام خدا ہے۔

اس بیان کی روشنی میں ہم نے جان لیا کہ ناسخ ومنسوخ پر علم کا اطلاق ہوتا ہے اسباب نزول ان کو علم کہا جاتا ہے یا اعجاز القرآن کو علم کہا جاتا ہے۔ان ابحاث میں کہ جو انہی سے متعلق ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ سب علوم ایک علم میں درج نہیں ہوسکتے ہو کہ اس علم کا نام علم تفسیر ہے بلکہ اگر ہم غور کریں تو حقیقت میں یہ سب اسی علم کے مختلف پہلو ہیں۔ ہر ایک پہلو میں کلام اللہ کے ایک خاص ہدف کی تحقیق ہوتی ہے جو کلام اللہ کے ایک خاص پہلو پر بحث سے متعلق ہے ۔پس علم اعجاز القرآن میں کلام اللہ کو موضوع بحث قرار دیکر انسانی فکر اور تصورات میں جو توانائیاں پیدا ہوئی ہیں یا آئندہ ہونے والی ہیں ان سے موازنہ ہوتا ہے تاکہ یہ واضح کردیں کہ یہ قرآن ان تمام توانائیوں سے مافوق ہے یہی اعجاز کا معنی ہے اور علم اسباب نزول میں قرآن میں موجود کلام اللہ پر اس حوالہ سے بحث ہوتی ہے کہ وہ کونسے حوادث اور واقعات ہیں جو اس کے نزول سے مربوط ہیں۔ دوسرے پہلوؤں میں بھی اسی طرح بحث وگفتگو ہوتی ہیں۔

تاریخ علوم قرآن:۔

لوگ پیغمبرؐ کے زمانے میں قرآن سنتے تھے اوراس خالص عربی کے ذوق کی بنیاد پر قرآن کو سمجھتے تھے اور جہاں انھیں کسی آیت یا کلمہ کو سمجھنے میں مشکل پیش آتی یا اس میں تفصیل ووسعت کی ضرورت محسوس کرتے وہاں پیغمبرؐ سے رجوع کرتے تھے۔

اوراس حوالے سے علوم قرآن بطور مستقیم خود پیغمبرؐ کی زبان مبارک سے لیتے تھے لیکن رحلت پیغمبرؐ کے ایک عرصہ گزرنے کے بعد اسلامی جنگی فتوحات میں وسعت آئی اوراس سے علوم قرآن کو خوف لاحق ہوا اور یہ احساس پیدا ہوا کہ قرآن کو صرف زبانی سننے پر اکتفا نہیں کیا جاسکتا ہے کیونکہ پیغمبرؐ سے سننے کی جو نسبت ہے اس میں زمانی فاصلہ آگیا ہے اور عرب غیر عرب میں مخلوط ہوا ہے اور ان غیر عرب قوموں کی اپنی ایک خاص زبان اور خاص طریقہ تکلم ہے۔ یہاں سے مسلمانوں کے اندر ایک فکر اور ایک تحریک بیدار ہوئی کہ علوم قرآن کو ضبط کیا جائے اور جو دوسرے ضروری تحفظات ہیں انھیں مہیا کیا جائے تاکہ اس کو تغیر وتحریف سے بچایا جاسکے۔

حضرت امام علی علیہ السلام نے تحفظات کی ضرورت کا احساس کرنے میں دوسروں سے سبقت لی۔پیغمبرؐ کی وفات کے فوراً بعد جمع قرآن کی طرف متوجہ ہوئے چنانچہ ابن ندیم نے ''کتاب الفہرست'' میں لکھا ہے کہ جب علیؑ نے پیغمبرؐ کی رحلت کے موقع پر لوگوں کی حالات کو دیکھا تو قسم کھایا کہ اپنے دوش پر عبا کو نہیں رکھیں گے جب تک قرآن کو جمع نہ کریں اوراس کے تحت حضرتؑ تین دن اپنے گھر میں رہے اور قرآن کو جمع کیا۔اس سلسلہ میں آئندہ جمع قرآن کے موضوع پر گفتگو کے دوران مزید تفصیل مہیا کریں گے۔

اس وقت اس موضوع کے بارے میں جو کچھ ارادہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت امت کو قرآن کے بارے میں جو خوف لاحق تھا اور وہ اس کے لئے ضروری تحفظات فراہم کرنے کی خواہاں تھی اس کا آغاز پیغمبرؐ کی وفات کے بعد مسلمانوں کے ذہن میں ہوگیا تھا۔اوران سرگرمیوں کا خلاصہ یا نتیجہ علوم قرآن اوراس کے لئے دوسرے ضروری ابحاث اور اعمال تھے۔

اس کے بانی صحابہ کرام اور صدر اول اسلام کی برجستہ شخصیات اور صف مقدم کے مسلمان تھے جنھوں نے پیغمبرؐ کی وفات کے بعد امت اور پیغمبرؐ کے درمیان فاصلے کی صورت اور دیگر اقوام وملل سے ملنے پر برآمد ہونے والے نتائج کو درک کیا۔پس اعراب قرآن پر

عمل کی بنیاد حضرت علیؑ کی نگرانی میں ہوئی۔ ابوالاسود دویلی اوران کے شاگرد یحیٰی بن یعمر العدوانی (یہ دونوں اس علم کے قائداوراسکے بانی تھے) نے آپؑ کے حکم پراعراب لگائے۔ابوالاسودوہ شخصیّت ہیں جنھوں نے سب سے پہلے قرآن پر نقطہ رکھا۔اس سلسلہ میں ایک قصہ ملتا ہے کہ جواس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ (ابوالاسود) زبان قرآن کے بارے میں غیرت وحمیّت کے حامل تھے۔اُنہوں نے ایک قاری قرآن کواس آیت کریمہ کی تلاوت کرتے ہوئے سنا:''خدامشرکین اوران کے رسول سے بری ہیں''﴿ ان اللّٰہ بریٔ من المشرکین ورسولہ ﴾رسل کے''ل''کوزیر کےساتھ پڑھ رہے تھے اس قرآئت سے وہ پریشان ہوگئے اورکہا: چہرۂ خدابلند ہے،وہ اپنے رسول سے برائت نہیں چاہتااوراس صورت حال کودیکھ کرانہوں نے ارادہ کیا کہ ایسی نشانیاں لگائیں جن سے لوگ قرآن کی قرائت کے بارے خطاسے محفوظ رہیں۔اس کااجتہاد یہاں تک پہنچا کہ انہوں نے حرف کے اوپر کی علامت''فتحہ''کےطور پرایک نقطہ رکھا،حرف کے نیچے علامت''زیر'' رکھااورحرف کے درمیان میں جونقطے ہیں ان پرعلامت''پیش''رکھااورساکن کی علامت کےطور پردونقطوں جیسارکھا۔

(سیراعلام النبلاء،ج۴،ص۸۱تا۸۴،ذھبی)

تدبرقرآن کی دعوت:۔

کتاب عزیزقرآن میں اورسنت صحیح میں معانی قرآن کے بارے میں تحقیق وتدبرکرنے اوراس کےمقاصدواہداف کے بارے میں تفکرکرنے کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے:﴿افلایتدبرون القراٰن ام علٰی قلوبھا اقفالھا ﴾''کیالوگ قرآن میں تدبرنہیں کرتے یا(ان کے) دلوں پرتالے لگ گئے ہیں؟''(محمد/۲۴)اس آیت کریمہ میں قرآن کے بارے میں خاص توجہ،تحقیق وتدبرنہ کرنے والوں کوسخت لہجہ میں ملامت کی ہے۔ایک حدیث میں ابن عباس پیغمبرؐ سےنقل کرتے ہیں:''قرآن پراعراب لگاؤاوراس کےقریب معانی کوتلاش کرو''ابن ابی عبدالرحمٰن سلمی سے مروی ہے کہ وہ کہتے ہیں''ہمیں

قرآن پڑھنے والے اصحاب نے بتایا ہے کہ وہ پیغمبرؐ سے دس آیات لیتے تھے اوردوسری دس آیات اس وقت تک نہیں لیتے تھے جب تک پہلے والی دس آیتوں میں موجودحقائق کودرک نہ کرلیتے اوراس پرعمل پیرانہ ہوتے''۔عثمان اورابن مسعوداوراُبی سے نقل ہے پیغمبرؐ انہیں دس آیات پڑھاتے تھے اوردوسری دس آیات میں اس وقت تک داخل نہیں ہوتے تھے جب تک پہلے والی دس آیات پرعمل نہ کرتے اورانہیں قرآن میں علم وعمل کوساتھ سکھاتے تھے۔

حضرت علی ابن ابی طالبؑ سے نقل ہے آپؑ نے جابربن عبداللہ کےعلم کا ذکر کیا توایک آدمی نے کہا کہ آپؑ جابر کےعلم کی صفت بیان کرتے ہیں جبکہ آپؑ ہیں۔حضرت نے فرمایا:وہ اس آیت کی تفسیر کوجانتے تھے:﴿ان الذی فرض القراٰن لرآدک الٰی معادٍقل ربیٓ اعلم من جآء بالھدٰی ومن ھوفی ضلٰلٍ مبینٍ﴾''جس نے آپ پریہ قرآن فرض کیا ہے وہ یقیناً آپ کوبازگزشت تک پہنچانے والا ہے کہہ دیجئے:میرارب اسے خوب جانتا ہے جوہدایت لے کرآیا ہے اوراسے بھی جوواضح گمراہی میں ہے'' (قصص/۸۵)

قرآن میں تدبرکرنے کی فضیلت اورمسلمانوں کواس کی طرف رغبت دلانے کے بارے میں جواحادیث واردہوئی ہے وہ بہت زیادہ ہیں۔ہمارے شیخ بزرگ مجلسیؒ نے کتاب بحارالانوارمیں ان احادیث کی ایک سلسلہ روایات نقل کی ہیں۔یہ طبیعی وعادی عمل ہے جسے اسلام نے اٹھایا ہے کہ مسلمان اپنی تمام توانائی اوروسائل کوبروئے کارلائیں اورلوگوں کودرس قرآن کی طرف رغبت دلائیں کیونکہ قرآن ہی وہ دائمی وباقی دلیل نبوت ہے اورامت اسلامی کی زندگی سے متعلق مختلف شعبوں میں یہی آسمانی آئین ودستورہے اوریہی انسان وبشریت کے لئے وہ کتاب ہدایت ہے جوعالم بشریت کوظلمت سے نورکی طرف نکالنے کے لئے آیا ہے اوراس کتاب نے ایک امت تشکیل دی،اسے عقیدہ،قوت وتوانائی دی ہے اوراس کے اندرمکارم اخلاق پیدا کی ہے اوراس کیلئے بڑے تمدن وترقی

کا بنیاد رکھا جس کا آج کا انسان بھی اعتراف کرتا ہے۔

قرآن وحی کے ذریعے نازل ہوا:۔

پیغمبر اکرمؐ نے قرآن کریم کو بتوسط وحی لیا۔ چونکہ آپؐ وحیٔ الٰہی بلند جہد یعنی خدا سے لیتے تھے اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ قرآن آپؐ پر نازل ہوا ہے۔ اور یہ لفظ نزول اس کی طرف اشارہ کے لئے استعمال ہوا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ وحی کے ذریعے جس جہت سے متصل ہوئے وہاں سے قرآن کو حاصل کیا وہ بلند مرتبہ والا ہے۔ وحی لغت میں مخفی طور پر آگاہی دینے کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ خاص طور پر وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں رسولؐ کا خدا سے وصل ہوا ہو اور یہ نام اس وجہ سے رکھا گیا ہے کہ یہ وصل انتہائی مخفی اور دقیق ہوتا ہے۔ کسی دوسرے کو اس کا حس بھی نہیں ہوتا۔ وحی ایسا ذریعہ نہیں تھا جس سے صرف خاتم الانبیاء نے کلام الٰہی کو لیا بلکہ یہ ایک عمومی طریقہ تھا جس سے تمام انبیاء پیغام الٰہی لیتے تھے۔ دیگر انبیاء بھی آسمانی کتب کو اسی وحی کے ذریعے تلقی کرتے تھے۔ چناچہ خدا نے اپنے حبیب کو اس کے بارے میں اس آیت سے آگاہ کیا: ﴿**انا اوحینآ الیک کما اوحینا الٰی نوحٍ وّالنبیین من بعدہٖ واوحینا الٰی ابراھیم واسماعیل واسحاق ویعقوب والاسباط وعیسیٰ وایّوب ویونس وھارون وسلیمان واٰتینا داؤد زبورًا**﴾ ''ہم نے آپ کی طرف اسی طرح وحی نازل کی ہے جس طرح نوح اور ان کے بعد کے انبیاء کی طرف وحی کی تھی اور ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، اسباط، عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان کی طرف وحی کی ہے اور داؤد کو زبور عطا کی ہے'' (نساء/۱۶۳)

وحی کی مختلف صورتیں:۔

قرآن کریم سے واضح ہے کہ وحی غیب سے وصل ہے جو مخفی طور پر خدا اور اس کے انبیاء کے درمیان انجام پاتی ہے اور اس کی تین صورتیں ہیں:

۱۔ پیغمبر کے دل میں القاء کرنا یا اس کے نفس میں پھونکنا جس سے پیغمبر احساس

کرے کہ وہ خدا سے کچھ لے رہا ہے۔

۲۔ پس پردہ تکلم کرنا جس طرح خدا نے حضرت موسیٰ سے درخت کے پیچھے سے ندا کی اور حضرت موسیٰ نے ندا کو سنا۔ (درخت کے پیچھے سے مراد یہ ہے کہ کلام کو انھوں نے درخت اور اس کے آس پاس سے سنا)۔

۳۔ تیسرا وہی طریقہ ہے کہ جب یہ لفظ استعمال کریں گے تو اس کے معنٰی کی طرف دیندار شخص کا ذہن جاتا ہے کہ ملائکہ خدا کی طرف سے وحی مرسل کو لے کر انبیاء میں سے کسی نبی کی طرف آئے تا کہ جس چیز کو پہنچانے پر مامور ہوا ہے اسے پہنچا دیں چاہے وہ کسی انسان کی شکل میں آئیں یا ملک کی شکل میں۔ چنانچہ ان تمام وحی کی صورتوں کے بارے میں سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر ۵۱ میں آیا ہے: ﴿**وما کان لبشرٍ ان یکلمہ اللہ الا وحیًا او من ورآی حجاب او یرسل رسولاً فیوحی باذنہٖ مایشآء انہ علی حکیم**﴾ ''اور کسی انسان کیلئے یہ بات نہیں ہے کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر یہ کہ وحی کردے یا پس پردہ سے بات کرلے یا کوئی نمائندہ یا فرشتہ بھیج دے اور پھر اس کی اجازت سے جو وہ چاہتا ہے وہ پیغام پہنچا دے کہ وہ یقیناً بلند و بالا اور صاحبِ حکمت ہے''۔

روایات میں ہے کہ وحی جو خاتم الانبیاء نے لی ہے اور آیات قرآن کریم جو لی گئیں ہے وہ بسا اوقات ملائکہ کے ذریعہ سے لی ہیں اور بعض اوقات خدا کی طرف سے اپنے بندہ و رسول سے بلا واسطہ خطاب ہوا ہے۔ وحی کی آخری صورت جس میں پیغمبر سے خدا نے بلا واسطہ خطاب کیا وہ پیغمبر پر بہت اثر انداز ہوئی۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ امام جعفر صادقؑ سے پوچھا: پیغمبر پر جو غشی طاری ہوتی تھی کیا وہ جبرئیل کی آمد سے ہوتی تھی تو امامؑ نے فرمایا: نہیں بلکہ یہ حالت اس وقت ہوتی تھی کہ جب خداوند عالم بلا واسطہ آپؐ پر وحی فرماتے تھے۔

پیغمبر اکرمؐ پر دو دفعہ نزول قرآن ہوا:۔

بعض علماء کی نظر میں ہے کہ قرآن کریم پیغمبر اکرمؐ پر دو دفعہ نازل ہوا۔ایک دفعہ بطور اجمال پیغمبرؐ پر نازل ہوا اور دوسری دفعہ تدریجی اور تفصیلی صورت میں بعثت سے لے کر وفات تک نازل ہوا۔اجمالی طور پر نازل ہونے کا معنٰی ومفہوم یہ ہے کہ معارف الٰہی اور اسرار ورموز جو قرآن میں ہیں وہ پیغمبرؐ کے دل پر نازل ہوئے تا کہ روح پیغمبرؐ معرفت قرآن سے منور ہو۔تفصیل سے نازل ہونے کا مقصد مخصوص اور محدود الفاظ کی صورت میں اور آیات کے یکے بعد دیگر نازل ہونا ہے۔نزول اجمالی ایک دفعہ واقع ہوا کیونکہ اس کا ہدف ومقصد پیغمبرؐ کے دل کو منور کرنا اور جو رسالت آپؐ نے اٹھایا ہے اس کے بارے آپؐ کو آگاہ کرنا تھا جبکہ تفصیل سے نازل ہونے کا مقصد امت کو تربیت دینا،ان کو منور کرنا اور نئی رسالت کے تحمل کا عادی بنانا تھا اور یہ تدریجی صورت کے محتاج تھے۔قرآن کے ان مختلف ومتعدد اقسام نزول سے ہم ان آیات کے دلائل کو سمجھ سکتے ہیں جن میں یہ قرآن کریم رمضان مبارک کے مہینے میں نازل کرنے کا ذکر ہے یا خاص لیلۃ القدر میں نازل ہونے کا ذکر ہے: ﴿انآ انزلنٰہ فی لیلۃ القدر﴾ ''بیشک ہم نے اسے شب قدر مین نازل کیا'' (قدر/۱) ﴿انآ انزلنٰہ فی لیلۃٍ مبٰرکۃٍ﴾ ''ہم نے اس قرآن کو ایک مبارک رات میں نازل کیا'' (دخان/۲) ان آیات میں کلمۂ انزال استعمال ہوا ہے کلمہ تنزیل استعمال نہیں ہوا کیونکہ تدریجاً بیس (۲۰) سال میں ہوا ہے جبکہ انزال بطور اجمال صرف ایک دفعہ نازل ہو۔یہ فکر کہ قرآن کا نزول چند دفعہ ہوا ہے جس کی شرح ہم نے کی ہیں وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ دو مرحلے میں ہوا ہے جن کا قرآن کریم نے اشارہ کیا ہے:

﴿کتا ب احکمت آیاتہ ثم فصلت من لدن حکیم خبیر﴾ ''یہ وہ کتاب ہے جس کی آیتیں محکم بنائی گئی ہیں اور ایک صاحب علم حکمت کی طرف سے تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہے'' (ھود/۱)۔یہ آیت بتاتی ہے کہ قرآن کا دو مرحلہ ہے۔

پہلا مرحلہ آیات قرآن کی محکم صورت اور دوسرا تفصیلی۔یہ محکم اور تفصیل کی

صورت اس فکر سے مطابقت رکھتا ہے جو قرآن کے نزول میں تعدد کے قائل ہیں۔ایک انزال ایک ہی دفعہ بطور اجمال ہوا وہ قرآن کی محکم صورت ہے اور وہ انزال جو تفصیلی وتدریجی صورت میں ہیں وہ دوسرے مرحلہ میں ہیں۔

تنزیل میں تدریج:۔

قرآن کے تدریجی نزول کا سلسلہ ۲۳ سال تک رہا اور یہ ۲۳ سال وہی زمانے ہے جب پیغمبرؐ بعثت سے وفات تک امت کے درمیان رہے۔پیغمبرؐ ۴۰ سال کی عمر میں مبعوث ہوئے۔مکہ میں ۱۳ سال رہے۔اس دوران آپؐ پر وحی نازل ہوتی رہی پھر مدینہ کی طرف ہجرت کی اور یہاں پر دس سال گزارے۔ان ۱۰ سالوں میں بھی قرآن ایک آیت کے بعد دوسری آیت تسلسل سے نازل ہوتا رہا یہاں تک کہ آپؐ وفات پاگئے جب آپؐ کی عمر شریف ۶۳ سال تھی۔قرآن دیگر آسمانی کتب سے جو آپؐ سے پہلے نازل ہوئی ہیں نزول تدریجی میں امتیاز رکھتا ہے۔اس نزول تدریجی نے اہدافِ دعوت کے حصول میں کامیابی اور امت کی تعمیر میں بڑا اثر چھوڑا ہے۔اس طرح ایک اور امتیاز اس کو یہ ہے کہ آیات قرآنی اپنی جگہ معجزہ ہیں اس کی وضاحت ذیل کی نکات میں پیش کرتے ہیں:

۱۔ پیغمبرؐ اور ان کی دعوت پر ان ۲۳ سالوں میں مختلف حالات گزرے۔
یقیناً پیغمبرؐ جن مصائب وآزمائش اور شدت سے گزرے ہیں اس میں ساتھ ہی کامیابی اور پیش رفت بھی حاصل کی ہیں یہ وہی حالات ہیں کہ جن میں عادی انسان بھی متأثر ہوتا ہے اور یہ اس کی روح اور اقوال وافعال پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں اور ان اسباب وعوامل اور حالات سے بھی متأثر ہوتے ہیں۔لیکن آیات قرآن کریم جوان سالوں میں نازل ہوتے رہے جن میں پیغمبرؐ کبھی ضعیف،کبھی قوی،کبھی راحت،کبھی شکست،کبھی کامیابی سے تدریجی طور پر گزرتے تھے اور انہی کیفیات میں تنزیل تدریجاً ہوتی رہی۔پیغمبرؐ ہمیشہ اپنے اس عظیم ہدف کی طرف ثابت قدم رہے انکو بشری حالات میں سے کسی نے بھی متاثر نہیں کیا۔یہ قرآنی معجزے کے مظاہر میں سے ہیں جو اپنی جگہ واضح وروشن دلیل ہیں کہ یہ

قرآن خدائے علیٍ حکیم کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ اگر قرآن متعدد ومختلف حالات میں تدریجاً نازل نہ ہوتا تو قرآن یہ نتیجہ حاصل نہیں کرسکتا تھا۔

۲۔ قرآن اپنی تدریجی نزول سے پیغمبرؐ کے لئے ایک دائمی معنوی امداد تھا جیسا کہ سورۂ فرقان میں ہے:

﴿وقال الذین کفروا لولا نزل علیہ القراٰن جملۃً واحدۃً کذٰلک لنثبت بہٖ فؤادک ورتلنٰہ ترتیلا﴾ ''اور یہ کافر یہ بھی کہتے ہیں کہ آخران پر یہ قرآن ایک دفعہ کل کا کل کیوں نہیں نازل ہوگیا ہم اسی طرح تدریجاً نازل کرتے ہیں تا کہ تمہارے دل کو مطمئن کرسکیں اور ہم نے اسے ٹھہر ٹھہر کر نازل کیا ہے'' (فرقان/۳۲)

پیغمبرؐ پر ہر حادثے میں تازہ وحی آتی تھی جو پیغمبرؐ کے دل کی تسکین اور اپنے مقصد رسالت میں اعانت کا سبب بنے۔ وحی لانے کی خاطر ہر بار آپؐ پر ملائکہ نازل ہوتے تھے اور تجدید عہد کر لیتے اس سے آپؐ کی کامیابی کی امید کو تقویت ملتی اور پیش آمد مشکلات ومسائل کو حقیر وآسان سمجھتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پیغمبرؐ پر نازل ہوتے وقت پیغمبرؐ کو کبھی تسلی دیتا ہے اور جب سختی کے وقت نازل ہوتا تو سختی کو آسان بنا دیتا ہے۔ کبھی آزمائش میں مبتلا ہونے کی صورت میں صبر کی تلقین دیتا ہے:

﴿واصبر علٰی مایقولون واھجرھم ھجرًا جمیلاً﴾ ''اور جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں اس پر صبر کیجئے اور شائستہ انداز میں ان سے دوری اختیار کیجئے'' (مزمل/۱۰)

اور کبھی محزون ہونے سے واضح انداز میں منع کرتا ہے:

﴿ولایحزنک قولھم ان العزۃ للہ جمیعاً﴾ ''پیغمبر! آپ لوگوں کی باتوں سے رنجیدہ نہ ہوں عزت سب کی سب صرف اللہ کیلئے ہے'' (یونس/۶۵)

کبھی ان کو اپنے سے پہلے گزشتہ انبیاءِ اولوالعزم کے سیرت کو یاد دلاتے ہیں:

﴿فاصبر کماصبر واولوا العزم من الرسل﴾ ''پیغمبر آپ اسی طرح صبر کریں جس طرح پہلے کے صاحبان عزم رسولوں نے صبر کیا ہے'' (احقاف/۳۵)

کبھی پیغمبر کی ذہنی وفکری بوجھ میں تخفیف ڈالتے ہوئے پیغمبر کو بتاتے ہیں کہ کافرین آپ کی شخصیت کشی نہیں کرسکتے اور نہ آپؐ کی ذات پاک کو جھوٹی نسبت دیتے ہیں بلکہ وہ درحقیقت سوچے سمجھے حق سے انکار کرتے ہیں اور یہ ہمیشہ سے منکرین کا وطیرہ رہا ہے:

﴿قد نعلم انہ لیحزنک الذی یقولون فانھم لایکذبونک ولکن الظٰلمین باٰیٰت اللہ یجحدون﴾ ''ہمیں علم ہے کہ ان کی باتیں یقیناً آپ کیلئے رنج کا باعث ہیں پس یہ صرف آپ کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ یہ ظالم لوگ درحقیقت اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں'' (انعام/۳۳)

۳۔ قرآن کریم دیگران کتابوں کی مانند نہیں جو تعلیم اور بحث علمی کے لئے تالیف ہوتی ہیں بلکہ یہ کتاب انسان کے اندر موجود عقل، روح اور ارادہ میں کامل تغیر لانے کی کتاب ہے۔ یہ ایک قوم اور تمدن کو بنانے کی کتاب ہے اور یہ عمل ایک مرحلہ میں انجام نہیں پاتا۔ یہ عمل طبیعی طور پر تدریج طلب ہے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ قرآن کریم بطور تدریجی نازل ہو اس کی تعمیر میں استحکام آئے اور ایک بنیاد پر دوسری بنیاد قائم کرسکے اور جہالت کی جڑوں اور پس ماندہ آثار کو آہستہ اور حکمت سے ختم کرسکے۔

اسی ظرف اور حکمت کی بنیاد پر تغییر وتبدیل کے بارے میں ہمیں ملتا ہے کہ اسلام نے بہت گہرے مسائل کا علاج تدریج سے کیا تا کہ اس کی جڑیں فرد اور اجتماع کے نفوس میں نفوذ کرسکیں یہاں تک کہ بعض مسائل کے مقابلے میں مرحلہ وار مقابلہ کیا اور پھر ان کی جڑوں کا خاتمہ کیا اور اکھاڑ سکے۔ قصۂ تحریم خمر میں قرآن کا تدریجی رویہ اس کی واضح مثال ہے۔ اور اگر قرآن ایک ہی مرتبہ تمام احکام اور اپنی عطاؤں اور عنایتوں کے ساتھ نازل کیا جاتا تو لوگ اس سے دور بھاگ جاتے اور تاریخ میں یہ بڑا انقلاب جو کامیابی سے ہمکنار ہوا وہ وقوع پذیر نہ ہوتا۔

اسباب نزول قرآن

معانی سبب نزول قرآن:

قرآن کریم لوگوں کو ہدایت کرنے، ان کے افکار کو منور کرنے اور روح و عقل کی تربیت کرنے کیلئے نازل ہوا ہے اور ساتھ میں اسلام کی طرف دعوت کو مختلف مرحلوں میں لاحق مشکلات کے صحیح حل کا تعیّن بھی کرنا ہے اور مومن اور غیر مومن کے طرف سے پیش ہونے والے بہت سے سوالات جو جواب کے دینے کے متقاضی اور لائق ہوتے تھے ان کا جواب بھی دیتا ہے اور بعض واقعات و حوادث جو لوگوں کی زندگی میں پیش آتے تھے ان کے بارے میں رسالت الٰہی کا موقف بیان فرماتا تھا اور اسی بنیاد پر آیات قرآنی دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہیں:

پہلی قسم: وہ آیات ہیں جو لوگوں کی ہدایت و تربیت، تنویر فکر و عقل کیلئے نازل ہوئی ہیں لیکن ان کے نازل ہونے کا کوئی سبب پیش نہیں آیا ہے وہ آیات جو قیامت کے برپا ہونے کا تصور یا قیامت کے مناظر، ثواب و عذاب کے بارے میں نازل ہوئی ہیں ۔خدا نے ان آیات کو لوگوں کی ہدایت کیلئے نازل کیا ہے نہ کہ کسی کے سوال کے جواب میں یا درپیش مشکل کے حل یا دور حاضر کے کسی رونما ہونے والے واقعہ پر تبصرہ کیلئے۔

دوسری قسم: وہ آیات ہیں جو کسی ہیجان انگیز سبب کی وجہ سے نازل ہوئیں ہیں یعنی وہ واقعہ عصر وحی میں واقع ہوا اور اس بارے میں قرآن میں کوئی آیت نازل ہونے کے تقاضے بھی تھے جیسے پیغمبرؐ اور ان کی دعوت کیلئے درپیش مشکلات کے حل یا کسی سوال کے جواب کا متقاضی ہونے پر یا کوئی واقعہ رونما ہوا ہو جس کے بارے میں رسالت وحی کا موقف بیان ہونا ضروری ہو ان واقعات و حالات جو نزول قرآن کے متصدی ہیں اسبابِ نزول کہتے ہیں۔ پس اسباب نزول یہ ہیں: وہ امور جو عصر وحی میں واقع ہوئے اور ان کا یہ

اقتضاء تھا کہ ان کے بارے میں آیت نازل ہو۔ ان اسباب نزول قرآن کی مثالوں میں سے ایک مثال منافقین کا فتنہ برپا کرنے کی خاطر مسجد ضرار کی تعمیر ہے۔ منافقین کی طرف سے یہ کوشش پیغمبرؐ کی دعوت کیلئے ایک مشکل کی صورت میں پیش آئی کہ جس کا حل نزول آیت کا سبب بنا:

﴿والّذین اتّخذوا مسجدًا ضرارًا وّکفرًا وّتفریقًا بین المؤمنین و ارصادًا لّمن حارب اللّٰہ ورسولہ من قبل ولیحلفنّ ان اردنا اِلّا الحسنٰی واللّٰہ یشھد انّھم لکاذبون﴾ ''اور کچھ لوگ ایسے ہیں جنھوں نے ایک مسجد بنائی ضرر رسانی اور کفر اور مومنین کے مابین پھوٹ ڈالنے کے لئے نیز ان لوگوں کی کمین گاہ کے طور پر جو پہلے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ لڑ چکے ہیں اور وہ ضرور قسمیں کھائیں گے کہ ہمارے ارادے فقط نیک تھے لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں'' (توبہ/۱۰۷)

اسی طرح بعض اہل کتاب نے پیغمبرؐ سے کچھ سولات کئے ان میں ایک سوال روح سے متعلق تھا۔ حکمت الٰہی نے چاہا کہ ان کے سوال کا جواب قرآن میں دیا ہے لہٰذا یہ آیت نازل فرمائی:

﴿ویسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی ومآ اوتیتم من العلم الا قلیلاً﴾ ''اور لوگ آپ سے روح کے بارے پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجئے: روح میرے رب کے امر سے متعلق (ایک راز) ہے اور تمھیں تو بہت کم علم دیا گیا ہے'' (اسراء/۸۵)

چنانچہ اس طرح یہ سوال اس آیت کے نزول کا سبب بنا۔ اسی طرح بعض علماءِ یہود کی طرف سے جو موقف سامنے آیا کہ جب ان سے مکہ کے مشرکین نے پوچھا کہ کون زیادہ ہدایت پر ہے محمدؐ اور ان کے اصحاب یا ہم؟۔ ان کے عاطفہ نے تملق گوئی کو ترجیح دی انھوں نے کہا: تم محمدؐ اور ان کے اصحاب سے زیادہ ہدایت پر ہو جبکہ وہ لوگ جانتے تھے کہ اور ان کی کتاب میں نبی کی وہ صفات مذکور تھیں جو پیغمبرؐ پر منطبق ہوتیں تھیں اور ان سے عہد و پیمان لیا گیا تھا کہ ان صفات کو نہیں چھپائیں گے۔ ان کا یہ واقعہ جیسے بعض روایات

میں آیا ہے سورۂ نساء کی آیت نمبر ۵۱ کے نزول کا سبب بنا:

﴿الم تر الی الذین اوتوا نصیبًا من الکتٰب یؤمنون بالجبت و الطاغوت ویقولون للذین کفروا ھٰؤلآء اھدٰی من الذین اٰمنوا سبیلاً﴾ ''کیا آپ نے ان لوگوں کا حال نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا ہے؟ جو غیر اللہ معبود اور طاغوت پر ایمان رکھتے ہیں اور کافروں کے بارے میں کہتے ہیں: یہ لوگ تو اہل ایمان سے بھی زیادہ راہ راست پر ہیں''۔ یہ واقعات وہ تھے جو زمانۂ نزول وحی میں پیش آئے اور یہ واقعات اپنی جگہ نزول وحی کے متقاضی تھے۔ اس حوالے سے ان آیات کے اسباب نزول قرار پائے۔

اسباب نزول کی جو تعریف پیش کی ہے اس کی روشنی میں گزشتہ اقوام کے ساتھ پیش آنے والے حوادث جنہیں قرآن نے بیان کیا ہے وہ واقعات ان آیات کے نزول کے اسباب نہیں ہیں کیونکہ یہ وہ تاریخی واقعات ہیں جو وحی کے زمانہ سے پہلے گزرے اور یہ ایسے واقعات نہیں ہیں جو عصر وحی میں واقع ہوئے ہوں اور نزول قرآن کے متقاضی ہوئے ہوں۔ لہٰذا اس حوالے سے یہ ممکن نہیں کہ حضرت یوسفؑ کی حیات اور ان کے بھائیوں کی ان کے خلاف سازشیں اور یوسفؑ کی ان سے نجات، سورہ یوسف کے نزول کا سبب ہو۔ اسی طرح قرآن کے دیگر حصے جو گذشتہ انبیاء اور قوموں کے بارے میں نازل ہوئے ہیں غالبًا پہلی قسم میں سے ہیں کہ جو ابتدائی طور پر نازل ہوئے ہیں اور کوئی خاص معین اسباب سے مرتبط نہیں ہیں۔

اسباب نزول کی شناسائی کا فائدہ:۔

اسباب نزول کو سمجھنا آیت کے فہم میں بہت اہم کردار رکھتا ہے اور اس سے آیت کے بہت سے کلمات کے اسرار کا پتہ چلتا ہے۔ کیونکہ قرآن کی آیت ایک خاص سبب نزول سے مربوط ہے جس کے صیغے اور انداز بیان اس سبب سے مطابقت رکھتے ہیں۔ جب تک آپ آیت کے سبب نزول کو نہ جانیں اور اس کے حدود کا تعین نہ ہو جائے اس آیت کی تعبیر اور انداز بیان مخفی اور پوشیدہ رہیں گے جس کی مثال قرآن کریم کی یہ آیت ہے:

﴿ان الصفا والمروة من شعآئر الله فمن حج البیت او اعتمر فلا جناح علیه ان یطوف بهما ومن تطوع خیرًا فان الله شاکر علیم﴾ ''صفا اور مروہ یقینًا اللہ کے شعائر میں سے ہیں پس جو بیت اللہ کا حج یا عمرہ کرے اس کے لئے ان دونوں کا چکر لگانے میں کوئی حرج نہیں اور جو اپنی خوشی سے کوئی نیکی کرتا ہے تو یقینًا اللہ اس کی قدر کرنے والا، خوب جاننے والا ہے'' (بقرہ/۱۵۸)

اس آیتِ کریمہ میں صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے کے حرام نہ ہونے اور گناہ نہ ہونے کے بیان پر اکتفا کیا ہے اور اس کے واجب ہونے کو بطور صریح بیان نہیں کیا ہے یہاں کیوں حرمت کے نفی پر اکتفا کیا ہے اور سعی کے واجب ہونے کا اعلان کیوں نہیں کیا ہے؟

اس سوال کا جواب ممکن ہے کہ اس آیت کی شان نزول کے جاننے سے معلوم ہو جائے کہ بعض اصحاب سعیٔ صفا و مروہ کو گناہ گردانتے تھے کیونکہ دور جاہلیت میں بھی یہ انجام پاتے تھے اسے جاہلیت کا ورثہ سمجھتے تھے لہٰذا ان کے تصور کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ پس واضح ہوا کہ آیت اصحاب کے ذہن میں موجود فکر کو نفی کرنے اور صفا اور مروہ کو شعائر اللہ قرار دینے کیلئے نازل ہوئی ہے۔

یہاں اس آیت کی شان نزول سے ناآگاہی نے بعض لوگوں کے پاس اس آیت کریمہ کے فہم میں ایک غلط تصور قائم کیا ہے۔ انہوں نے یہ سمجھا ہے کہ یہ آیت وجوب کے اعلان کی جگہ پر نفی حرج میں ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سعی واجب نہیں ہے بلکہ یہ ایک مباح عمل ہے اور اگر واجب ہوتا تو سزاوار یہ ہوتا کہ آیت میں صرف نفی حرج کی جگہ پر اس میں اعلان وجوب ہوتا۔ اگر یہ بعض لوگ اس آیت کی شان نزول کا علم رکھتے کہ جس مقصد کیلئے یہ آیت نازل ہوئی ہے تو وہ جانتے کہ آیت اصحاب کے ذہن سے فکر گناہ کو رفع کرنے کیلئے اتری ہے۔ یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن نے ''حرج نہیں'' کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے اور نفی حرج پر کیوں اکتفا کیا ہے۔

ایک منزل کے لئے تعدد اسباب یا اس کے برعکس:

کبھی زمان نزول میں چند چیزیں وقوع پذیر ہوئی ہیں اور سب کا ایک ہی مطلب کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور اس سلسلہ میں نزول قرآن کے خواہاں ہیں جیسا کہ پیغمبرؐ سے ایک مشکل کے بارے میں بطور تکرار سوال ہو اور ہر سوال اس چیز کی مقتضی ہو کہ اس کے جواب میں وحی نازل ہوں اس حالت میں کہہ سکتے ہیں کہ اسباب نزول متعدد ہیں اور مُنزل (یعنی جو نازل ہوا) ایک۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی روایت سے ملتی ہے جہاں پیغمبرؐ سے اصحاب کی طرف سے سوال ہوا کہ ان کی بیوی کے ساتھ کسی مرد کو بیٹھے ہوئے پایا تو اس سلسلہ میں کیا کرنا چاہئے۔ چنانچہ عاصم بن عدی نے ایک دفعہ پوچھا۔ دوسری دفعہ عویمر نے پوچھا تیسری دفعہ بلال بن امیہ نے اپنی عورت کو شریک بن سمحا کے ساتھ گناہ کرتے ہوئے پانے کی تہمت لگائی۔ یہ متعدد اسباب نزول وحی کے مقتضی تھے تا کہ ہر اس شوہر کے موقف کی وضاحت ہو جائے جو اپنی بیوی کی خیانت کاری سے مطلع ہوتے ہیں اور کیا اس کے لئے یہ جائز ہے کہ بغیر گواہ کے اپنی عورت سے زنا کو نسبت دے اور اسے متہم کرے یا بغیر گواہ کے نسبت زنا و تہمت لگانا جائز نہیں ہے اور اگر بغیر گواہ تہمت لگا دی تو خود اس پر قذف کا حد جاری ہوگا۔ اس طرح شوہر کے علاوہ کسی اور نے کسی عورت سے زنا کو نسبت دی تو بھی یہی حکم ہے۔ ان سب حالات و واقعات کے پیش نظر سورۂ نور کی آیت نمبر۶ نازل ہوئی:

﴿والذین یرمون ازواجھم ولم یکن لّھم شھدآء الاانفسھم فشھادۃ احد ھم اربع شھاداتٍ باللّٰہ انہ لمن الصّادقین﴾ ''اور جو لوگ اپنی بیویوں پر زنا کی تہمت لگائیں اور ان کے پاس خود ان کے سوا کوئی گواہ نہ ہو تو ان میں سے ایک شخص کی شہادت یہ ہے کہ چار مرتبہ اللہ کی قسم کھا کر گواہی دے کہ وہ سچا ہے''۔ یہاں اسباب متعدد اور جو نازل ہوا وہ ایک ہے۔

تعدد سبب تعدد منزل:۔

کبھی سبب متعدد ہوتے ہیں لیکن ایک سبب وجود میں آنے کے ایک عرصہ گزرنے کے بعد دوسرا سبب وجود میں آتا ہے۔ پہلے سبب کے تحت ایک آیت کا نزول ہوا اور جب دوسرا سبب وجود میں آیا تو یہی آیت دوبارہ نازل ہوئی۔ اس کو سبب متعدد اور نزول متعدد بھی کہتے ہیں۔ اگرچہ دونوں مرتبہ جو آیت نازل ہوئی وہ ایک ہی ہے۔

اس کی مثال سورۂ مبارکہ اخلاص کا نزول ہے کہ یہ سورہ دو دفعہ نازل ہوئی ہے۔ ایک دفعہ مکہ میں مشرکین کے جواب میں نازل ہوئی اور دوسری دفعہ پیغمبر اکرمؐ مدنیہ تشریف لے گئے تو اہل کتاب کے سوال کے جواب میں نازل ہوئی۔

منزل ایک سبب متعدد اور آیت متعدد ہیں:

جس طرح سبب واحد اور منزل واحد ہوتا ہے اسی طرح کبھی بہت ساری آیات کے لئے ایک سبب ہوتا ہے۔ روایت میں آیا ہے کہ جناب ام سلمٰی نے پیغمبرؐ سے سوال کیا یا رسول اللہ ہجرت کے بعد عورتوں کے بارے میں کوئی آیت نہیں آئی ہے اس سوال کے جواب میں سورۂ آل عمران کی آیت نمبر۱۹۵، اور سورۂ احزاب کی آیت نمبر۳۵ نازل ہوئی:

﴿فاستجاب لھم ربھم انی لااضیع عمل عاملٍ منکم من ذکر او انثٰی بعضکم من بعضٍ فالذین ھاجروا واخرجوا من دیارھم واوذوا فی سبیلی وقٰتلوا وقتلوا لاکفرن عنھم سیاٰتھم ولادخلنھم جنٰتٍ تجری من تحتھا الانھٰر ثوابًا من عنداللہ واللہ عندہ حسن الثواب﴾ ''پس خدا نے ان کی دعا کو قبول کیا کہ تم میں سے کسی بھی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا چاہے وہ مرد ہو یا عورت تم میں بعض بعض سے ہیں پس جن لوگوں نے ہجرت کی اور اپنے وطن سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور انہوں نے جہاد کیا اور قتل ہو گئے تو میں ان کی برائیوں کی پردہ پوشی کروں گا اور انھیں ان جنتوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی یہ خدا کی طرف سے ثواب ہے اور اس کے پاس بہترین ثواب ہے''

﴿ان المسلمين والمسلمٰت والمؤمنين والمؤمنٰت والقٰنتين والقٰنتٰت والصّٰدقين والصّٰدقٰت والصّٰبرين والصّٰبرٰت والخٰشعين والخٰشعٰت والمتصدقين والمتصدقٰت والصآئمين والصّٰئمٰت والحٰفظين فروجهم والحٰفظٰت والذّٰكرين الله كثيراً والذّٰكرٰت اعدالله لهم مغفرةً واجراً عظيمًا﴾ ''یقیناً مسلم مرد اور مسلم عورتیں' مومن مرد اور مومنہ عورتیں' اطاعت گزار مرد اور اطاعت گزار عورتیں' راستگو مرد اور راستگو عورتیں' صابر مرد اور صابرہ عورتیں' فروتنی کرنے والے مرد اور فروتن عورتیں' صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں' روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں' اپنی عفت کے محافظ مرد اور عفت کی محافظہ عورتیں نیز اللہ کا بکثرت ذکر کرنے والے مرد اور ذکر کرنے والی عورتیں وہ ہیں جن کے لئے اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم مہیا کر رکھا ہے'' (احزاب/ ۳۶)

یہ دونوں آیات الگ الگ لیکن ایک ہی سبب کے تحت نازل ہوئی ہیں۔ ایک کو سورۂ آل عمران میں اور دوسری کو سورۂ احزاب میں رکھا ہے لیکن سبب نزول ایک ہے وہ ام سلمٰی کا پیغمبرؐ سے گفتگو کرنا ہے منزل متعدد ہیں۔ اسی بنیاد پر اگر دو روایتیں ہوں جو اسباب نزول کے بارے میں ہوں اور ان دونوں میں سے ہر ایک آیت کے لئے ایک سبب نزول ذکر کریں جو دوسری روایت نے اسی آیت کے جو سبب نزول ذکر کیا ہے اس سے مختلف ہو یہاں پر ہمیں ان دونوں روایتوں کے درمیان تعارض ہونے کا حکم نہیں کرنا چاہیئے یا اسی طرح دو مختلف روایات ایک سبب کے بارے میں ہوں اور دونوں روایات ایک آیت کے نازل ہونے کا سبب بیان کر رہی ہوں اور اس روایت نے جو سبب بتایا ہو وہ اس سبب سے مختلف ہو جو دوسری روایت نے بتایا ہے یہاں بھی ہم تعارض کا حکم نہیں کر سکتے کیونکہ ممکن ہے کہ روایات میں اختلاف سبب سمجھ آئے اور دونوں میں اتفاق قائم ہو جائے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک آیت کے نازل ہونے کے لئے سبب متعدد ہو یا ایک سبب کے لئے چند آیات نازل ہوئی ہوں اس بنیاد پر ان دو روایتوں میں تعارض نہیں ہوگا۔

نتیجہ گیری یا معیار عموم لفظ کو حاصل ہے نہ مخصوص مورد سبب نزول کو:۔

اگر ایک آیت کسی خاص سبب کے تحت نازل ہوئی ہو اور اس میں لفظ عام ہو تو معیار لفظ کو حاصل ہے نہ مخصوص سبب کو۔ لہٰذا مدلول قرآنی اس خاص سبب نزول اور وہ واقعہ جس کے متعلق یہ نازل ہوئی ہے اسی میں مقید ہو کر نہیں رہتا لفظ کا عموم اپنی جگہ باقی رہیگا کیونکہ سبب نزول اشارہ کیلئے ہے نہ کہ اسکا تخصص کرنے کے لئے۔ قرآن کی یہی عادت رہی ہے کہ اس کے احکام اور تعلیمات ارشادات کسی واقعہ یا حادثہ جو لوگوں کی زندگی میں پیش آیا ہے اس مناسبت سے نازل ہوئے ہیں لیکن یہ ایک حکم اور تعلیم خدا کی طرف سے ہے تاکہ بیان قرآنی کو بہتر طریقہ سے پہنچانے کا ذریعہ بنے اور مسلمانوں کی نظر میں زیادہ اہمیت کا حامل ہو اس کا مفہوم عام ہے اور تمام مصادیق شامل ہوتے ہیں مثلاً آیت 'اللعان' ایک عام حکم شرعی بیان کرنے کیلئے اتری ہے۔ گرچہ یہ آیت ھلال بن امیہ کی شان میں اتری ہے اس کے اطلاق میں وہ سب موارد شامل ہیں جہاں بھی شوہر اپنی بیوی کو خیانت کی تہمت لگائے گا اور آیت ''الظھار'' ظہار کے عمومی حکم کو بیان کرنے کے لئے اتری ہے گرچہ اس کا سبب نزول سلمۃ بن صخر ہے۔

اسی بنیاد پر علماءِ اصول نے اتفاق کیا ہے کہ ہمیں آیت قرآنی کے عمومی مفہوم اور لفظ کی شمولیت کی پیروی کرنا ہے اور سبب نزول صرف حکم شریعی کے نزول کا ایک سبب ہے اور یہ سبب حکم کو اسی موقع پر یا شخص پر محدود کرنے کے لئے نہیں ہے۔ حکم ''لعان'' بلال بن امیہ کے واقعہ کے بارے میں اترنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ حکم اس سے مختص ہو۔ لفظ کی عمومیت اور شمولت میں تمام شوہر شامل ہیں جو اپنی بیویوں پر خیانت کی تہمت لگاتے ہیں۔ آئمہ اہل بیتؑ سے وارد روایتوں نے اس مفہوم کی تائید کی ہے اور اسے تقویت بخشی ہے تفسیر عیاشی میں امام محمّد باقرؑ سے نقل ہے کہ آپؑ نے فرمایا: قرآن حیّ ہے یعنی موت نہیں آئے گی اسی طرح آیت بھی زندہ ہے وہ بھی نہیں مرے گی۔ اگر کوئی آیت کسی قوم کے بارے میں نازل ہو اور وہ قوم مرجائے تو گویا آیت بھی ساتھ مرجائے تو قرآن کب کا مر

چکا ہوتا۔لیکن آیت جاری ہے آنے والی نسلوں کے لئے جس طرح گذشتہ قوموں کے بارے میں جاری تھی۔(تفسیر عیاشی ج۲،ص۲۰۳)
امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: قرآن حیّ ہے، مرانہیں ہے، یہ جاری رہے گا جس طرح دن اور رات جاری ہیں جس طرح سورج چاند جاری ہیں اور یہ ہمارے اختتام تک جاری رہیں گے جس طرح ہم سے پہلے والوں میں جاری تھے جس طرح پہلے والوں پر جاری تھے۔ان لوگوں کی طرح بات نہ کرو جو کہتے تھے کہ وہ ایک واقعہ کیلئے تھا۔(الکافی ج۲،ص۱۵۶،حدیث ۲۸)

قرآن پیغمبرؐ کے زمانے میں جمع ہوا:۔

جمع قرآن کے دو معنی ہیں۔ایک کل قرآن کو حفظ کرنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔جمع قرآن سے مراد حفظ قرآن ہے۔جمع قرآن کا دوسرا معنٰی اس کی ضبط تحریر ہے۔
جہاں تک جمع قرآن بمعنٰی حفظ اور لوح قلب میں یعنی پیغمبرؐ کے سینے میں جمع ہونے کا تعلق ہے تو یہ ظاہری بات ہے کہ قرآن جمع ہونے سے پہلے آپؐ کو دیا گیا تھا خود پیغمبر اکرمؐ سید حفاظ، اول جامع قرآن ہیں۔اسی طرح آپؐ عام مسلمانوں کو حفظ قرآن کی دعوت دیتے تھے۔قرآن کا درس لینے اور آیات کے معانی کے اظہار کرنے کا دستور فرماتے تھے اور ہر نئے مہاجر کو ایک حافظ قرآن صحابی کے سپرد کرتے تھے کہ اسے تعلیم قرآن دیں۔حفظ قرآن کی مختلف شکل وصورتیں اور تلاوت کو فروغ دینے کا سلسلہ قائم ہوا تھا۔یہاں تک کہ پیغمبرؐ کی مسجد ایک تلاوت قرآن کی محفل بن چکی تھی جس میں قراءِ قرآن کی آواز بلند ہوتی تھی۔پیغمبر اکرمؐ نے انھیں آواز کو کم کرنے کا حکم دیا تا کہ اس میں مغالطہ نہ ہو جائے۔
قرآئت قرآن ہر زمانے میں اسلامی معاشرے میں رائج رہی ہے اور مسلمانوں نے اسکی تلاوت میں فن اپنائے ہیں اور اسکی قرآئت اور سماعت کے شوق کا مظاہرہ کیا ہے۔اس کی اہمیت ان کے دلوں پر طاری تھی یہاں تک کہ پیغمبرؐ سے نقل ہے کہ آپؐ نے فرمایا:"میں رات میں اپنے اشعری رفیقوں کی آواز کو جب وہاں جاتا ہوں تو پہچان لیتا ہوں اور ان کی

تلاوت قرآن سے میں ان کے گھروں کو پہچانتا ہوں گرچہ ہم نے اشعریوں کو ان گھروں میں جاتے ہوئے نہیں دیکھا ہے"۔(کنز العمّال ج۱۲،ص۵۶)
درس قرآن اور معانی قرآن کا تبادل مرد وعورت میں رائج تھا۔
لیکن جمع قرآن ضبط تحریر کے معنوں میں ہمیں اس وقت معلوم ہوا جب ہم نے آیات قرآن کی جمع کو پیغمبرؐ کے زمانہ میں ہونے کو ثابت کرنا شروع کیا۔لیکن علوم قرآن کی بحث میں عام رائے یہ ہے کہ جمع قرآن شیخین کے زمانہ میں ختم ہوا۔ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ آیات قرآنی چاہے پہلا مفروضہ ہو یا دوسرا بغیر کسی فرق کے تحریف سے محفوظ ہے اور اس سلسلہ میں جمع قرآن سے متعلق بعض شبہات دوسرے مفروضہ کی صورت میں وارد ہوئے ہیں ہم نے ان شبہات کا ذکر اور ان کا جواب دیا ہے۔

آیات مکی اور مدنی میں فرق

علماءِ تفسیر آیات قرآن کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں آیات کی ایک قسم کو مکی اور دوسری قسم کو مدنی کہتے ہیں۔لیکن کونسی آیات مکی ہیں اور کونسی مدنی اس اصطلاح کی وضاحت میں مختلف اور متعدد نظریات پائے جاتے ہیں۔
۱۔ پہلا نظریہ: جو عام رائج ہے کہ یہ تقسیم نزول زمانی کی بنیاد پر ہوئی ہے۔اور زمان کیلئے نقطہ آغاز ہجرت رسولؐ کو قرار دیا گیا ہے۔دونوں کے درمیان فاصلہ ہجرت رسولؐ ہے۔ہر وہ آیت جو ہجرت سے پہلے نازل ہوئی وہ مکی ہے اور جو ہجرت کے بعد نازل ہوئی وہ آیت مدنی ہے۔اگر چہ ھجرت کے بعد نازل ہونے والی بعض آیات مکہ میں ہی کیوں نازل نہ ہوئی ہوں وہ مدنی ہی تصور کی جائیں گی۔جیسے وہ آیات جو پیغمبر اکرمؐ پر فتح مکہ کے موقع پر نازل ہوئیں۔پس یہاں مکی اور مدنی آیات میں معیار زمان ہے یعنی ہجرت سے پہلے مکی اور بعد میں مدنی ہیں۔
۲۔ دوسرا نظریہ: جو مکان کے حوالے سے ہے۔آیات مکی و مدنی میں تمیز و معیار مکان ہے اگر پیغمبر اکرمؐ آیت کے نزول کے وقت مکہ میں تھے تو آیت مکی ہوگی اور اگر مدینہ

میں تھے تو آیت مدنی ہوگی۔

۳۔ تیسرا نظریہ: جس میں معیار مخاطبین ہیں یعنی یہاں مخاطبین کو مدّ نظر رکھا گیا ہے۔ پہلا نظریہ باقی دو نظریات سے یہ فرق رکھتا ہے کہ پہلے فرق کے بنیاد پر اس میں تمام آیات شامل ہوتی ہیں آیت جہاں بھی نازل ہوئی ہو کیونکہ اگر ہم نے زمانی پہلو کو انتخاب کیا تو قرآن کریم کی تمام آیات یا مدنی ہیں یا مکی کیونکہ اگر آیات پیغمبر اکرمؐ کے مدینہ کی طرف ہجرت سے پہلے اور مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے نازل ہوئی ہوں تو وہ مکی ہیں اگر چہ وہ آپؐ پر مکہ سے مدینہ تشریف لاتے وقت راستے میں ہی نازل ہوئی ہو اور اگر وہ آیات مدینہ میں داخل ہونے کے بعد نازل ہوئی ہوں تو وہ مدنی ہیں خواہ کہیں بھی نازل ہوئی ہوں۔ جبکہ دوسرے اور تیسرے نظریہ کو اپنائیں تو کچھ آیات ایسی ملتی ہیں جو نہ مکی ہیں نہ مدنی یعنی تیسری جگہ پر نازل ہوئی ہیں اور وہ نہ اہل مکہ سے مخاطب ہیں اور نہ ہی اہل مدینہ سے جیسے معراج اور اسراء کے موقع پر نازل ہونے والی آیات۔

تینوں نظریات میں ترجیح

اگر ہم ان کا آپس میں موازنہ کریں تو واجب ہے کہ ہم پہلے تیسری تفسیر کو اٹھائیں اس پر گفتگو کریں (کہ اس میں بنیاد ہی غلط ہے)۔ جس میں آیت کی تقسیم بندی یعنی مکی اور مدنی ہونے کے لئے معیار مخاطب ہے۔ اس تفسیر کی کوئی بنیاد نہیں کیونکہ یہ صحیح نہیں کہ ہم ان آیات کو مکی قرار دیں جن میں مکہ کے لوگ مخاطب تھے اور اسی طرح مدنی پر تطبیق کریں جن میں مدینہ کے لوگوں سے خطاب ہے۔ کیونکہ قرآن کے خطابات عام ہیں اور اس کے نزول کے وقت اس کا اہل مکہ یا اہل مدینہ پر منطبق ہونے کا یہ معنٰی نہیں کہ یہ کوئی خصوصی خطاب بن جائے یا اس میں جو نصائح اور شرعی احکام بیان ہوئے ہیں ان کو فقط لوگوں سے مختص کریں۔ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ عام ہے جب تک اس میں لفظ عام ہو۔

اسکے علاوہ مکی اور مدنی کے الفاظ کوئی شرعی لفظ نہیں ہیں کہ جسکا مفہوم پیغمبر اکرمؐ نے معین کیا ہوتا کہ ہم اس سے یہ مفہوم کشف کریں۔ بلکہ یہ ایک اصطلاح ہے جسے علماء تفسیر

نے اپنایا ہے۔ اور اس بات میں بھی شک کی گنجائش نہیں کہ اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کیلئے اصطلاح جعل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم یہاں اس مقام پر نہیں کہ یہ کہیں کہ پہلی اصطلاح صحیح ہے یا دوسری۔ جو بھی ہو یہ ایک اصطلاح ہے اور علمائے تفسیر کا حق ہے کہ وہ ایسی اصطلاحیں جعل کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ جو اصطلاحیں وضع ہوئی ہیں (مکی یا مدنی) انھیں زمانی لحاظ سے قبول کریں جیسا کہ پہلی تفسیر میں آیا ہے کیونکہ یہ زیادہ فائدہ مند ہے اور دروس قرآنی میں معاون و مددگار رہے۔ کیونکہ ان آیات میں اس طرح تمیز کرنا کہ جو ہجرت سے پہلے نازل ہوئیں یا ہجرت کے بعد قرآنی گفتگو میں اس کو مکانی لحاظ کی تقسیم سے زیادہ اہمیت حاصل ہے لہٰذا مکی اور مدنی کیلئے زمانے کو بنیاد بنانے کی اصطلاح کو اپنانا ھدف سے قریب تر اور فائدہ مند ہے۔ زمان کو معیار بنانا دو حوالوں سے اہمیت کا حامل ہے۔

ا۔ فقہی حوالے سے وہ آیات جو علم فقہ اور احکام شریعہ سے مربوط ہیں آیات کا زمان کے بنیاد پر مکی اور مدنی میں تقسیم کرنا اور ہجرت سے قبل اور ہجرت سے بعد کا معین کرنا ہمیں ناسخ ومنسوخ کو پہچاننے میں مدد دے گا کیونکہ جو آیات ناسخ ہیں وہ اپنی طبیعت کی بنا پر منسوخ کے بعد آئیں گی پس اگر ہمیں دو حکم ملے جو ایک دوسرے کو نسخ کر رہے ہوں تو وہاں پر اگر مکی اور مدنی زمان کے حوالہ سے تقسیم کرنے پر متوقف ہو تو ہمیں باآسانی ناسخ کی پہچان ہوسکتی ہے اور ان میں سے جو مدنی ہوگا وہی مکی کا ناسخ ہوگا کیونکہ مدنی زمانہ کے لحاظ سے اس سے متأخر ہیں۔

[یہ نکتہ اس بناء پر اہم ہے کہ علوم قرآن میں موجود معروف اقوال کی بنا پر آیات قرآنی میں نسخ موجود ہے اور نسخ ان دو جگہوں کے درمیان نکل آتا ہے جن میں سے ایک زمان کے اعتبار سے دوسرے سے متأخر ہے۔ تو بس یہاں پر دوسرا پہلے کے لیے ناسخ ہوگا لیکن اگر ہم یہ قبول کرلیں کہ قرآن میں نسخ کی نوعیّت اس طرح نہیں ہیں بلکہ قرآن کریم میں نسخ کے موارد آیۂ ناسخ کا آیۂ منسوخ پر نظر رکھنے سے واضح وروشن ہوجاتا ہے تو اس لحاظ سے اس نکتہ کی کوئی اہمیّت باقی نہیں رہتی۔ یہ صرف ایک فرضی بات ہوگی اس بارے میں مزید تفصیل کے لئے بحث ''نسخ'' کی طرف رجوع فرمائیں (مؤلف قدس سرّہ)]

۲۔ اس تقسیم بندی کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے سکیں گے کہ دعوت اسلامی پیغمبر اکرمؐ کے ہاتھوں کتنے مراحل سے گزری ہیں کیونکہ پیغمبر اکرمؐ کی ہجرت کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھی جو آپ کی دعوت میں پیش آیا ہو۔ بلکہ یہ ایک حد ہے جو دو مراحل کے درمیان وقوع پذیر ہوئی ہے یعنی دعوت کے دو مراحل ہیں پہلا مرحلہ عملِ فردی ہے اور دوسرا مرحلہ مرحلہ حکومتی ہے۔ اور ہجرت ان دونوں کے درمیان واقع ہوئی ہے ہمارے لئے یہ بھی ممکن تھا کہ ان دو مرحلوں کے کردار کے حوالے سے تقسیم بندی کریں۔ پس یہ واضح سی بات ہے کہ جو بھی بلند پایہ کی تقسیم ہو وہ ہجرت کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔

اگر ہم آیات قرآنی جو ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہیں اور جو بعد میں نازل ہوئی ہیں ان دونوں میں فرق قائم کر سکے تو فردی اور حکومتی حوالے سے جو تغیرات تبدیلیاں اور ترقی پیدا ہوئی ہیں ان کو ملاحظہ کر سکیں گے۔ اور اگر ہم نے مکان کو معیار بنایا اور زمان کو نظر انداز کیا تو اس صورت میں ہم کوئی نئی فکر حاصل نہیں کر سکیں گے بلکہ یہ دونوں مراحل اس میں خلط ہو نگے اور ساتھ میں فقہی حوالہ سے ناسخ و منسوخ میں بھی تمیز نہیں کر سکیں گے لہٰذا ہم پہلی تفسیر کو ترجیح دیتے ہیں اور اسی حوالے سے ان دو اصطلاحوں یعنی مکی و مدنی کو استعمال کریں گے۔

مکی اور مدنی کی پہچان کا طریقہ

مفسرین نے مکی و مدنی میں فرق رکھنا روایات اور تاریخی نصوص پر اعتماد کرنے کے بعد سے شروع کیا ہے۔ جن آیات اور سورتوں کے بارے میں تاریخ بیان ہوئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ وہ ہجرت سے پہلے نازل ہوئی ہیں یا ہجرت کے بعد، اور جن روایات اور نصوص پر مفسرین اعتماد کرتے تھے ان کے ذریعے بہت سارے سورتوں اور آیات کے مکی ہونے اور مدنی ہونے کی شناخت ہوگئی اور ان کے آپس میں فرق قائم کر سکے ہیں۔

جب روایات اور تاریخی نصوص کے ذریعے زیادہ مقدار میں مکی اور مدنی کی معرفت حاصل ہوئی تو بہت سارے مفسرین نے نصوص کے ذریعے سے معلوم و تاریخ مکّی

اور مدنی آیات اور سورتوں کا آپس میں موازنہ کرنا شروع کیا اور اس موازنہ کے نتیجہ میں مکی آیات اور سورتوں کے لئے ایک عمومی خصوصیت نکالی اور اسی طرح مدنی آیات اور سورتوں کیلئے دوسری خصوصیات اخذ کیں اور انھی خصوصیات کو دوسری ساری آیات اور سورتوں کیلئے کہ جن کا زمان روایات اور نصوص میں ذکر نہیں ہوا ہے ان خصوصیات کو اصول قرار دیا تو ان آیات اور سورتوں میں جو مکی آیات اور سورتوں کے خصائص سے متفق تھیں انھیں مکی قرار دیا اور جو آیات اور سورتیں مدنی آیات اور سورتوں کی خصوصیات سے منجسم تھیں انھیں مدنی آیات اور سورتوں کے ذیل میں درج کیا۔

یہ خصوصیات جو مکی اور مدنی کیلئے بنائی گئی ہیں ان میں سے بعض آیت اور سورہ کی اسلوب سے مربوط ہے جیسے کہ ان کا قول: چھوٹی آیات اور آواز کا آپس میں ہم آہنگ ہونا مکی آیات اور سورتوں کی خصوصیات میں سے ہے۔ اور ان خصوصیات میں سے بعض خود نص قرآنی سے مربوط ہیں جیسے کہ ان کا قول: مشرکین سے مناظرہ و گفتگو اور ان کی عقل کو مسترد کرنا مکی سورتوں کی خصوصیات میں سے ہے۔

مکی سورتوں اور آیات کیلئے جو خصوصیات اور طریقے بیان ہوئے ہیں انھیں مندرجہ ذیل میں خلاصہ بیان کر سکتے ہیں:

۱۔ سورۃ کا مختصر ہونا اور انداز بیان ایک جیسا ہو۔

۲۔ وہ آیات جن میں خدا اور یوم آخرت پر ایمان لانے کے اصول کی طرف دعوت دی گئی ہو اور جنت اور جہنم کے بارے میں نازل ہوئی ہوں مکی ہیں۔

۳۔ اچھے اخلاق کی دعوت دینے والی آیات اور نیکیوں پر استقامت کا حکم دینے والی آیات مکی ہیں۔

۴۔ مشرکین سے گفتگو اور انکی فکر کو رد کرنے والی آیات مکی ہیں۔

۵۔ جن سورتوں میں کلمہ ''یایھا الناس'' استعمال ہوا ہے اور ''یا ایھا الذین آمنوا'' استعمال نہیں ہوا۔ وہ مکی ہیں۔ لیکن اس اصول سے سورۂ حج کو استثناء قرار دیا ہے

کیونکہ اس میں ”یاایھاالّذین آمنوا“ استعمال ہوا ہے جب کہ یہ سورۃ مکی ہے۔
یہ تھیں وہ پانچ خصوصیات جو مکی سورتوں میں ملتی ہیں۔
اسی طرح وہ خصوصیات جو مدنی میں عام ہیں مندرجہ ذیل ہیں:
ا۔سورۃ کا طویل ہونا، آیت کا لمبی ہونا۔
۲۔ برہان، دلیل اور تفصیل سے حقائق دینی بیان کرتی ہو۔
۳۔ جہاں اہل کتاب سے مجادلہ ہوا ہو اور انھیں کہا گیا ہو کہ دین میں غلو نہ کرو۔
۴۔منافقین اور انکی حرکتوں کے بارے میں گفتگو ہوئی ہو۔
۵۔سیاسی، اجتماعی اور حکومتی حقوق، قوانین، فرائض اور حدود کے احکام کے بارے میں تفصیل ہو۔

ان خصوصیات کے بارے میں ہمارا موقف

اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ جو معیار ان عمومی خصوصیات سے اخذ ہوتا ہے ایک حد تک موضوع پر روشنی ڈالتا ہے لیکن کبھی ایک سورہ کے مکی یا مدنی ہونے کے بارے میں کوئی نص نہیں ہوتی۔ اوراس کے لئے دونوں احتمالات میں ایک احتمال کیلئے ترجیح کا سبب بھی بنتا ہے مثلاً ان سورتوں میں سے ایک اپنے طرز بیان، اختصار، آپس کی ہم آہنگی ،مشرکین کو چیلنج کرنے اور ان کی فکر کو ردّ کرنے کے حوالہ سے مکی سورۃ سے متفق ہو تو ایسی صورت میں اس سورۃ کو مکی قرار دینا زیادہ بہتر ہے کیونکہ یہ ان خصوصیات عامہ پر مشتمل ہے جو مکی سورۃ میں پائی جاتی ہیں۔

لیکن ان معیاروں پر بھروسہ اس صورت میں جائز ہے جب انسان یقین کی حدود تک پہنچ جائے صرف گمان اور وہم پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اگر ہم ایک ایسی سورۃ سے برخورد کریں جو اپنے طرز بیان اور اختصار وغیرہ میں مکی سورۃ سے ہم آہنگ ہو تو ہم اس بنیاد پر اسے مکی نہیں کہہ سکتے کیونکہ ممکن ہے ایک سورۃ مدینہ میں نازل ہوئی ہو اور اس میں بعض مکی خصوصیات پائی جاتی ہوں یہ بات صحیح ہے کہ اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ یہ مکی

ہو لیکن گمان کے تحت اسے مکی قرار نہیں دے سکتے کیونکہ گمان اور ظن علم نہیں ہے۔ ہاں اگر معیار ہمیں اطمینان دلا سکے اور سورۃ کی تاریخ کے حوالے سے تاکید ہو جائے کہ وہ مکی یا مدنی ہے تو اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً وہ آیات قرآنی جو جنگ اور حکومت کے بارے میں آئی ہیں اُن کی یہ خصوصیت اس بات کی دلیل ہے کہ یہ مدنی آیات ہیں کیونکہ دعوت کا پہلا مرحلہ یعنی ہجرت سے پہلے قانون، حکومت اور جنگ سے واقفیت نہیں رکھتا چنانچہ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی آیات دعوت کے دوسرے مرحلہ میں نازل ہوئی ہیں یعنی جب مدینہ میں حکومت قائم ہو چکی تھی۔

مکی ومدنی آیات سے متعلق شکوک وشبہات

قرآن کریم کے موضوعات میں مکی اور مدنی موضوع ان موضوعات میں سے ہیں کہ جس کے بارے شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں اور یہ شبہات پیدا ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہے: قرآن کریم کی مکی یا مدنی آیات میں سے ہر ایک کیلئے جو خصوصیات اور امتیازات ذکر ہوئے ہیں اس سے بعض مستشرقین کے ذہنوں میں یہ بات آئی ہے کہ قرآن کریم بشر کے اجتماعی اور شخصی حالات سے متاثر ہوا ہے یہ ان کے آثار قرآن کریم کے اسلوب اور عرض کرنے کے طریقہ میں باقی رہا ہے اور یہ اثر اسکے انداز بیان اور موضوعات میں نمایاں نظر آتا ہے۔

ہمارے لئے مناسب ہے کہ ہم ان شکوک وشبہات کو بیان کرنے اور انکو رد کرنے سے پہلے دو حقائق جو اسکے ذیل میں ہیں انھیں بیان کریں کیونکہ یہ دو باتیں اصل موضوع اور اسکے نتائج سمجھنے میں مؤثر ہیں۔

اول: ہمیں ابتداء سے ہی ان دو باتوں کے درمیان فرق رکھنے کی ضرورت ہے ایک دفعہ ہم یہ بات کرتے ہیں کہ قرآن کریم معاشرہ کے ماحول وغیرہ سے متأثر اور اثر پذیر ہوتا ہے یعنی قرآن کریم ان کے حالات کے مطابق ہوتا ہے اور ایک دفعہ یہ بات کرتے ہیں کہ قرآن کریم نے ان حالات کا لحاظ کیا ہے وہ ان حالات پر اثر انداز ہونا چاہتا ہے اور اسی

ذریعے سے وہ اپنی دعوت میں ان کو ترقی دیتا ہے لہٰذا یہ دو قسم کے افکار ہیں۔ان دونوں میں فرق رکھنے کی ضرورت ہے۔

پہلی فکر سے مراد درحقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم بشری ہے یعنی معاشرے کی فکری سطح اور اجتماعی حالات سے قرآن متاثر ہوا ہے جس طرح وہ خود ان حالات پر اثر چھوڑتا ہے جبکہ دوسری فکر سے ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ قرآن کا بنیادی موقف یہ ہے کہ وہ معاشرے میں تبدیلی لائے اسے دگرگوں کرے۔لہٰذا ایسے غایات واہداف کے حامل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حالات کا خیال رکھے۔غایات واہداف ہی اس طریقہ اسلوب کی نوعیت کو بیان کرتے ہیں۔جو طریقہ اسلوب ان اہداف تک پہنچنے کیلئے ضروری ہے۔

ان دونوں میں واضح و روشن فرق رکھنا چاہئے کہ ایک دفعہ ہم یہ کہتے ہیں کہ حالات کی دگرگونی کا دعوت پر اثر ہے اور ایک دفعہ ہم یہ بات کرتے ہیں کہ رسالت ودعوت نے اہداف وغایات کے حصول کی خاطر ایک خاص طریقہ وانداز اختیار کرلیا ہے۔کیونکہ ہدف وغایات رسالت سے جدا کوئی چیز نہیں تاکہ ہم ان دونوں کے رسالت اور دعوت پر اثر انداز ہونے کو بیرونی اور جدا کوئی چیز قرار دیں۔

جب ہم قرآن کے بارے میں پہلا تصوّر مسترد کرتے ہیں تو قرآن کریم کی مختلف آیات کے ظواہر کے بارے میں دوسری فکر کو اپنانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔چاہے یہ فکر قرآن کے انداز بیان سے متعلق ہو یا موضوعات کے حوالے سے ہو یا اصل بیان کے حوالے سے ہو۔

دوم: وہ تمام احکام جو قرآن کریم سے نکلتے ہیں اور اس میں جو اسلوب عرض ہوتا ہے ان کے مصدر کا بنیاد وہی ظاہر قرآن کا تفسیر ہونا چاہئے۔لہٰذا ممکن ہے قرآن میں ایک کلمہ ہو جس سے دو مختلف حکم صادر ہوتے ہوں یہ اصل وجود قرآن کی تفسیر کے بارے میں اختلاف ہونے کی وجہ سے ہے۔اس بارے میں کچھ مثالیں آپ کی خدمت میں مفسّر قرآن کے شرائط کو بیان کرتے وقت پیش کریں گے کہ مفسر قرآن کی شرائط میں سے ایک یہ

ہے کہ اسے اسلامی فکر وسوچ کا حامل ہونا چاہئے۔یہاں سے ہم اپنے لئے یہ جائز نہیں سمجھتے کہ کسی حکم کو جو قرآن سے متعلق ہو صرف اس بناء پر قبول کریں کہ یہ حکم اس نقطہ سے مشابہت رکھتا ہے۔بلکہ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم یہ بھی دیکھیں کہ یہ کس حد تک خود ظاہر قرآن سے مطابقت رکھتا ہے۔ظاہر قرآن جس کا ہم آئندہ آنے والی بحثوں میں ذکر کریں گے کہ یہ ظاہر قرآن حضرت محمدؐ کی شخصی فکر کی پیداوار نہیں ہے۔لہٰذا یہ بشری فکر کی پیداوار قطعاً نہیں ہے بلکہ یہ کلی طور پر الٰہی ہے اور آسمان سے مربوط ہے۔اس بنیاد پر ہم یقین محکم سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ تمام شکوک وشبہات جو قرآن کریم کی مکی و مدنی آیات کے حوالے سے اٹھائے جاتے ہیں سب کے سب باطل ہیں۔کیونکہ یہ شبہات درحقیقت قرآن کریم کے بشری پیداوار ہونے کی بنیاد پر مکی اور مدنی کے درمیان ظاہری فرق کی تفسیر ہے۔

ان شبہات کے ازالہ کیلئے ہمیں یہ کہنا پڑے گا کہ یہ مکی اور مدنی کے شبہات درحقیقت ان شکوک وشبہات سے مربوط ہیں جو خود وحی کے بارے میں موجود ہیں اور ان دونوں شبہات کے درمیان موضوعی ارتباط ہے کیونکہ یہ شبہات انکار وحی کی فکر سے مربوط ہے۔لہٰذا ہم یہاں پر ان شبہات کے بارے میں گفتگو کرنے کے بعد ان کو ردّ کریں گے تاکہ اس طرح ایک طرف سے ان شبہات کا باطل ہونا واضح ہو جائے اور دوسری طرف سے مکی اور مدنی کے درمیان صحیح فرق کی تفسیر ہو جائے۔

مکی اور مدنی آیات کے بارے میں شبہات:۔

مکی و مدنی آیات کے بارے میں شبہات کے دو پہلو ہیں۔ایک پہلو آیات قرآنی کے انداز بیان کے حوالے سے ہے اور دوسرا پہلو اس میں موجود مواد وموضوعات کے حوالہ سے ہے۔ان دونوں میں سے ہر ایک کیلئے چند شکلوں سے شبہات بنائے گئے ہیں ہم ان میں سے ہر ایک کی دو دو شبہات کا ذکر کریں گے۔

الف۔ مکی آیات کے انداز میں شدت وسختی ہے

انھوں (مستشرقین) نے کہا ہے کہ مکی آیات کے انداز میں شدت ہے، سختی ہے، سب وشتم ہے اور مدنی آیات اسکے برعکس ہیں۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ محمدؐ اس ماحول سے جس میں وہ زندگی گذار رہے تھے متاثر ہوئے ہیں۔ کیونکہ مکہ کا ماحول سختی اور جہالت پر مبنی تھا اس لئے یہ تندی اور سختی قرآن کے انداز بیان میں شامل ہوئی ہے جبکہ مدینہ کے معاشرے میں منتقل ہونے کے بعد یہ چیزیں ختم ہوگئیں وہ یہاں ایک اور قسم کے ماحول سے متاثر ہوئے کیونکہ مدینہ کے لوگ اہل کتاب اور ان کے اسلوب کے حضور میں تھے۔

یہ لوگ اس شبہہ کے بارے میں چند شواہد پیش کرتے ہیں یہ قرآن کریم کی بعض مکی سورتوں کو پیش کرتے ہیں جن میں ڈرانا اور دھمکانا ہے جیسے سورۂ ابی لہب، سورہ عصر، سورۂ تکاثر اور سورۂ فجر، وغیرہ ہیں۔

اس شبہ کو ہم اس طرح مسترد کر سکتے ہیں:

ا۔ قرآن کریم کی مکی آیات میں وعدہ وعید اور ڈرانے کی باتیں ہیں جو مدنی آیات میں نہیں ہیں۔ یہ بات غلط ہے درحقیقت یہ وعدہ وعید مکی اور مدنی دونوں آیات میں پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ مدنی آیات کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ ان میں عفو درگزر اور نرمی کی باتیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ صفات مدنی آیات سے مختص نہیں بلکہ عفو و درگذر اور نرمی کی باتیں مکی آیات میں بھی پائی جاتی ہیں اور آیات مدنی میں شدت اور سختی پائی جاتی ہیں۔ اسکے لئے قرآن میں بہت سے شواہد پائے جاتے ہیں۔ وہ مدنی آیات جن میں سختی اور شدت کا تذکرہ ہے:

﴿فان لّم تفعلوا ولن تفعلوا فاتّقوا النّار الّتی وقودها النّاس والحجارة اعدّت للکافرین﴾ ''اور اگر تم ایسا نہ کرسکو اور ہرگز نہ کرسکو گے تو اس آتش سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں یہ آگ کافروں کیلئے تیار کی گئی ہے'' (بقرہ/۲۴)

﴿الّذین یاکلون الرّبٰو الایقومون الّا کمایقوم الّذی یتخبّطه الشّیطان من

المسّ ذالک بانّهم قالوآ انّما البیع مثل الرّبٰو اواحلّ اللّٰه البیع وحرّم الرّبٰوا فمن جآءه موعظةٌ مّن رّبّهٖ فانتهٰی فله ماسلف وامره آلی اللّٰه ومن عادفاولٓئک اصحاب النّارهم فیها خالدون﴾ ''جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ بس اس شخص کی طرح اٹھیں گے جس کو شیطان نے چھو کر حواس باختہ کیا ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں: تجارت بھی تو سود ہی کی طرح ہے حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے تو جس شخص تک اس کے پروردگار کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ سود لینے سے باز آگیا تو جو پہلے لے چکا ہے وہ اسی کا ہوگا اور اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور جس نے اعادہ کیا تو ایسے لوگ جہنمی ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے'' (بقرہ/ ۲۷۵)

﴿یاایّها الّذین اٰمنوا اتّقوا اللّٰه وذروا مابقی من الرّبٰوا ان کنتم مّؤمنین. فان لّم تفعلوا فاذنوا بحربٍ مّن اللّٰه ورسولهٖ وان تبتم فلکم رءوس اموالکم لاتظلمون ولاتظلمون﴾ ''اے یمان والو اللہ کا خوف کرو اور جو سود (لوگوں کے ذمے) باقی ہے اسے چھوڑ دو اگر تم مومن ہو۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے جنگ کیلئے تیار ہوجاؤ اور اگر تم نے توبہ کرلی تو تم اصل سرمایہ کے حقدار ہو نہ تم ظلم کروگے اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا'' (بقرہ: ۲۷۸/ ۲۷۹)

﴿انّ الّذین کفروا لن تغنی عنهم اموالهم ولآاولادهم مّن اللّٰه شیئًا واولٓئک هم وقود النّار. کداب اٰل فرعون وّالّذین من قبلهم کذّبوا بایٰتنا فاخذهم اللّٰه بذنوبهم واللّٰه شدید العقاب. قل للّذین کفروا ستغلبون وتحشرون الٰی جهنّم وبئس المهاد﴾ ''جو لوگ کافر ہوگئے ہیں ان کے اموال و اولاد انہیں اللہ سے ہرگز کچھ بھی بے نیاز نہیں بنائیں گیا ور یہ لوگ دوزخ کے ایندھن بن کر رہ جائیں گے۔ ان کا حال بھی فرعونیوں اور ان سے پہلے لوگوں کا سا ہوگا جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا پس اللہ نے انہیں ان کے گناہوں کی وجہ سے گرفت میں لے لیا اور اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ (اے محمدؐ) جنہوں نے انکار کیا ہے ان سے کہہ دیجئے: تم عنقریب مغلوب ہوجاؤ گے

اور جہنم کی طرف اکٹھے کئے جاؤ گے اور وہ بدترین ٹھکانہ ہے'' (آل عمران/۱۰ تا ۱۲)

اسی طرح وہ مکی آیات جن میں نرمی اور عفوودرگذر کا ذکر ہے:

﴿ومن احسن قولاً مّمّن دعا الی اللّٰہ وعمل صالحاً وّقال انّنیْ من المسلمیْن. ولا تستوی الحسنة ولا السّیّئةُ ادفعْ بالّتی ھی احسن فاذا الّذی بینک وبینہ عداوةٌ کانّہ ولیٌّ حمیمٌ. وما یلقّٰھا الّا الّذیْن صبروا وما یلقّٰھا الّا ذو حظٍّ عظیم﴾ ''اور اس شخص کی بات سے زیادہ کس کی بات اچھی ہو سکتی ہے جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا: میں مسلمانوں میں سے ہوں۔ اور نیکی اور بدی برابر نہیں ہو سکتیں آپ (بدی کو) بہتریں طریقہ سے دفع کریں تو آپ دیکھ لیں گے کہ آپ کے ساتھ جس کی عداوت تھی وہ گویا نہایت قریبی دوست بن گیا ہے۔ اور یہ (خصلت) صرف صبر کرنے والوں کو ملتی ہے اور یہ صفت صرف انہیں ملتی ہے جو بڑے نصیب والے ہیں'' (فصلت/۳۳ تا ۳۵)

﴿فما اوتیتم مّن شیءٍ فمتاع الحیاة الدّنیا وما عنداللّٰہ خیرٌ وّابقیٰ للّذیْن اٰمنوا وعلیٰ ربّھم یتوکلوْن. والّذیْن یجتنبوْن کبائر الاثم والفواحش واذا ما غضبوا ھم یغفروْن. والّذیْن استجابوا لربّھم واقاموا الصّلاة وامرھم شوریٰ بینھم وممّا رزقْنٰھم ینفقوْن. والّذیْن اذا اصابھم البغی ھم ینتصروْن. وجزآؤ اسیّئةٍ سیّئةٌ مّثلھا فمن عفا واصلح فاجرہ علی اللّٰہ انہ لا یحبّ الظالمیْن. ولمن انتصر بعد ظلمہٖ فاولٰئک ما علیھم مّن سبیلٍ. انّما السّبیل علی الّذیْن یظلموْن النّاس ویبغوْن فی الارض بغیر الحقّ اولٰئک لھم عذابٌ الیمٌ. ولمن صبر وغفر انّ ذالک لمن عزم الامور﴾

''پس جو کچھ تمہیں دیا گیا ہے وہ دنیاوی زندگی کا سامان ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ بہترین اور زیادہ پائیدار ہے لوگوں کیلئے جو ایمان لاتے اور اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے پرہیز کرتے ہیں اور جب

انہیں غصہ آ جائے تو معاف کر دیتے ہیں۔ اور جو اپنے پروردگار کو لبیک کہتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور اپنے معاملات باہمی مشاورت سے انجام دیتے ہیں اور ہم نے جو رزق انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ اور جب ان پر زیادتی سے ظلم کیا جاتا ہے تو وہ اس کا بدلہ لیتے ہیں۔ اور برائی کا بدلہ اسی طرح کی برائی سے لینا (جائز) ہے پھر کوئی درگزر کرے اور اصلاح کرے تو اس کا اجر اللہ پر ہے اللہ یقیناً ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور جو اس کے ظلم (سہنے) کے بعد بدلہ لیں پس ایسے لوگوں پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ پس ملامت تو ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ملک میں ناحق زیادتی کرتے ہیں ایسے لوگوں کیلئے دردناک عذاب ہے۔ البتہ جس نے صبر کیا اور درگزر کیا تو یہ یقیناً ہمت کے کاموں میں سے ہے'' (شوریٰ/۳۶ تا ۴۳)

﴿ولقد اٰتینٰک سبعًا مّن المثانی والقرْاٰن العظیم. لا تمدّنّ عینیْک الیٰ ما متّعنا بہٖ ازواجًا مّنھم ولا تحزنْ علیھم واخفض جناحک للمؤمنیْن﴾ ''اور بتحقیق ہم نے آپ کو (بار بار) دہرائی جانے والی سات (آیات) اور عظیم قرآن عطا کیا ہے۔ (اے رسول) آپ اس سامان عیش کی طرف ہرگز نگاہ نہ اٹھائیں جو ہم نے ان (کافروں) میں سے مختلف جماعتوں کو دے رکھا ہے اور نہ ہی ان کے حال پر رنجیدہ خاطر ہوں اور آپ مومنین کے ساتھ تواضع سے پیش آئیں'' (حجر/۸۷ تا ۸۸)

﴿قل یٰعبادی الّذیْن اسرفوا علیٰ انفسھم لا تقنطوا من رّحمة اللّٰہ انّ اللّٰہ یغفر الذّنوب جمیعًا انّہ ھو الغفور الرّحیم﴾ ''کہہ دیجئے: اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا۔ یقیناً اللہ تمام گناہوں کو معاف فرماتا ہے وہ یقیناً بڑا معاف کرنے والا مہربان ہے'' (زمر/۵۳)

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں سبّ وشتم نہیں ہے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ خود قرآن نے اس عمل سے منع کیا ہے:

﴿ولوشآء اللّٰه مآاشركوا وماجعلناك عليهم حفيظًا ومآانت عليهم بوكيلٍ﴾ ''اوراگراللہ کی مشیت ہوتی تو یہ لوگ شرک کرہی نہیں سکتے تھےاور ہم نے آپ کوان پرنگہبان مقررنہیں کیااور نہ ہی آپ ان کے ذمہ دار ہیں'' (انعام/ ۱۰۸)

یہ جوسورۂ ابی لہب اور تکاثر میں سختی یا بدگوئی کا یہ لوگ کہہ رہے ہیں جبکہ بعض مستشرقین نے ہی کہا ہے اس میں سبّ وشتم نہیں ہے بلکہ انکواپنے انجام سے ڈرانے کی بات ہے یعنی ابی لہب اور کافرین کوان کے انجام سے ڈرایا جارہا ہے۔

قرآن کریم میں ڈرانے اور سختی کی باتیں مکی اور مدنی دونوں آیات میں پائی جاتی ہیں۔گرچہ مکی آیات میں اسکا ذکر زیادہ ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ مکہ میں مسلمانوں پرظلم وسختی زیادہ کی جاتی تھی لہٰذا قرآن نے کافروں سے سختی سے بات کی تاکہ مسلمانوں کی معنویت اورروح کوتقویت ملےاوردوسری طرف کافرین اورمشرکین کی معنویت کو پامال کیا جائے۔

چنانچہ اسکی طرف سورۂ مدنی میں بھی اشارہ ملتا ہے:

﴿انّ الّذين كفروا سوآءٌ عليهم ءانذرتهم ام لم تنذرهم لايؤمنون. ختم اللّٰه علىٰ قلوبهم وعلىٰ سمعهم وعلىٰٓ ابصارهم غشاوةٌ وّلهم عذابٌ اليمٌ. ومن النّاس من يّقول اٰمنّابالله وباليوم الاٰخروماهم بمؤمنين. يخادعون اللّٰه والّذين اٰمنوا ومايخدعون الّاانفسهم ومايشعرون. فى قلوبهم مّرضٌ فزادهم اللّٰه مرضًاولهم عذابٌ اليمٌ بما كانوا يكذبون. واذاقيل لهم لاتفسدوا فى الارض قالوآانّمانحن مصلحون. الاانّهم هم المفسدون ولاكن لّايشعرون. واذاقيل لهم اٰمنوا كمآاٰمن النّاس قالوآانؤمن كمآاٰمن السّفهآء الاانّهم هم السّفهآء ولاكن لّايعلمون. واذالقواالّذين اٰمنوا قالوآاٰمنّا واذاخلوا الىٰ شياطينهم قالوآانّامعكم انّمانحن مستهزءون. اللّٰه يستهزئ بهم ويمدّهم فى طغيانهم يعمهون. اولٰٓئك الّذين اشترواالضّلالة بالهدىٰ فماربحت تّجارتهم وماكانوامهتدين. مثلهم

كمثل الّذى استوقدنارًافلمّآاضآءت ماحوله ذهب اللّٰه بنورهم وتركهم فى ظلماتٍ لّايبصرون. صمٌّ بكمٌ عميٌ فهم لايرجعون﴾ ''جن لوگوں نے کفراختیار کیاان کیلئے یکساں ہے کہ آپ انہیں متنبہ کریں یانہ کریں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔اللہ نے ان کے دلوں اورانکی سماعت پرمہرلگادی ہے'نیزان کی نگاہوں پر پردہ پڑاہواہے اوران کیلئے بڑاعذاب ہے۔لوگوں میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں: ہم اللہ اورروزآخرت پرایمان لے آئے حالانکہ وہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔وہ اللہ اورایمان والوں کودھوکہ دینا چاہتے ہیں جبکہ (حقیقت میں) وہ صرف اپنی ذات کوہی دھوکہ دے رہے ہوتے ہیں لیکن وہ اس بات کاشعورنہیں رکھتے۔ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے'پس اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھادی اوران کیلئے ایک دردناک عذاب اس وجہ سے ہے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔اورجب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد برپانہ کروتو کہتے ہیں: ہم توبس اصلاح کرنے والے ہیں۔یادرہے! فسادی تو یہی لوگ ہیں لیکن وہ اس کااحساس نہیں کرتے۔اورجب ان سے کہا جاتا ہے کہ دیگرافرادکی طرح تم بھی ایمان لے آؤتو کہتے ہیں: کیا ہم بھی (ان) بیوقوفوں کی طرح ایمان لے آئیں؟ یادرہے! بے وقوف توخود یہی لوگ ہیں لیکن یہ اس کا (بھی) علم نہیں رکھتے۔اورجب وہ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم ایمان لے آئے ہیں اورجب اپنے شیطانوں کے ساتھ تخلیہ میں ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم توتمہارے ساتھ ہیں (ان مسلمانوں کاتو) ہم صرف مذاق اڑاتے ہیں۔اللہ بھی ان کے ساتھ تمسخرکرتا ہے اورانہیں ڈھیل دیتا ہے کہ یہ اپنی سرکشی میں سرگرداں رہیں۔یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے چنانچہ نہ توان کی تجارت ہی سودمندرہی اور نہ انہیں ہدایت حاصل ہوئی۔ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جس نے (تلاش راہ کیلئے) آگ جلائی' پھر جب اس آگ نے گردوپیش کوروشن کردیا تواللہ نے ان کی روشنی سلب کرلی اورانہیں اندھیروں میں (سرگرداں) چھوڑ دیا کہ انہیں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔وہ بہرے' گونگے اوراندھے ہیں پس وہ (اس ضلالت

سے) باز نہیں آئیں گے۔" (بقرہ ٦ تا ١٨)

﴿واذقلتم یٰموسٰی لن نّصبر علٰی طعامٍ واحدٍ فادع لنا ربّک یخرج لنا ممّا تنبت الارض من بقلہا وقثّائہا وفومہا وعدسہا وبصلہا قال اتستبدلون الّذی ہو ادنٰی بالّذی ہو خیرٌ اہبطوا مصرًا فانّ لکم مّا سالتم وضربت علیہم الذّلّۃ والمسکنۃ وبآءو بغضبٍ مّن اللّٰہ ذالک بانّہم کانوا یکفرون بایٰت اللّٰہ ویقتلون النّبیّن بغیر الحقّ ذالک بما عصوا وّکانوا یعتدون﴾ "اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب تم نے موسیٰ سے کہا کہ ہم ایک قسم کے کھانے پر صبر نہیں سکتے آپ کے پروردگار سے دعا کیجئے کہ ہمارے لئے زمین سے سبزی، ککڑی، لہسن، مسور اور پیاز وغیرہ پیدا کرے۔ موسیٰ نے تمہیں سمجھایا کہ کیا بہترین نعمتوں کے بدلے معمولی نعمت لینا چاہتے ہو تو جاؤ کسی شہر میں اتر پڑو وہاں یہ سب کچھ ملجائے گا اب ان پر ذلت اور محتاجی کی مار پڑ گئی اور وہ غضب الٰہی میں گرفتار ہو گئے یہ سب اس لئے ہوا کہ یہ لوگ آیات الٰہی کا انکار کرتے تھے اور ناحق انبیاء خدا کو قتل کر دیا کرتے تھے اس لئے کہ یہ سب نافرمان تھے اور ظلم کیا کرتے تھے" (بقرہ/٦١)

﴿بئسما اشتروا بہٖ انفسہم ان یّکفروا بمآ انزل اللّٰہ بغیًا ان یّنزّل اللّٰہ من فضلہٖ علٰی من یّشآء من عبادہٖ فبآءو بغضبٍ علٰی غضبٍ وللکافرین عذابٌ مّہینٌ﴾ "کتنی بری ہے وہ چیز جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانوں کا سودا کیا کہ صرف اس بات کی ضد میں خدا کے نازل کیے کا انکار کرتے ہیں کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے فضل وکرم نازل کرتا ہے پس وہ اللہ کے غضب بالائے غضب کے سزاوار ہوئے اور کافرون کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔" (بقرہ/٩٠)

﴿انّ الّذین یکتمون مآ انزلنا من البیّنات والھدٰی من بعد ما بیّنّاہ للنّاس فی الکتاب اولٰٓئک یلعنہم اللّٰہ ویلعنہم اللّٰعنون﴾ "جو لوگ ہمارے نازل کئے ہوئے واضح بیانات اور ہدایات کو ہمارے بیان کر دینے کے بعد بھی چھپاتے ہیں ان پر اللہ

بھی لعنت کرتا ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی لعنت کرتے ہیں" (بقرہ/١٥٩)

﴿اذقال اللّٰہ یٰعیسٰیٓ انّی متوفّیک ورافعک الیّ ومطھّرک من الّذین کفروا وجاعل الّذین اتّبعوک فوق الّذین کفروا الٰی یوم القیامۃ ثمّ الیّ مرجعکم فاحکم بینکم فیما کنتم فیہ تختلفون. فامّا الّذین کفروا فاعذّبہم عذابًا شدیدًا فی الدّنیا والاٰخرۃ ومالہم مّن نّاصرین﴾ "اور جب خدا نے فرمایا کہ عیسٰی ہم تمہاری مدّتِ قیام دنیا پوری کرنے والے ہیں اور تمہیں اپنی طرف اٹھا لینے والے ہیں اور تمہیں کفار کی خباثت سے نجات دلانے والے اور تمہاری پیروی کرنے والوں کو انکار کرنے والوں پر قیامت تک کی برتری دینے والے ہیں اس کے بعد تم سب کی بازگشت ہماری طرف ہوگی اور ہم تمہارے اختلافات کا صحیح فیصلہ کر دیں گے۔ پھر جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان پر دنیا اور آخرت میں شدید عذاب کریں گے اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا" (آل عمران/٥٥/٥٦)

﴿قل ھل اُنبّئکم بشرٍّ مّن ذالک مثوبۃً عنداللّٰہ من لّعنہ اللّٰہ وغضب علیہ وجعل منہم القردۃ والخنازیر وعبدالطّاغوت اولٰٓئک شرٌّ مّکانًا وّاضلّ عن سوآء السّبیل﴾ "پھر کہو" کیا میں اُن لوگوں کی نشان دہی کروں جن کا انجام خدا کے ہاں فاسقوں کے انجام سے بھی بدتر ہے؟ وہ جن پر خدا نے لعنت کی، جن پر اُس کا غضب ٹوٹا، جن میں سے بندر اور سُور بنائے گئے جنہوں نے طاغوت کی بندگی کی۔ اُن کا درجہ اور بھی زیادہ بُرا ہے اور وہ سَوَاءُ السَّبیل سے بہت زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں" (مائدہ/٦٠)

﴿وقالت الیھود ید اللّٰہ مغلولۃٌ غلّت ایدیہم ولعنوا بما قالوا بل یداہ مبسوطتان ینفق کیف یشآء ولیزیدنّ کثیرًا مّنہم مّآ انزل الیک من رّبّک طغیانًا وّکفرًا والقینا بینہم العداوۃ والبغضآء الٰی یوم القیامۃ کلّمآ اوقدوا نارًا لّلحرب اطفاھا اللّٰہ ویسعون فی الارض فسادًا واللّٰہ لایحبّ المفسدین﴾ "اور یہودی کہتے ہیں کہ خدا کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں جب کہ

اصل میں انھیں کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور یہ اپنے قول کی بنا پر ملعون ہیں اور خدا کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں اور وہ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے اور جو کچھ آپ پر پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے اوراس کا انکار ان میں سے بہت سوں کے کفر اور ان کی سرکشی کو اور بڑھادے گا اور ہم نے ان کے درمیان قیامت تک کیلئے عداوت اور بغض پیدا کر دیا ہے کہ جب بھی جنگ کی آگ بھڑکانا چاہیں گے خدا بجھادے گا اور یہ زمین میں فساد کی کوشش کر رہے ہیں اور خدا مفسدوں کو دوست نہیں رکھتا'' (مائدہ/۶۴)

ب۔ مکی سورتوں اور آیات کی ایک علامت ان کا مختصر ہونا ہے:

ایک اور فرق جو ان لوگوں نے بیان کیا ہے مکی سورہ اور آیات کا مختصر ہونا ہے۔ یعنی ان لوگوں نے سورۂ مکی اور مدنی میں فرق اختصار اور تفصیل کو قرار دیا ہے ہم دیکھتے ہیں آیات مکی مختصر ذکر ہوئے ہیں اور جو سورہ مدنی ہیں جیسے سورۂ بقرہ، آل عمران اور نساء وغیرہ طولانی سورے ہیں۔ اور یہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ مکی قسم اور مدنی قسم کے درمیان واضح فرق ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ محمدؐ نے جس معاشرے میں زندگی گذاری ہے اس سے یہ دونوں قسم متاثر ہوئے ہیں۔ مکہ کا معاشرہ چونکہ ان پڑھ تھا اسلئے محمدؐ کیلئے ممکن نہیں تھا کہ وہ مفاھیم کو مفصل، واضح اور کھل کر بیان کریں۔ لیکن جب وہ مدینہ کے معاشرے میں آئے جو پڑھا لکھا تھا تو انھیں موقع ملا کہ ان مفاھیم کو واضح اور کھول کر بیان کریں۔ یہ تھا مستشرقین کا قرآن کے بارے میں ایک اور شبہہ جس کو اب ہم مندرجہ ذیل نقاط کی روشنی میں مسترد کرتے ہیں۔

ا۔ مختصر اور خلاصہ گوئی صرف مکی سورتوں کی خصوصیات میں سے نہیں ہے بلکہ آپ کو مدنی سورتوں میں بھی چھوٹی سورہ ملیں گی۔ جیسے سورۂ نصر اور سورہ زلزال، سورۂ بینہ وغیرہ اور اسی طرح طویل و تفصیل ہونا مدنی ہونے سے مختص نہیں ہے کیونکہ مکہ میں بھی طولانی سورہ نازل ہوئے ہیں جیسے سورۂ انعام اور سورۂ اعراف۔

کبھی اختصار اور اجمال گوئی کو مکی کی خصوصیات میں سے گردانتے ہیں اس لحاظ

سے کہ مکی سورتوں میں عام طور پر یہ صفت پائی جاتی ہیں۔ یہ کچھ حد تک صحیح ہے لیکن یہ کسی بھی صورت اس پر دلالت نہیں کرتی کہ مکی قسم کی آیات اور سورتوں کا مدنی آیات اور سورتوں سے جوڑ ہوا نہیں ہے کیونکہ ان دونوں کے درمیان رابطہ پیدا ہونے کیلئے کافی ہے کہ قرآن کریم میں مکی سورتوں میں بعض طولانی سورے آئے اس لئے کہ ان مفاہیم اور موضوعات کی تفصیل کی قدرت اور تمکن رکھنے کی وضاحت ہو جائے۔

اسکے علاوہ آپ ملاحظہ کریں گے کہ جو سورتیں مکہ میں نازل ہوئیں انکی آیات آپ کو مدنی سورہ میں بھی ملیں گی اور اسی طرح مدنی سورتوں کی آیات مکی سورۃ میں ملیں گی لیکن ان دونوں حالتوں میں اس سورہ میں ایسا ربط و تعلق پایا جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ سورۂ ایک ہی دفعہ نازل ہوا ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ان دونوں کی آیات میں گہرا ربط ہے۔

۲۔ جن علماء مسلمین و غیر مسلمین نے عربی لغت کے بارے میں تحقیقات کی ہیں انکا کہنا ہے کہ خلاصہ بیانی بذات خود اپنی جگہ ایک قدرت کی نشانی ہے اور یہاں سے ہی قرآن کا اعجاز ظاہر ہوتا ہے خصوصاً اگر ہم آیات قرآنی پر دقت سے غور کریں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ قرآن نے عربوں کو چیلنج کیا ہے کہ اس قرآن جیسی ایک سورہ بنا کر لاؤ اور یہ چیلنج ایک مختصر سورہ سے ہونا ایک طویل سورہ سے چیلنج ہونے سے زیادہ درخشان اور بلیغ تر ہے۔

ج۔ مکی سورتوں میں احکام اور شریعت کا ذکر نہیں ہے

مکی آیات کے موضوعات میں شریعت کے احکام اور نظام کا ذکر نہیں ہے۔ جبکہ مدنی آیات میں اس بارے میں تفصیل سے بیان موجود ہے اور یہ ایک لحاظ سے قرآن کا اپنے ماحول سے متاثر ہونے کی علامت و نشانی ہے کیونکہ مکہ کا معاشرہ ترقی یافتہ نہیں تھا، انکے دلوں میں اہل کتاب کے معارف بھی نہیں پہنچے تھے، انکی تعلیمات نہیں پہنچی تھیں۔ جبکہ اسکے برعکس مدینہ کا معاشرہ بہت حد تک ادیان سماوی اور ان کی ثقافت سے متاثر ہوا تھا جیسے

یہود ونصاریٰ وغیرہ۔ ہم اس تیسرے فرق کو بھی دو زاویوں سے رد کرتے ہیں۔

۱۔ وہ آیات جو مکہ میں نازل ہوئی ہیں ان میں شرعی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے بلکہ شریعت کے اصول عامہ اور بعض فلسفہ دین کا بیان موجود ہے۔ جیسے یہ آیت:

﴿قُلْ تعالوْا اتْل ما حرّم ربّکمْ علیْکمْ الّا تشْرکوْا بہٖ شیئًا وّبالْوالدیْن احْسانًا و لاتقتلوْا اوْلادکمْ منْ امْلاقٍ نحْن نرْزقکمْ و ایّاھمْ و لاتقْربوا الْفواحش ما ظھر منْھا وما بطن و لاتقتلوْا النّفْس الّتیْ حرّم اللّٰہ الّا بالْحق ذالکمْ وصّاکمْ بہٖ لعلکمْ تعْقلوْن. و لاتقْربوْا امل الْیتیْم الّا بالّتیْ ھی احسن حتّٰی یبلغ اشدہ و اوفوا الْکیْل و الْمیْزان بالْقسْط لانکلف نفْسًا الّا وسْعھا و اذاقلْتمْ فاعدلوْا ولوْکان ذاقرْبٰی و بعھْد اللّٰہ اوْفوْا ذالکمْ وصّٰکمْ بہٖ لعلکمْ تذکّروْن﴾ ''کہہ دیجئے: آؤ ہم تمہیں بتائیں کہ تمہارے پروردگار نے کیا کیا حرام کیا۔ خبردار کسی کو اس کا شریک نہ بنانا اور ماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا، اپنی اولاد کو غربت کی بنا پر قتل نہ کرنا کہ ہم تمہیں بھی رزق دے رہے ہیں اور انہیں بھی، اور بدکاریوں کے قریب نہ جانا وہ ظاہری ہوں یا چھپی ہوئی اور کسی ایسے نفس کو جسے خدا نے حرام قرار دیا ہے قتل نہ کرنا مگر یہ کہ تمہارا کوئی حق ہو یہ وہ باتیں ہیں جن کی خدا نے نصیحت کی ہے تاکہ تمہیں عقل آجائے۔ اور خبردار مال یتیم کے قریب بھی نہ جانا مگر اس طریقہ سے جو بہترین طریقہ ہو یہاں تک کہ وہ توانائی کی عمر تک پہنچ جائیں اور ناپ تول میں انصاف سے پورا پورا دینا ہم کسی نفس کو اس کی وسعت سے سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے ہیں اور جب بات کرو انصاف کے ساتھ چاہے اپنے اقرباہی کے خلاف کیوں نہ ہو اور عہد خدا کو پورا کرو کہ اس کی پروردگار نے تمہیں وصیت کی ہے کہ شاید تم عبرت حاصل کرسکو'' (انعام:۱۵۱،۱۵۲)

اسی طرح مکی آیات مثلا:

﴿فکلوْا ممّا ذکر اسْم اللّٰہ علیْہ انْ کنْتمْ باٰیٰتہٖ موْمنیْن﴾ ''لہٰذا اگر تم اللہ کی نشانیوں

پر ایمان رکھتے ہو تو وہ (ذبیحہ) کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو'' (انعام/۱۱۹)

﴿و ذروْا ظاھر الْاثم و باطنہ انّ الّذیْن یکْسبوْن الْاثم سیجْزوْن بما کانوْا یقْترفوْن﴾ ''اور تم ظاہری اور پوشیدہ گناہوں کو ترک کردو جو لوگ گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں بے شک وہ عنقریب اپنے کئے کی سزا پائیں گے'' (انعام/۱۲۱)

﴿و کذالک زیّن لکثیْرٍ مّن الْمشرکیْن قتْل اوْلادھمْ شرکآؤھمْ لیرْدوْھمْ و لیلْبسوْا علیْھمْ دیْنھمْ ولوْشآء اللّٰہ مافعلوْہ فذرْھمْ و مایفْتروْن﴾ ''اور اسی طرح ان کے شریکوں نے اکثر مشرکوں کی نظر میں انہی بچوں کے قتل کو ایک اچھے عمل کے طور پر جلوہ گر کیا ہے تاکہ انھیں ہلاکت میں ڈال دیں اور ان کا دین ان پر مشتبہ بنا دیں اور اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرسکتے پس آپ انھیں چھوڑ دیں کہ وہ بہتان تراشی کرتے ہیں'' (انعام/۱۳۸)

﴿قلْ لّا اجد فیْ مآ اوْحی الّی محرّمًا علٰی طاعمٍ یّطْعمہٗ الّا انْ یکوْن میتۃً اوْ دمًا مّسْفوْحًا اوْلحْم خنْزیْرٍ فانّہ رجسٌ اوْ فسْقًا اھلّ لغیْر اللّٰہ بہٖ فمن اضْطرّ غیْر باغٍ و لاعادٍ فان ربّک غفوْرٌ رّحیْمٌ﴾ ''کہہ دیجئے: جو وحی میرے پاس آئی ہے اس میں کوئی چیز ایسی نہیں پاتا جو کھانے والے پر حرام ہو مگر یہ کہ مردار ہو یا بہتا ہوا خون ہو یا سور کا گوشت کیونکہ یہ ناپاک ہیں یا ناجائز ذبیحہ جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو پس اگر کوئی مجبور ہوتا ہے (اور ان میں سے کوئی چیز کھالیتا ہے) نہ (قانون کا) باغی ہو کر اور نہ (ہی ضرورت سے) تجاوز کا مرتکب ہو کر تو آپ کا رب یقیناً بڑا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے'' (انعام/۱۴۶)

ان آیات میں آپ کو ملے گا کہ اہل کتاب کے بہت سے اصول و شریعت کو قرآن کریم نے بحث و مناظرہ کا موضوع بنایا ہے۔ لہٰذا یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن ان تشریعات اور قوانین سے پہلے سے واقف و آشنا تھا۔

۲۔ ان تشریعات کے بارے میں ایک اور نظریہ جو ہم قرآن کریم کی رو سے پیش

کرتے ہیں وہ یہ کہ مکہ میں شریعت کے احکام کا بیان کرنا وقت سے پہلے تھا کیونکہ وہاں کے لوگوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا اور نہ ہی وہاں پیغمبرؐ کی حکومت تھی جبکہ اسکے برعکس مدینہ میں مسلمان تھے اور وہاں پیغمبرؐ کی حکومت بھی تھی۔لہٰذا مکہ میں بیان شریعت نہیں ہوا کہ وہاں دعوت کا مرحلہ تھا جو اس کیلئے سازگار نہیں تھا لہٰذا انہی باتوں کا بیان ہوا جو وہاں کے ماحول سے موافقت رکھتی تھیں۔چنانچہ انشاءاللہ ہم قریب اسکا ذکر کریں گے۔

د۔مکی آیات میں دلیل وبرھان کونہیں چھیڑا گیا ہے

یعنی ان لوگوں نے کہا کہ مکی آیات میں جو مرحلہ دعوت تھا اس میں عقائد واصول کے بارے میں کوئی دلیل نہیں پیش کی گئی ہے جبکہ مدنی آیات میں دلیل و برہان سے بات کی گئی ہے۔لہٰذا یہ بھی ایک دلیل ہے کہ قرآن اس وقت کے ماحول اور معاشرے سے متاثر ہوا ہے۔انکی نظروں میں قرآن اس وقت عاجز تھا کہ دلیل و برہان کو پیش کرے جس کیلئے کائنات کے حقائق پر گہری نظر رکھنے کی ضرورت ہے جبکہ محمدؐ جب مکہ میں تھے اس وقت وہ معاشرہ حقائق کائنات کونہیں سمجھ سکتا تھا۔لیکن جب محمدؐ مدینہ میں آئے اور اہل کتاب کے ساتھ زندگی گذاری تو قرآن کی ثقافتی سطح بلند ہوئی۔اس لئے قرآن کے انداز بیان میں بھی فرق آیا۔یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن ان حالات سے متأثر ہوا ہے ہیں اور ان کی وجہ سے خود قرآن کی ثقافتی سطح بلند ہوئی ہے۔ہم اس شبہہ کو بھی دو جہتوں سے مسترد کریں گے۔

ا۔مکی آیات بھی دلیل و برہان سے خالی نہیں ہیں بلکہ بہت سی سورتوں میں دلیل و برہان کو پیش کیا گیا ہے نیز اسکے بہت سے شواہد ہمیں قرآن میں ملیں گے اور ایسے بہت سے مواقع ملیں گے جہان توحید کے بارے میں استدلال کیا گیا ہے، جیسے:

﴿ما اتّخذ اللّٰہ منْ وّلدٍ وّما کان معہ منْ الٰہٍ اذًا لّذھَبَ کلّ الٰہٍ بما خلق ولعلا بعْضھمْ علٰی بعضٍ سبْحان اللّٰہ عمّا یصفوْن﴾ ''اللہ نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا اور نہ ہی اس کے ساتھ کوئی اور معبود ہے اگر ایسا ہوتا تو ہر معبود اپنی مخلوقات کو لے کر جدا ہو جاتا اور ایک دوسرے پر چڑھائی کر دیتا۔اللہ پاک ہے۔ان چیزوں سے جو یہ

لوگ بیان کرتے ہیں''(مومنون/۹۱)

﴿لوْ کان فیھما آلھۃٌ الّا اللّٰہ لفسدتا فسبْحان اللّٰہ رَبِّ الْعرش عمّا یصفوْن. لا یسْئل عمّا یفْعل وھمْ یسْئلوْن. ام اتّخذوْا منْ دوْنہٖ اٰلھۃً قلْ ھاتوْا برْھانکمْ ھٰذا ذکْر منْ مّعی و ذکْر منْ قبْلیْ بلْ اکْثرھمْ لا یعْلموْن الْحقّ فھمْ مّعْرضوْن﴾ ''اگر اس آسمان و زمین میں اللہ کے سوا خدا ہوتا تو دونوں کا نظام درہم برہم ہو جاتا پس پاک ہے'اللہ پروردگار عرش ان ان باتوں سے جو یہ بناتے ہیں۔اپنے افعال کا وہ جوابدہ نہیں جب کہ اوروں سے بازپرس ہوگی۔کیا انھوں نے اللہ کے سوا معبود بنا لئے ہیں؟ کہہ دیجئے:تم اپنی دلیل پیش کرو یہ میرے ساتھ والوں کی کتاب اور مجھ سے پہلے والوں کی کتاب ہے (ان میں کسی غیراللہ کا ذکر نہیں) بلکہ اکثر لوگ حق کو جانتے نہیں اس لئے (اس سے) منہ موڑ لیتے ہیں''(انبیاء/۲۲ سے ۲۴)

اسی طرح پیغمبرؐ کی نبوت کے بارے میں استدلال کرتے ہوئے اسے آسمانی حکم سے مربوط قرار دیا ہے:

﴿وما کنْت تتْلوْا منْ قبْلہٖ منْ کتابٍ وّلا تخطّہ بیمیْنک اذًا لّارْتاب الْمبْطلوْن. بلْ ھو اٰیاتٌ بیّناتٌ فیْ صدوْر الّذیْن اوْتوْا الْعلْمْ وما یجْحد باٰیاتنا الّا الظّالموْن. وقالوْا لوْلا انْزل علیْہ اٰیاتٌ مّنْ رّبّہٖ قلْ انّما الْاٰیات عنْد اللّٰہ و انّما انا نذیْرٌ مّبیْن. اوْلمْ یکْفھمْ انّا انْزلنا علیْک الْکتاب یتْلٰی علیْھمْ انّ فیْ ذالک لرحْمۃ وّذکْرٰی لقومٍ یّؤْمنوْن﴾ ''اور اے پیغمبرؐ آپ اس قرآن سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھتے تھے ورنہ اہل باطل شبہہ میں پڑ جاتے۔درحقیقت یہ قرآن چند کھلی ہوئی آیتوں کا نام ہے جو ان کے سینوں میں محفوظ ہیں جنہیں علم دیا گیا ہے اور ہماری آیات کا انکار ظالموں کے علاوہ کوئی نہیں کرتا ہے۔اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ آخر ان پر پروردگار کی طرف سے آیات کیوں نہیں نازل ہوتی ہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ آیات سب اللہ کے پاس ہیں اور میں تو صرف واضح

طور پر عذاب الٰہی سے ڈرانے والا ہوں۔کیا ان کیلئے یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے جس کی ان کے سامنے تلاوت کی جاتی ہے اور یقیناً اس میں رحمت اور ایماندار قوم کیلئے یاد دہانی کا سامان موجود ہے'' (عنکبوت/ ۴۸ تا ۵۱)

قیامت برپا ہونے اور ہر شخص کیلئے جزا و سزا سے استدلال کیا ہے:

﴿ونزّلنا من السّمآء مآءً مبارکاً فانبتنا بہٖ جنّاتٍ وّحبّ الحصید. والنّخل باسقاتٍ لّھا طلعٌ نّضیدٌ. رّزقاً للعباد واحیینا بہٖ بلدةً مّیتاً کذالک الخروج﴾ ''اور ہم نے آسمان سے بابرکت پانی نازل کیا جس سے ہم نے باغات اور کاٹے جانے والے دانے اگائے۔اور کھجور کے بلند و بالا درخت پیدا کیے جن میں تہ بہ تہ خوشے لگے ہوتے ہیں۔یہ سب بندوں کی روزی کے لئے ہے اور ہم نے اسی سے مردہ شہر کو زندہ کیا (مردوں کا قبروں سے) نکلنا بھی اسی طرح ہوگا'' (ق/ ۹ تا ۱۱)

﴿افعیینا بالخلق الاوّل بل ھم فی لبسٍ مّن خلقٍ جدیدٍ﴾ ''کیا ہم پہلی بار کی تخلیق سے عاجز آ گئے تھے؟ نہیں بلکہ یہ لوگ نئی تخلیق کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں'' (ق/ ۱۵)

﴿افحسبتم انّما خلقناکم عبثاً وّانّکم الینا لاترجعون﴾

''کیا تمہارا خیال یہ تھا کہ ہم نے تمہیں بیکار پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف پلٹا کر نہیں لائے جاؤ گے'' (مومنون/ ۱۱۵)

﴿ام حسب الّذین اجترحوا السّیّاٰت ان نّجعلھم کالّذین اٰمنوا وعملوا الصّالحات سوآءً مّحیاھم وَمَمَا تُھُم سآء مایحکمون. وخلق اللّٰہ السّماوات والارض بالحق ولتجزٰی کلّ نفسٍ بما کسبت وھم لایظلمون﴾ ''کیا برائی اختیار کرنے والوں نے یہ خیال کر لیا ہے کہ ہم انھیں ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کے برابر قرار دیدیں گے کہ سب کی موت وحیات ایک جیسی ہو یہ ان لوگوں نے نہایت بدترین فیصلہ کیا ہے۔اور اللہ نے آسمان اور زمین کو حق کے

ساتھ پیدا کیا ہے اور اس لئے بھی کہ ہر نفس کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جاسکے اور یہاں کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا'' (جاثیہ/ ۲۱،۲۲)

اسی طرح بہت سے اسلامی عقائد و مفاہیم کلی کے بارے میں استدلال پیش کیا گیا ہے۔

۲۔اگر ہم اس بات سے صرف نظر کریں یعنی مکی آیات میں استدلال نہیں ہے اور مدنی میں استدلال پیش کیا ہے اس فرق کو ہم تسلیم کریں تب بھی اسکی توجیہہ یوں بیان کریں گے۔پیغمبر گو اپنی دعوت کے نفوذ کیلئے مکہ میں جن لوگوں کا سامنا تھا انکی ذہنیت کا خیال رکھا گیا ہے۔مکہ میں دعوت کے مخاطب مشرکین عرب تھے بت پرست تھے وہاں قرآن نے جو دلیل پیش کیں ہیں وہ دلیلیں وجدانی ہیں جو وہ درک کر سکتے تھے اور انکے عقیدہ کو باطل ٹھہرانے کیلئے یہ دلیلیں کافی تھیں۔لیکن جب موقف بدل گیا اور ان افکار کا سامنا ہوا جو انحراف اور گمراہی میں پیچیدہ تھے یعنی اہل کتاب کے عقائد،لہٰذا ضروری ہوا کہ یہاں تفصیل کے ساتھ دلیل و برہان کو پیش کیا جائے۔ (ان شبھات اور ان کے ردّ کے بارے میں تفصیل کیلئے زرقانی کی کتاب ''مناھل العرفان'' ج۱،ص۱۹۹ کی طرف رجوع فرمائیں)

مکی اور مدنی آیات میں حقیقی فرق

یہ تھے وہ شبہات جو مکی و مدنی آیات کے فرق میں بیان ہوئے ہیں۔ان شبہات میں ہمیں کوئی چیز ایسی نہیں ملی جو علمی اور تحقیقی انتقادات کے مقابلے میں استقامت دکھا سکے۔اب ہم ان حقیقی فرق اور امتیاز کو پیش کرتے ہیں جو مکی اور مدنی آیات میں موجود ہیں۔گرچہ شبہات کا جواب دیتے وقت ہم نے بہت سے فرق و امتیاز کو بیان کیا ہے۔

اب ہم چاہتے ہیں کہ اس فرق کو اس بنیاد پر پیش کریں جسکی طرف ہم نے ابتدائی بحث میں اشارہ کیا ہے کہ یہ دعوت جو اہداف و مقاصد حاصل کرنا چاہتی تھی اس حوالے سے ان دونوں میں فرق پایا جاتا ہے۔ہدف و غایات بہت سے مواقع پر قرآن کی طرف سے دعوت پیش کرتے وقت اس پر سایہ فگن ہوتے ہیں وہ فرق اور خصوصیات کہ جن سے عام

طور پر مکی اور مدنی آیات میں امتیاز پایا جاتا ہے وہ درج ذیل ہیں:

۱۔مکی آیات میں زیادہ تر شرک و بت پرستی کے مسئلے کو اٹھایا گیا ہے۔جسکے نتیجے میں اس کی بنیاد نفسیاتی اور فکری ہے اور اخلاقی اور اجتماعی اثرات اور نتائج کو موضوع دعوت بنایا ہے۔

۲۔خلقت عالم میں ایجادات اور کائنات کے عجائب وغرائب کے بارے میں بحث وگفتگو ہوئی ہے اور جو اپنی جگہ ان چیزوں کے ایک خالق اور مدبر ہونے پر گواہ بنتی ہیں ان پر زیادہ توجہ دی ہے۔اسی طرح عالم غیب، بحث قیامت، جزاوسزا وحی اور نبوت پر تاکید کی گئی ہے اور ان چیزوں کے بارے میں دلائل اور براہین سے شرح دی گئی ہے۔اسی طرح انسانی وجدان اور اس میں ودیعت شدہ عقل وحکمت اور شعور کو مخاطب قرار دیا گیا ہے۔

۳۔اخلاق کے عمومی مفاہیم کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے ساتھ میں اس کے تطبیقی پہلو کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے اور ان کا اخلاق سے منحرف ہونے سے پرہیز رکھا گیا ہے جیسے کفر،عصیان و نافرمانی، جہالت ،دشمنی، لوگوں کا خون بہانا، لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا، دوسروں کی ناموس کو اپنے لئے مباح قرار دینا، یتیم کا مال کھانا وغیرہ جیسے انکے برے اخلاق کے مقابلے میں اخلاق فاضلہ کا ذکر کیا گیا ہے جیسے ایمان باالله اطاعت خدا ،علم،ایک دوسرے سے پیار ومحبت ، رحمت درگزشت ،صبرواخلاص، دوسروں کا احترام کرنا، والدین کا احترام کرنا، ہمسائے کا خیال رکھنا، لوگوں سے معاملے میں عدل کرنا، زبان میں سچائی اور خدا پر توکل وغیرہ۔

۴۔مکی آیات میں زیادہ تر انبیاء ورسل کے قصے بیان ہوئے ہیں اور ان حالات کا تذکرہ ہے جو دعوت کے عمل میں لوگوں اقوام اور امتوں کی طرف سے انھیں سامنا کرنا پڑا تھا انھوں نے انکے مقابل کیا موقف اختیار کیا۔اور ان قصوں میں کیا موعظات اور نصیحتیں پوشیدہ ہیں ان کا ذکر ہے۔

۵۔ان آیات میں خطاب میں صاف گوئی اور آواز میں ایک خاص انداز کو اپنایا

گیا ہے جو موثر ہو خواہ یہ آیات کی صورت میں ہو یا سورتوں کی شکل میں۔

ممکن ہے مدنی آیات غالب طور پر ان ذکر شدہ مکی خصوصیات کے خلاف ہوں گرچہ ممکن ہے اس کی خصوصیات یہ دو امور ہوں۔

۱۔ مدنی آیات اہل کتاب کے ساتھ مجادلہ کر کے انھیں اسلام کی طرف دعوت دیتی ہیں اور انبیاء پر جو نازل ہوئے تھے لوگوں کے ان عقائد سے انحراف اور حقیقی راستوں سے انحراف کے بارے میں بیان ہوئے ہیں۔

۲۔ مدنی آیات میں نظام شریعت کو بتانے میں تفصیل کے راستے کو اپنایا گیا ہے اور انسانی اجتماع میں مختلف تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے

مکی اور مدنی آیات کے درمیان فرق کا صحیح تجزیہ:۔

اب ہم چاہتے ہیں کہ مکی اور مدنی آیات اور کے درمیان فرق کو انکی خصوصیات اور امتیازات کی رُو سے روشن وواضح کریں۔یہ امتیازات ہمیں ان نکات میں ملتے ہیں۔

۱۔اسلامی دعوت کا آغاز مکہ سے شروع ہوا اور وہاں پر تیرہ سال گزارے اور یہ تیرہ سالہ زندگی نزول قرآن سے منسوب ہے۔درحقیقت اسی مدت میں عقیدہ اسلامی کے مختلف پہلوؤں کی بنیاد رکھی گئی ہے خواہ یہ عقیدۂ الٰہی ہو یا ایمان بالغیب ہو، اخلاق ہو یا اجتماعی پایہ خواہ وہ مثبت پہلو سے متعلق ہو جیسے کائنات زندگی، اخلاق یا معاشرہ کے بارے میں مفاہیم کا عرض کرنا یا وہ منفی پہلو سے متعلق ہو جیسے وہ کافرانہ عقائد جو اس معاشرے میں رائج تھے ان کو غلط ٹھہرایا جائے کہ جس نے اس وقت کے معاشرہ کو اندھیرے میں رکھا ہوا تھا۔

اس حقیقت کی روشنی میں دعوت کے مرحلہ میں ایک طرف سے مکہ کی آیات اور سورتوں میں زیادہ وسعت ہے دوسری طرف سے یہ اسلامی دعوت کے بنیادی اصول اور اساس سے مربوط ہے۔یہی وہ چیز ہے جو کمیت کے حوالہ سے مکی کے مدنی پر غالب ہونے کی تفسیر کرتا ہے جبکہ تاریخی حوالے سے مدینہ کا دور بڑے بڑے حوادث کے کا دور ہے۔ یہاں معاشرہ پیچیدہ اور مشکلات پر مشتمل ہے۔جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا کہ اسلام اپنے

دعوتی ماحول کو مدنظر رکھتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔ یہ خصوصیات اور امتیازات ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ مدنی مکی پر ایک لحاظ سے غالب ہے اور ایک لحاظ سے مکی مدنی پر غالب ہے۔

لیکن پہلی خصوصیت کی نسبت سے: ہم یہ ملاحظ کرتے ہیں کہ مکہ کے معاشرے پر عقیدہ کے لحاظ سے بت پرستی چھائی ہوئی تھی اور ساتھ میں یہ بات بھی تھی کہ اسلام نے جو موقف اپنایا تھا وہ جدید پیغام کو پہچاننے کیلئے ایک بنیادی پہلو کو اپنایا ہوا تھا کیونکہ اس نئے پیغام کی بنیاد خالص توحید تھا کہ جو دوسری تفصیلات اور پہلوؤں کیلئے بنیادی مقام رکھتا تھا۔ لہٰذا اسکا طبیعی نتیجہ ہے کہ اس شرک اور بت پرستی کی رد میں بات کی جائے اور طویل گفتگو اور مختلف انداز میں انکے ساتھ مناقشہ ومناظرہ کیا جائے۔

جہاں تک دوسری خصوصیت ہے: تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مکہ کا معاشرہ اصلاً خدا کی وحدانیت پر ایمان نہیں رکھتا تھا اسی طرح وہ ایمان بالغیب، قیامت، جزا وسزا اور وحی پر ایمان نہیں رکھتا تھا جبکہ یہ افکار رسالت اور اسلامی عقیدہ کے بنیادی اصول میں سے تھے ۔لیکن مدینہ کا معاشرہ اس سے مختلف تھا وہ اہل کتاب، خدا پر ایمان، عالم غیب پر ایمان اور قیامت اور جزا وسزا پر ایمان رکھتے تھے۔ لہٰذا مکی آیات میں ان چیزوں کے بارے میں بتانا ضروری تھا کیونکہ مکہ کا مرحلہ پہلا مرحلہ تھا اور ان چیزوں کا اس مرحلہ میں بیان نے دوسرے مرحلہ میں دوبارہ بیان کرنے کی ضرورت باقی نہیں رکھی۔ یہاں مکہ والی چیزوں کے بیان کا اصرار کرنا ایک اضافی عمل ہوگا۔

تیسری خصوصیت کی نسبت سے: مکی آیات میں مدنی کی بہ نسبت اخلاق کی زیادہ تاکید ہونے کے عوامل شاید یہ تین چیزیں ہوں:

۱۔ اجتماعی نظام میں اخلاق کو اسکی بنیاد و اساس میں سے گنا جاتا ہے۔ لہٰذا اس پر تاکید کرنا درحقیقت اجتماعی نظام میں اس اساس کی بنیاد کو رسوخ بخشنا ہے کہ جو اسلام و قرآن کے اھداف میں سے ہے۔

۲۔ دعوت اسلامی اپنی کامیابی یا پذیرائی کی خاطر انسان کے اچھے اندرونی

عواطف کو ابھارنے کی زیادہ نیاز مند تھی تا کہ وہ دعوت معاشرے میں نفوذ کر سکے اور انہی عواطف کے توسط سے لوگوں میں اثر کر سکے۔ اخلاق ہی ان تمام عواطف کی حقیقی بنیاد ہے جو انسان کی حیات میں نمو ورشد بخشتا ہے۔

۳۔ مدینہ کا معاشرہ جہاں اخلاق کی عملی اور تطبیقی ذمہ داری کو خود پیغمبرؐ اٹھائے ہوئے تھے اسکے لئے اخلاق کی طرف زیادہ تاکید کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسکے برعکس مکہ کے معاشرے میں مسلمان ظلم وستم کی زندگی گذار رہے تھے جہاں جاہلیت کا اخلاق عمل پیرا تھا لہٰذا وہاں اسلامی اخلاق پر تاکید کرنے کی زیادہ ضرورت تھی۔

چوتھی خصوصیت کی نسبت سے:

ہمیں اس سلسلہ میں موضوع کے حوالے سے بہت سے واقعات ملتے ہیں جنھیں قرآن نے مختلف زاویوں سے اٹھایا ہے۔ جیسے خدائے واحد پر عقیدہ رکھنا، غیب پر ایمان لانا، وحی پر ایمان لانا، اخلاق، قیامت میں زندہ ہونا، جزا وسزا کا عقیدہ یہ سب دعوت اسلامی کے مختلف مراحل ہیں اور مختلف اسلامی کرداروں کا نمونہ ہے اور وہ اجتماعی قوانین کہ جو اجتماع پر حکم فرما تھے اور جن میں اس اجتماع کے دشمنوں سے برخورد کرنے کی راہ کو بتایا ہے اسی وجہ سے قرآنی قصوں کو اس کے اعجاز کے اسباب میں سے ایک سبب قرار دیا ہے۔ اور آسمان سے مربوط ہونے کے دلائل میں سے ایک دلیل ہے۔

ان سب کا ایک محکم رابطہ ہے مکہ کی ان حالات اور ماحول سے جس میں سے دعوت اسلامی گذر رہی تھی۔ اور ان امور کی دعوت کی ترقی میں بہت بڑا اثر ہے اور اس دعوت کے بڑے اہداف پر بھی اثر انداز ہیں۔

ان تمام حالات کے باوجود مدنی زندگی میں قصص کو بالکل نظر انداز نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہاں بھی آپ کو اپنے مرحلہ میں قصص قرآنی ملیں گے چنانچہ اسکے بارے میں جب ہم قصص کا ذکر کریں گے تو بیان کریں گے۔

پانچویں خصوصیت کی نسبت:

اس خصوصیت کا اسلامی مراحل اور اعجاز سے محکم ارتباط ہے کیونکہ یہ وہ مرحلہ تھا جس میں جواس وقت کے معاشرہ پر چھائے ہوئے جاہلیت کے افکار کو توڑ نا تھا۔اس نے تیز آسمانی بجلی کی مانندان تمام مشکلات کو خاضع ومطیع بننے میں کردار ادا کیا۔اور اسلام کے مقابل مزاحمت کرنے والوں کی نفسیاتی اور روحانی طاقت کو پاش پاش کیا۔

جب قرآن نے عربوں کو چیلنج کیا کہ وہ ایک سورہ لائیں تو وہاں سورہ کا مختصر ہونا اعجاز قرآن کی وضاحت کے لئے زیادہ سائز تھا اور تاثیر کے لحاظ سے زیادہ عمیق اور مدت کے اعتبار سے زیادہ طویل المدت تھا۔

ان سب کے علاوہ ابتداء میں یہ معرکہ ایک قسم کی شعارات اور الفاظ کی جنگ تھا اور کائنات اور زندگی کے بارے میں مفاہیم کے آمادہ کرنے کا مرحلہ تھا اور یہاں اختصار اور چھوٹا ہونا معرکہ اور اس کی حدود کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے اور یہ اختصار بہت وسیع تفصیلات میں داخل ہونے سے زیادہ مناسب ہے۔لہٰذا ہم چھوٹے سورتوں کو مکی اقسام کے ابتدائی مراحل میں مشاہدہ کرتے ہیں۔

یہ تھے وہ تحفظات جو مدینہ کے معاشرہ میں نہیں تھے کیونکہ مدینہ کے معاشرے میں اسلام چھا گیا تھا۔ وہاں اسلامی حکومت تھی۔ وہاں نبوت کا مسئلہ، وحی کا مسئلہ، نبی کا آسمان سے ارتباط کا مسئلہ،سب پر واضح ہو چکا تھا۔یہاں معرکہ اپنے آخری انجام کو پہنچ چکا تھا۔یہاں بیان اور پیش کرنے میں معرکہ کا نیا دور شروع ہوا تھا۔

مکی خصوصیات وامتیازات کو بیان کرنے کے بعد آپ پر واضح ہوا ہوگا کہ مدنی کی خصوصیات میں احکام کی تفصیل بتانا،نظام اجتماعی واضح کرنا،اہل کتاب کے عقائد پر تنقید اور انکے انحرافات کی نشاندہی کرنا سب مدینہ کے معاشرے کے حالات کا تقاضا تھا۔یہاں لوگوں کے درمیان تعلقات وروابط کو واضح وروشن صورت میں بیان کرنے کی ضرورت تھی۔

اسی طرح مدینہ میں مقابلہ ومعرکہ،عقائد کے اصول اور بنیاد بیان کرنے سے نکل کر ان کی

تفصیلات میں داخل ہونا تھا۔ یہاں اسکی ان حدود وانحرافات کو جس کی بنیاد اہل کتاب نے ڈالی تھی سیدھا کرنے کا مرحلہ تھا۔

یہ تھا مکی اور مدنی میں فرق جسے ہم نے اس طریقہ سے بیان کیا جو ہماری فکر آیات قرآنی سے مطابقت رکھتی ہے اور ہماری اس فکر سے بھی مطابقت رکھتی ہے کہ قرآن نے حالات کا لحاظ کیا ہے تا کہ اس کے اہداف اور مقاصد حاصل ہو جائیں۔

اعجاز قرآن

معجزہ کیا ہے؟

ہر وہ نبی جو صاحب رسالت ہو اس کی یہ چاہت ہوتی ہے کہ پیغام لوگوں کے عقل ودل میں نفوذ کرے تا کہ انسان اس زمین پر جس طرح خدا چاہتا ہے ایک افضل انسان بن جائے نبی کے لئے اس ہدف کو حاصل کرنا اور یہ عمل کرنا ممکن نہیں جب تک وہ لوگوں سے اپنی نبوت کے بارے میں تائید وتسلیم حاصل کرلے اور لوگوں میں اس کے دعوے کی صداقت کا اعتقاد پیدا ہو جائے تا کہ نبی کو لوگوں پر قیادت سنبھالنے کا موقع ملے اور اپنی رسالت کے مفاہیم اور اس کے اصول سے ان کی تربیت کر سکے۔

لوگ بغیر دلیل کے ایمان نہیں لاتے تھے ۔لہٰذا پیغمبرؐ کے لئے ممکن نہیں کہ وہ لوگوں کو اپنے اور اپنی رسالت کے بارے میں ایمان لانے کی دعوت دے۔جب تک اپنی سچائی پر دلیل قائم نہ کرے اور خود کو خدا کی طرف سے رسول ہونے کو ثابت نہ کرے۔لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور نہیں کرسکتا جس طرح ہم اپنی عادی زندگی میں کسی شخص کے کسی ادارے کی نمائندگی کے دعویٰ کی تصدیق نہیں کرتے جب تک کہ وہ اپنے دعویٰ کو دلیل سے ثابت نہ کرے ۔ہم اس کے دعویٰ کو بغیر دلیل وبرھان کے مسترد کرتے ہیں اسی طرح انسان کے لئے ممکن نہیں کہ پیغمبرؐ کی نبوت پر بغیر دلیل کے ایمان لائے۔

وہ دلیل جو نبی اپنی سچائی کے لئے پیش کرتے ہیں وہ معجزہ ہے۔معجزہ یعنی نبی

کائنات میں ایسی تغیر لائے جو طبیعی قوانین کو چیلنج کریں اور یہ تغیر حس اور تجربہ سے ثابت ہو ۔جب آدمی پانی کو آگ پر رکھتا ہے تاکہ پانی گرم ہو جائے تو اس کا درجہ حرارت اوپر آجاتا ہے یہ ایک طبیعی قانون سے مطابقت رکھتا ہے جسے لوگ حس اور تجربہ سے جانتے ہیں۔ حرارت ایک گرم جسم سے اس کے نزدیک دوسرے جسم کی طرف منتقل ہوتی ہے۔اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ وہ پانی کو بغیر کسی حرارتی طاقت وتوانائی کے گرم کرسکتا ہے اور کر کے دکھائے تو اس نے اس قانون کو جو حس وتجربہ کے ساتھ مسلم وجاری ہے چیلنج کیا ہے۔اگر کسی مریض کو ایسا مادہ دیا جائے جو اس مریض کے اندر موجود جراثیم کے خلاف ہو تو اس نے ایک قانون طبیعی پر عمل کیا جو تجربہ سے ثابت ہے یعنی یہ تجربے سے ثابت ہے کہ یہ مادہ فلاں قسم کے جراثیم کو مار دیتا ہے۔اگر کوئی شخص کوئی مادہ استعمال کئے بغیر کسی کو صحت یاب کرتا ہے تو گویا اس نے اس قانون کو چیلنج کیا جسے لوگ تجربہ سے جانتے ہیں اور اس طرح معجزہ محقق ہوتا ہے۔

اگر نبی اس قسم کا کوئی عمل بجالائے تو دلیل ہوگا کہ اس کا خدا سے رابطہ ہے اور یہ دعویٰ نبوت میں سچا ہونے کی دلیل ہوگا اور ایک عادی انسان کے لئے ایسا کرنا ممکن نہیں کہ وہ کائنات میں تغیر لائے اور ایسا تغیر لانا صرف اس صورت میں ممکن ہے جب وہ ایسے قوانین کو مورد استفادہ قرار دے جسے انسان حس اور تجربہ سے جانتے ہوں لیکن اگر کوئی انسان یہ استطاعت رکھتا ہو کہ ایسا تغیر لائے جو ان قوانین کو چیلنج کرے۔تو وہ ایسا انسان ہوگا جس نے یہ قدرت خدا سے استثنائی طریقہ سے لی ہے اس کا جو رابطہ خدا سے ہے وہ دوسروں کو حاصل نہیں۔ یہاں پر اس قسم کا دعویٰ کرنے والے شخص کی نبوت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔

معجزہ اور علمی ابتکار میں فرق:۔

جو بات ہم نے بتائی اس کی روشنی میں ہم یہ جان گئے کہ بہت سے نابغہ علماء نے علمی میدان میں جو انکشافات کی ہیں اسے ہم معجزہ نہیں کہتے۔اگر ہم فرض کریں کہ ایک

شخص اپنے معاصر علماء میں سے سبقت لیجائے اور مرض سرطان کے جراثیم کو مارنے والے مواد کو کشف کرنے میں کامیاب ہو جائے درحالیکہ دوسرے علماء اس کام سے عاجز ہوں۔ اس کا یہ عمل معجزہ نہیں کہلائے گا کیونکہ اس نے دوسرے علماء کی جہالت کو چیلنج کیا ہے۔اس قانون کو چیلنج نہیں کیا ہے جو حس اور تجربہ سے ثابت ہے بلکہ اس نے ایک تجربہ کی روشنی میں سرطان کے مریض کو صحت یاب کیا ہے جس کے بارے میں اس نے اپنی لیبارٹری میں کام کیا تھا اور اس نے ایک قانون کو کشف کیا جو اس کے علاوہ ابھی تک کوئی اور نہیں جانتا اور یہ واضح سی بات ہے کہ تجربہ کے ذریعے کسی قانون کا علم پیدا کرنا کسی قانون کو چیلنج کرنا نہیں ہے بلکہ اس نے اپنے دوست ومعاصرین کو اس معنی میں چیلنج کیا کہ سب سے پہلے اس نے سرطان کے علاج کو کشف کیا ہے۔

قرآن سب سے بڑا معجزہ ہے:۔

جب ہم نے معجزہ کی تعریف بیان کی کہ معجزہ اسے کہتے ہیں جہاں نبی کائنات میں کوئی ایسی تبدیلی وتغیر لائے جو قانون طبیعی کو چیلنج کرے تو یہ ممکن ہے کہ ہم یہ تعریف قرآن پر منطبق کریں۔قرآن نے بھی ایک بہت بڑا تغیر پیدا کیا ہے جو انسانی زندگی میں ایک بڑا انقلاب لایا جو کائنات کے قوانین طبیعی اور معروف تجربہ سے ممکن نہیں۔

اگر ہم اُس وقت کے عالمی حالات کا مطالعہ کریں اور خاص طور پر عرب اور سر زمین حجاز کا مطالعہ کریں اور خود پیغمبرؐ کی بعثت سے پہلے کی زندگی کا جائزہ لیں اور ان عوامل و اسباب کا جائزہ لیں جو اس وقت کے معاشرے وماحول پر اثر انداز تھے پھر ان سب کو جو اس کتاب کریم میں آیا ہے جو ایک بڑا پیغام ہے اس کے ساتھ موازنہ کریں تو یہ ان تمام عوامل واثرات کو چیلنج کرتا ہے اور اس نے ہمہ گیر اور کامل تغیر پیدا کیا ہے اور ایک ایسی امت کی بنیاد رکھی جو بہت بڑی صلاحیتوں وقابلیتوں کی حامل ہے۔جب ہم ان سب کا ملاحظہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن ایک بڑا معجزہ ہے۔اس قرآن کی کوئی مثال نہیں ہے کیونکہ یہ قرآن اس پست ماحول کا نتیجہ نہیں جس میں یہ فرسودہ عوامل واسباب حاکم تھے۔قرآن نے اس

موقع پران تمام قوانین طبیعی کو چیلنج کیا اوران سب سے بلند مرتبہ والا ہے جس کے تغیر پر وہ عوامل اثر نہ کرسکے دوسرے الفاظ میں واضح طور پر پیش کرنے کے لئے ممکن ہے کہ ہم اس ماحول کا جائزہ لیں جس میں قرآن نے اپنا پیغام پہنچایا ہے ہم اس پیغام و ماحول کو جسے قرآن نے بتایا ہے اوراس امت کا ان کے درمیان موازنہ ومقابلہ کریں گے جس میں قرآن کے معجزہ ہونے کے دلائل بھی پیش کریں گے۔

قرآن معجزہ کے ہونے کچھ دلائل

۱۔ قرآن نے جزیرۃ العرب خاص کر سرزمین مکہ سے پوری دنیا کی طرف ایک نور وشعاع چھوڑا۔سرزمین مکہ ایک ایسی جگہ تھی کہ جہاں کسی قسم کی ترقی وتمدن کا شائبہ تک نہیں تھا۔وہ ترقی وتمدن میں اس وقت کے ترقی یافتہ معاشرے سے بھی متأثر نہیں تھا۔یہ پہلا امتیاز وفرق ہے جو اس کتاب کا قوانین طبیعی اور عادی کے خلاف ہونے کی دلیل ہے کیونکہ ہر قانون حکم کرتا ہے کہ کتاب اپنے دور کے معاشرے اور زمانہ کی ثقافت کی ترجمان ہے جس میں صاحب کتاب نے زندگی گزاری ہے، جس میں اس نے پڑھا ہے۔صاحب کتاب اپنے اس معاشرے کی فکر وثقافت کی ترجمانی کرتا ہے یا اس ثقافت سے آگے بڑھنے کی حدتک بیان کرتی ہے یا وہ کتاب اتنا آگے بڑھ جاتی ہے بہت ہی آگے نکل جاتی ہے اور بغیر کسی تمہید وپیش گوئی کے ایک نئی ثقافت لائے جو ان رائج افکار سے کوئی ربط نہ رکھتی ہو بلکہ اس نے اس معاشرے کو بالکل پیچھے چھوڑا اور ہر زمانہ میں موجود عام انسان کے عادی تجربات سے مطابقت نہیں رکھتی۔

یہ وہ قانون وچیلنج ہے جسے قرآن نے پیدا کیا ہے۔قرآن نے بہت سے علاقے ومعاشرے کو پیچھے چھوڑا ہے اوران کے افق کو اوران کے علمی وفلسفی تمدن کو پیچھے چھوڑا ہے تا کہ ان پر اچانک ایک نئی ثقافت کا ہجوم ہو پورا عالم جس کا محتاج ونیاز مند رہا ہو۔یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن کریم اس معاشرے کی رائج فکر کی تعبیر نہیں یا اس معاشرے کی ترقی یافتہ ثقافت نہیں ہے بلکہ یہ ایک فکر ہے جس کی پہلے مقدمہ یا تمہید نہیں باندھی گئی ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ جس ماحول ومعاشرے کو نزول قرآن کے لئے انتخاب کیا ہے وہ خود اپنی جگہ قانون طبیعی کیلئے پہلا چیلنج تھا اس قانون طبیعی کا تقاضا تھا کہ نئی ثقافت ایک ایسے معاشرے میں پیدا ہو جو سب سے اعلیٰ وارفع اور ترقی یافتہ معاشرہ اور ماحول ہو لیکن قرآن اس کے برخلاف ماحول اور معاشرہ میں نازل ہوا۔

۲۔ قرآن کی جو بشارتیں دیں اور عالم کو اس کا اعلان کیا وہ اسی شہر مکہ کا ایک فرد تھا اس کے لئے حتیٰ کہ خود مکہ والوں کی سہولیات تعلیم اور ثقافت وغیرہ بھی حاصل نہیں تھیں۔وہ ایک ان پڑھ انسان تھے۔نہ پڑھ سکتے تھے اور نہ ہی لکھ سکتے تھے انھوں نے ایسی قوم میں چالیس برس زندگی گزاری۔ان پر اتنی طولانی مدت میں اس معاشرے کی نہ تعلیم، نہ علم وادب کسی نے بھی اثر نہیں کیا:

﴿وما کنت تتلوا من قبلہٖ من کتٰب ولا تخطّہ بیمینک اذًا لارتاب المبطلون﴾ ''(اے نبیؐ) تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے'' (عنکبوت/ ۴۸)

﴿قل لوشآء اللہ ماتلوتہ علیکم ولآادرٰکم بہٖ فقدلبثت فیکم عمرًا من قبلہٖ افلاتعقلون﴾ ''آپ کہہ دیجئے کہ اگر خدا چاہتا تو میں تمہارے سامنے تلاوت نہ کرتا اور تمہیں اس کی اطلاع بھی نہ کرتا آخر میں اس سے پہلے بھی تمہارے درمیان ایک مدت تک رہ چکا ہوں تو کیا تمہارے پاس اتنی عقل بھی نہیں ہے'' (یونس/ ۱۶)

یہ قرآن کریم کی طرف سے قانون طبیعی کے خلاف ایک اور چیلنج ہے اگر قرآن قانون کا پیدا کردہ ہوتا تو یہ ممکن نہیں تھا کہ قرآن ایک ان پڑھ شخص لائے جو کسی بھی حوالے سے اس معاشرے کی محدود ثقافت میں بھی شریک نہیں تھا اس سے کسی قسم کی نقل لغت یا اس کے مختلف ادوار سے متعلق ان کی سرگرمیوں کے بارے میں بھی کوئی نقل نہیں ہوا ہے تا کہ یہ کہا جائے کہ یہ اس وقت کے ادب کا پیدا کردہ ہے۔اس کے باوجود اس کے جمال وزیبائی، حکمت وبلاغت نے اس وقت کے بڑے بڑے علماء اور اہل بلاغت کو متأثر

کیا۔

کیا آپ نے کبھی دیکھا ہے کہ قانون طب کے میدان میں کوئی شخص علم طب میں جاہل ہو پڑھا لکھا نہ ہو اور وہ کوئی ایسی کتاب پیش کرے جس میں موجود علم کے اسرار ورموز دنیا کے اطباء کے عقول کو حیران کیا ہو آپ نے کبھی یہ دیکھا ہے کہ ایک ایسا شخص ہو جو اس رائج قانون کے تحت کسی بھی زبان میں پڑھنا لکھنا نہ آتا ہو اور اس وقت کے تمام علوم سے بھی بے بہرہ ہو لیکن وہ ایک انمول تاریخی سند لائیں جو اس (معاشرے) زبان کی جان اور روح کا مقام رکھتا ہو اور لغت ادب میں ایک بڑی قدرت کی حامل ہونے کا اظہار کرے کہ جو کسی کے وہم وخیال میں نہیں ہوتی کہ لوگ اسے ساحر کہنا شروع کر دیں۔

حقیقت میں مشرکین کو زمان بعثت پیغمبرؐ میں ہی اس چیلنج کا احساس ہوا تھا اور اس کی توجیہ کرنے کے بارے میں حیران وسرگرداں تھے اور طبیعی قانون کے تحت وہ لوگ اس کے لئے کوئی توجیہ پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ قرآن کریم کی توجیہ کے بارے ان کا موقف اور ان کے حیران وسرگردان ہونے کے بارے میں ہمارے پاس بہت سارے تاریخی سند موجود ہیں کہ وہ لوگ قوانین اور طبیعی عادات کو چیلنج کرتے ہوئے دیکھ کر پریشان تھے جن میں سے ایک ولید ابن مغیرہ ہے جس نے ایک دن مسجد الحرام میں حضرت محمدؐ کو قرآن پڑھتے سنا اور یہ اپنے قبیلہ بنی مخزوم کے پاس آیا اور ان سے کہا ''خدا کی قسم میں نے محمدؐ سے ایسا کلام سنا ہے جو انسانوں یا جنوں کا کلام نہیں ہے۔ اس میں اتنی مٹھاس وشیرینی اور تازگی وتری موجود ہے کہ اس کی بلندی ثمر بخش ہے اس کے نیچے بہت گہرائی ہے۔ یہ چھا جائے گا اس پر کوئی غالب نہیں آسکے گا'' ولید یہ کہہ کر اپنے گھر چلا گیا تو قریش نے کہا کہ واللہ ولید محمدؐ سے متاثر ہوا ہے اور اس کے تاثر سے پورے قریش متاثر ہو سکتے ہیں۔ ابو جہل جو اس محفل میں بیٹھا تھا اس نے کہا اس کی ضمانت میں دیتا ہوں۔ وہ فوراً اٹھا اور ولید کے گھر چلا گیا۔ اور ولید کے سامنے غمزدہ ہو کر بیٹھ گیا تو ولید نے پوچھا کہ اے میرے بھائی کیوں غمگین نظر آتے ہو اس نے کہا یہ قریش سے آپ نے اس عمر رسیدہ حالت میں جو بیان

کیا ہے، یہ لوگ یہ فکر کر رہے ہیں کہ آپ منحرف ہو گئے ہیں اور آپ نے محمدؐ کے کلام کو اچھالا ہے۔ یہ سن کر ولید اٹھا اور ابو جہل کے ساتھ اسی محفل میں آیا اور ان سے کہا کہ تم لوگ گمان کرتے ہو کہ محمدؐ دیوانہ ہے۔ آیا محمدؐ کو کبھی غضب کرتے ہوئے دیکھا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔ آیا گمان کرتے ہو کہ یہ کاہن ہے تو ان میں کبھی اثر کہانت دیکھا ہے؟ جواب دیا کہ نہیں۔ ولید نے پوچھا آیا تم گمان کرتے ہو کہ وہ شاعر ہے تو اسے کبھی شعر کہتے ہوئے سنا ہے؟ کہا نہیں۔ آیا گمان کرتے ہو وہ جھوٹا ہے تو کبھی اسے جھوٹ بولتے سنا ہے؟ کہا نہیں تو پھر یہ کیا کہتا ہے؟ ولید فکر میں ڈوب گیا۔ پھر کہا کہ یہ سحر ہو سکتا ہے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ مرد وعورت میں جدائی ڈالتا ہے بیٹے اور غلام کو باپ سے چھینتا ہے جب اس نے یہ کہا تو یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿انہ فکر وقدر. فقتل کیف قدر. ثم قتل کیف قدر. ثم نظر. ثم عبس وبسر. ثم ادبر واستکبر. فقال ان ھذا الا سحر یؤثر.﴾ ''اس نے فکر کی اور اندازہ لگایا۔ تو اسی میں مارا گیا کہ کیسا اندازہ لگایا۔ پھر اسی میں اور تباہ ہو گیا کہ کیسا اندازہ لگایا۔ پھر غور کیا۔ پھر تیوری چڑھا کر منہ بسور لیا۔ پھر منہ پھیر کر چلا گیا اور اکڑ گیا۔ اور آخر میں کہنے لگا کہ یہ تو ایک جادو ہے جو پرانے زمانے سے چلا آرہا ہے'' (مدثر/۱۸ تا ۲۴)

ایک اُمی شخص پر یہ قرآن نازل ہو کر عرب کو چیلنج کرنے پر بعض عرب نے یہ فرض کیا تھا کہ محمدؐ کو یہ قرآن کوئی سکھاتا ہے لیکن وہ جرأت نہیں کرتے تھے کہ یہ بتائیں۔ خود ان میں سے کسی نے سیکھایا ہے کیونکہ وہ لوگ امی تھے انھوں نے فطرتاً یہ درک کیا تھا کہ جاہل لوگوں کو کچھ نہیں سکھایا جاسکتا تو انہوں نے گمان کیا کہ ایک غیر عرب رومی غلام جو کہ نصرانی تھا مکہ میں ایک عرصہ رہا تھا اور لوہار کا کام کرتا تھا اور وہ غلام عامی تھا جو پڑھنا لکھنا جانتا تھا اسی نے محمدؐ کو یہ قرآن سکھایا ہے۔ انہوں نے یہ فرض کیا کہ یہ قرآن اسی کی ساخت ہے لیکن ان کے اس مفروضہ کو قرآن نے صریح طور پر رد کیا اور اس الزام کے رد میں سورۂ نحل کی آیت نمبر ۱۰۳ نازل ہوئی:

﴿ولقد نعلم انهم یقولون انما یعلمه بشر لسان الذی یلحدون الیه اعجمی وھٰذا لسان عربی مبین﴾ ''اور ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ مشرکین یہ کہتے ہیں کہ انھیں کوئی انسان اس قرآن کی تعلیم دے رہا ہے حالانکہ جس کی طرف یہ نسبت دیتے ہیں وہ عجمی ہے اور یہ زبان عربی واضح و فصیح ہے''۔

۳۔ یہ قرآن جو اپنی نظر ماضی کے دور مجہول تک رکھے ہوئے ہے اور مستقبل میں بھی اسی طریقہ سے دور تک نظر رکھے ہوئے ہے یہ قرآن جو گزشتہ اقوام کے بہترین قصے بیان کرتا ہے اور یہ قصے اپنے اندر وعظ و نصیحت سے بھرے ہوئے ہیں اور بھی حقائق اس میں موجود ہیں جو ان تمام حوادث کے بارے میں بھی خبر دیتے ہیں کہ گویا ان حوادث کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو یا خود وہیں موجود رہے ہوں یا ان کے وقوع پذیر ہونے کے زمانے میں زندگی گزاری ہو:

﴿تلک من انبآء الغیب نوحیھآ الیک ماکنت تعلمھآ انت ولا قومک من قبل ھٰذا فاصبر انّ العاقبة للمتّقین﴾

''پیغمبر یہ غیب کی خبریں ہیں جنکی ہم آپ کی طرف وحی کر رہے ہیں جنکا علم نہ آپ کو تھا اور نہ آپ کی قوم کو لہٰذا آپ صبر کریں کہ انجام صاحبان تقویٰ کے ہاتھ میں ہے'' (ہود/۴۹)

﴿وما کنت بجانب الغربی اذ قضینآ الٰی موسی الأمر وما کنت من الشاھدین. ولٰکنآ انشأنا قرونا فتطاول علیھم العمر وما کنت ثاویاً فیٓ اھل مدین تتلوا علیھم اٰیٰتنا ولٰکنا کنا مرسلین﴾ ''اور آپ اس وقت طور کے مغربی رخ پر نہ تھے جب ہم نے موسیٰ کی طرف اپنا حکم بھیجا اور آپ اس واقعہ کے حاضرین میں سے بھی نہیں تھے۔ لیکن ہم نے بہت سی قوموں کو پیدا کیا پھر ان پر ایک طویل زمانہ گزر گیا اور آپ تو اہل مدین میں بھی مقیم نہیں تھے کہ انہیں ہماری آیتیں پڑھ کر سناتے تھے لیکن ہم رسول بنانے والے تو تھے'' (قصص/۴۴/۴۵)

﴿ذٰلک من انبآء الغیب نوحیه الیک وما کنت لدیھم اذ یلقون اقلامھم

ایھم یکفل مریم وما کنت لدیھم اذ یختصمون﴾ ''پیغمبر یہ غیب کی خبریں ہیں جنکی وحی ہم آپ کی طرف کر رہے ہیں اور آپ تو ان کے پاس نہیں تھے جب وہ قرعہ ڈال رہے تھے کہ مریم کی کفالت کون کرے گا اور آپ ان کے پاس نہیں تھے جب وہ اس موضوع پر جھگڑا کر رہے تھے'' (آل عمران/۴۴)

قرآن نے ان آیات میں ان تمام حوادث کو اپنے اندر لئے ہوئے اور ماضی مجہول پر احاطہ کئے ہوئے قانون طبیعی کو چیلنج کیا ہے۔ قانون طبیعی کی رو سے یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص ایک کتاب میں بہت پرانے ماضی کی خبریں نقل کرے کہ جس معاشرے میں اس نے نہ زندگی گزاری ہو اور نہ ہی اسے دیکھا ہو۔

مشرکین کو اس چیلنج کا بھی احساس ہوا تھا۔ سورۂ فرقان کی آیت نمبر ۵ میں ہے:

﴿وقالوآ اساطیر الاولین اکتتبھا فھی تملٰی علیه بکرةً وّاصیلاً﴾ ''اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو صرف اگلے لوگوں کے افسانے ہیں جسے انہوں نے لکھوا لیا ہے اور وہی صبح شام ان کے سامنے پڑھے جاتے ہیں''۔

حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان لوگوں کے لئے معانی سے بھرے ہوئے چیلنج تھے آپؐ کو مکہ میں رہتے ہوئے گزشتہ اقوام کی کہانیاں پڑھنے کا موقع نہیں ملا کتب انجیل و توریت پڑھنے کا بھی موقع نہیں ملا اور اس سرزمین مکہ سے صرف دو دفعہ باہر نکلے اور ان دونوں ہی دفعہ شام کی طرف گئے تھے۔ ایک دفعہ جب آپؐ ابھی بچے تھے اور اپنے چچا کے ساتھ تھے اس سفر میں آپؐ بحیرہ نامی عرب کے راہب سے ملے اس وقت آپؐ ۹ سال کے تھے۔ راہب نے آپؐ کے چچا سے کہا تمہارے اس بھائی کے بیٹے کے لئے بہت بڑی شان و مقام ہے (بحار: ج۳۵، ص۱۳۹)۔ دوسری مرتبہ حضرت خدیجہ کے تجارتی مال کے ساتھ گئے۔ اس وقت آپؐ جوان تھے۔ حضرت خدیجہ کا غلام میسرہ آپکے ساتھ تھا۔ ان دونوں مختصر مدت کے سفر کے علاوہ آپ نے اس شہر کی حدود سے آگے کچھ نہیں دیکھا۔ پھر کون آیا جس نے نبی اکرمؐ کو تورات پڑھایا یا انھوں نے گزشتہ زمانے کے قصّوں

کوسنایا۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم میں جتنے قصّے ذکر ہوئے ہیں وہ عہد قدیم کے قصّے ہیں اور یہ خود قرآن کی چیلنج کی تاکید ہے اور یہ اپنے اعجاز کو واضح انداز میں بیان کرتا ہے کیونکہ قرآن توریت کی تحریف کے بارے میں کہتا ہے کہ اس نے قصص انبیاء واحادیث کو توڑ موڑ کر بیان کیا ہے ۔گزشتہ اقوام کی کہانیوں اور خرافات اور افسانوں سے پُر ہے اور انبیاء کی اہانت والی باتیں نقل کی ہیں ۔ یہ قصہ تبلیغ ودعوت کے اہداف سے دور ہے جبکہ گزشتہ اقوام کے قصّے جو قرآن میں ذکر ہوئے ہیں وہ پاک وصاف بیان کئے گئے ہیں اور اس میں اس پہلو کا خیال رکھا گیا ہے جو تبلیغی اہداف کے پورے ہونے کے ساتھ ساتھ وعظ وعبرت بھی ہے نہ صرف معلومات کو جمع کیا ہے۔

جس طرح قرآن نے ماضی کا احاطہ کیا اسی طرح مستقبل کی بھی بہت سے خبروں سے پردہ اٹھایا ہے اور وہ واقعات اسی طرح وقوع پذیر ہوئے جس طرح محمدؐ نے خبر دی تھی اور انھیں مشرکین نے دیکھ لیا۔ان میں ایک نمونہ قرآن کا یہ خبر دینا ہے کہ روم کا ایران پر چند سالوں میں غلبہ ہوجائیگا فرمایا:

﴿غلبت الروم.فیٓ ادنی الارض وهم من بعدغلبهم سيغلبون.فی بضع سنين لله الامرمن قبل ومن بعدويومئذٍيفرح المؤمنون﴾ ’’روم والے مغلوب ہوگئے ۔قریب ترین علاقہ میں لیکن یہ مغلوب ہونے کے بعد عنقریب پھر غالب ہوجائیں گے چند سال کے اندر،اللہ ہی کے لئے اول وآخر ہر زمانہ کا اختیار ہے اور اس دن صاحبان ایمان خوشی منائیں گے‘‘ (روم/۲تا۴)

قرآن نے یہ خبر اس وقت دی جب ایران کے ہاتھوں روم بری طرح شکست کھاچکا تھا۔اور فارس نے عجیب محیّر العقول انداز میں روم پر غلبہ حاصل کیا اور مشرکین اس سے خوش تھے کیونکہ وہ لوگ اس میں بت پرستی اور شرک کو آسمانی دین پر غلبہ سمجھتے تھے اس لحاظ سے کہ فارس والے جو کامیاب ہور ہے تھے بت پرست تھے اور اہل روم نصاریٰ تھے۔

قرآن نے روم کو مستقبل قریب میں فتح ملنے کی خبر دی آیا ایسی خبر کسی کتاب میں ملنا ممکن ہے کہ جو خدا کی طرف سے نازل نہ ہوئی ہو اس طرح کے ایک غیبی خبر پر تاکید کریں اور ایک مجہول غیب کی خبر دے کر اپنی کرامت کو اس سے مربوط کیا ہے (یعنی اگر وہ بات صحیح نہ ہو تو اس کی کرامت چلی جائے گی)اور اس نے اپنے مستقبل کو ایسے خطرہ میں ڈالا ہے اگر جو خبر دیا گیا ہے وہ جھوٹ ثابت ہو تو اس کی عزت ومقام بھی چلی جائے گی۔

اس طرح ہم قرآن کریم کو ماضی اور مستقبل دونوں کو برابر چیلنج کرتے ہوئے دیکھتے ہیں جو اطمینان اور یقین کے ساتھ گفتگو کرتا ہے کہ جس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی اور ایسا نہ کسی انسان سے ممکن ہے اور نہ کسی انسان کے قوانین طبیعی کے مطابق لکھی ہوئی کتاب سے ۔

تفسیر:۔

تفسیر کا لغوی معنٰی

تفسیر لغت میں کسی لفظ کے معنٰی بیان کرنے اور اس کے ابہام سے پردہ ہٹانے کو کہتے ہیں قرآن کریم میں بھی اسی معنٰی میں آیا ہے:

﴿ولایاتونک بمثلٍ الاجئناک بالحق واحسن تفسیرًا﴾ ’’اور یہ لوگ کوئی بھی مثال نہ لائیں گے مگر یہ کہ ہم اس کے جواب میں حق اور بہترین بیان لے آئیں گے‘‘ (فرقان/۳۳)

پس کلام کی تفسیر کا معنی یہ ہے کہ کسی کلام کی دلیل کو کشف کرے اور جس معنٰی کی طرف لفظ اشارہ کرتا ہے اسے بیان کرے۔

تفسیر کے معنٰی بیان کرنے کے بعد اسی بنیاد پر ہم یہ سوال کرسکتے ہیں آیا لفظ کا ظاہری معنٰی جو اس لفظ سے ذہن میں آتا ہے اسے تفسیر کہتے ہیں یا نہیں کہہ سکتے اور اس لحاظ سے لغوی معنی پر تفسیر صدق آسکتا ہے یا نہیں؟

یہاں دو رخ ہے۔تفسیر کے معنٰی میں ہم نے کشف وبیان کا ذکر کیا ہے جس سے ازخود نتیجہ نکلتا ہے کہ اس لفظ میں ایک معنی پوشیدہ اور ابہام پایا جاتا ہے۔تفسیر کے ذریعے

اس ابہام اور پیچیدگی کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔اس لحاظ سے تفسیر وہاں پر صدق آتی ہے جہاں لفظ میں ابہام وخِفا ہو۔اگر کسی نے کوئی کلام سنا اور اس کے لئے ایک ظاہری معنٰی ہو جو اس کلام سے ذہن میں متبادر ہوتا ہے تو وہ اس ظاہری معنٰی کا اظہار کرتا ہے اور ظاہری معنٰی کے بیان کرنے کو تفسیر نہیں کہیں گے کیونکہ وہ ایک مخفی چیز سے کشف نہیں کیا ہے بلکہ تفسیر وہاں پر صادق آتی ہے جہاں انسان لفظ کے اندر پوشیدہ اور پیچیدہ معنٰی کو کشف کرنے کے لئے کوئی کوشش کرے۔دوسرے الفاظ میں یوں کہیں گے کہ جس نے لفظ کا معنٰی ظاہر کیا اس نے اس کی تفسیر کی لیکن اگر کوئی معنی از خود ظاہر ہو اور طبیعی طور پر اس سے یہ معنی متبادر ہوتا ہو تو وہاں نہ اظہار ہے اور نہ ہی تفسیر۔

اس نظریہ کے تحت تفسیر اسے کہتے ہیں جو لفظ میں موجود ایک احتمال کو ظاہر کرے۔
اور یہ ثابت کرے کہ لفظ سے مراد یہی معنی ہے۔یا تفسیر سے مراد یہ ہے کہ وہ معنٰی جو لفظ سے ذہن میں منتقل نہیں ہوتا ہے اس کا اظہار کریں اور یہ ثابت کریں کہ اس لفظ سے مراد یہی معنی ہے نہ کہ وہ معنی جو اس سے ذہن میں منتقل ہوتا ہے، لیکن لفظ کے ظاہر سے ذہن میں آنے والے معنٰی کے بیان کرنے کو تفسیر نہیں کہتے۔

یہ نظریہ عام علماءِ اصول نے اپنایا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات لفظ کے ظاہری معنی کا بیان بھی تفسیر ہے اور یہ ایک مخفی کو اظہار کرنا ہوگا جس طرح دیگر بعض حالات میں اسے تفسیر نہیں کہتے ہیں کیونکہ یہاں کوئی خِفا وابہام نہیں ہے جب خِفا وابہام نہیں تو وہاں نہ کوئی خِفا وابہام کا ازالہ ہے اور نہ اظہار۔

ظہور کسے کہتے ہیں

ظہور کے موارد کو جاننے کیلئے کہ کہاں تفسیر صدق آتا ہے اور وہ موارد جہاں تفسیر کہنا صدق نہیں آتا ہے ہم خود ظہور کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:

۱۔ظہور بسیط: ظہور بسیط اس ظہور کو کہتے ہیں جو ایک مستقل ظہور ہے کسی اور

ظہور سے ملا ہوا نہیں ہے۔

۲۔ظہور معقد: ظہور کا دوسرا مفہوم ظہور معقد ہے جو اس ظہور کو کہتے ہیں جو چند کلموں کے ظہور سے مرکب ہوا ہو۔

اس تقسیم کو واضح کرنے کے لئے ہم آپ کی خدمت میں ایک مثال پیش کرتے ہیں۔اگر کوئی شخص اپنے بیٹے سے کہے ﴿**اذهب الی البحر فی کل یوم**﴾ ''ہر روز دریا کی طرف جاؤ'' یا یہ کہے: ﴿**اذهب الی البحر فی کل یوم و استمع الی کلامه**﴾ ''یعنی ہر روز دریا کی طرف جاؤ اور اس کا کلام سنو'' یہ جو پہلا کلمہ کہا ہے جس سے جو معنٰی سمجھ میں آتا ہے اسے ظہور بسیط کہتے ہیں کیونکہ اس کلام میں لفظ سے ایک ہی صورت ذہن میں منتقل ہوتی ہے یعنی بحر سے مراد پانی ہے باپ بیٹے سے کہتا ہے کہ ''ہر دن دریا کی طرف جاؤ''، لیکن دوسرے جملہ میں ﴿**اذهب الی البحر فی کل یومٍ و استمع الی کلامه**﴾ ''یعنی ہر روز دریا کی طرف جاؤ اور اس کا کلام سنو'' یہاں ہر کلام معقد ہے کیونکہ یہاں مرکب ہے یہاں وہی پہلے والا ظہور ہے۔کلمہ بحر سے ذہن میں جو معنٰی سمجھ میں آتا ہے وہ ﴿**بحر من الماء**﴾ ہے بیٹا ہر روز وہاں جائے گا لیکن اس کے ساتھ ایک اور ظہور ملا ہوا ہے وہ بحر کے کلام کو سننا ہے یہاں سے جو معنٰی ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں بحر سے مراد پانی کا بحر نہیں بلکہ یہاں بحر سے مراد علم کا بحر ہے کیونکہ پانی کے بحر کے کلام کو سنا نہیں جاتا کیونکہ اس کے لئے کوئی کلام نہیں بلکہ اس کی موجوں کی آواز کو سنتے ہیں۔

اس طرح ہمیں اس حالت میں دو متعارض ظہور بسیط کا سامنا ہے۔جب ہم ان دو متعارض ظہور کو ایک دوسرے سے ملا کر پڑھتے ہیں تو وہاں دونوں کی مرکب حالت کو ذہن میں رکھ کر معنٰی لینے کی ضرورت ہے۔ان دونوں کے درمیان داخلی تناقضات ختم کرنے کے بعد ہی ظہور پیدا ہوتا ہے اور یہی پیدا ہونے والا ظہور معقد یا ظہور مرکب کہلاتا ہے۔

اب جب ہم نے ظہور بسیط اور ظہور مرکب میں فرق معلوم کر لیا تو ہمارے لئے ممکن ہے کہ ہم ظہور معقد کو واضح کرسکیں اور کلام کے معنی کو اس کی بنیاد پر معین کریں یہی

تفسیر ہے کیونکہ اس معقد اور مرکب ہونے کی وجہ سے اس کلام میں پیچیدگی اور خفاء پیدا ہوئی ہے جس کی کشف اور ظاہر کرنے کی ضرورت ہے لہٰذا یہاں پر ''تفسیر'' صدق آتا ہے لیکن جہاں ظہور بسیط ہے وہاں پر ظہور کے ذریعے کلام کے معنٰی اظہار کرنے کو تفسیر نہیں کہتے کیونکہ وہاں معنی ظاہر ہے اور کسی اظہار کی ضرورت نہیں ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ظہور کے موارد میں معنی کے بیان پر تفسیر صدق آنے کیلئے دو پہلو پائے جاتے ہیں:

(۱) کہتے ہیں کہ کلی طور پر تفسیر صدق نہیں آتا چاہے ظہور بسیط ہو یا مرکب ہو۔

(۲) ''یہ صحیح پہلو ہے'' کہتے ہیں کہ ظہور معقد کے موارد میں معنی بیان کرنے پر یہ تفسیر صدق آتا ہے لیکن ظہور بسیط کے بعض موارد پر تفسیر صدق نہیں آتا۔

۲۔ تفسیر ایک معنائے اضافی ہے یا موضوعی:

اس صحیح پہلو کی روشنی میں ہم نے یہ جان لیا کہ تفسیر اپنی جگہ ایک معنا اضافی ہے کیونکہ حتیٰ کہ ظہور لفظ کے موارد میں بھی تفسیر، لفظ کے معنٰی کو واضح و بیان کرنے کو کہتے ہیں ایک شخص کی نسبت کبھی ایک معنی بیان اور کشف کرنے کے محتاج ہوتے ہیں لیکن دوسرے شخص کی نسبت یہی معنی بیان اور کشف کی ضرورت نہیں رکھتے تو یہاں بیان اس شخص کی نسبت جسے بیان کی ضرورت تھی تفسیر ہوگا لیکن دوسرے کے لئے نہیں۔

اگر ہم دوسرے پہلو کو لے لیں کہ جہاں پر یہ بتایا تھا کہ لفظ کے اپنے معنی پر حمل کرنے کو تفسیر نہیں کہا جاتا اس کا ظہور کتنا ہی پیچیدہ کیوں ہو یہ تقسیم وہاں سے مختص ہے جہاں لفظ اس چیز پر حمل ہو جائے جو لفظ سے ظاہر نہ ہوتا ہو تو اس طرح ھم تفسیر کے لئے ایک کلی ضابطہ تصور کر سکتے ہیں کہ جو افراد کے اختلاف سے مختلف نہیں ہوتا کیونکہ ھم یہاں خود لفظ کو ملاحظہ کرتے ہیں۔ اگر وہ معنی جو لفظ کے لئے ذکر ہوا ہے وہی معنی ہو جو اس کے استعمال لغوی کے معنی ہو تو یہ تفسیر نہیں ہوگی اگر چہ اس میں بعض لوگوں کے لئے اخفاء و اغماض ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر وہ ذکر شدہ معنی کوئی اور معنی ہو جو لغوی استعمال کی طبعیت سے

مختلف ہو بلکہ اس کو باہر کی کسی دلیل سے لیا گیا ہو تو یہ تفسیر ہوگی۔

تفسیر لفظ و تفسیر معنی:

جس چیز کی تفسیر کی جاتی ہے اس لحاظ سے اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ تفسیر لفظ ۲۔ تفسیر معنی۔

تفسیر لفظ لغت کے معنی بیان کرنے کو کہتے ہیں جبکہ تفسیر معنی اس کی مصداق خارجی کا تعین کرنے کو کہتے ہیں جس پر یہ معنی تطبیق ہوتا ہے۔

جب آپ کسی شخص کو یہ کہتے ہوئے سنتے ہیں کہ کفر کی عالمی استعماری حکومتیں بڑے اسلحہ کی مالک ہیں تو ایک دفعہ ہم اس انسان سے پوچھتے ہیں کہ اسلحہ کسے کہتے ہیں؟ وہ جواب میں کہتا ہے کہ اسلحہ وہ چیز ہے جس سے انسان اپنے دشمن کو دبانے اور مغلوب کرنے کیلئے استعمال کرتا ہے۔ ایک دفعہ ہم پوچھتے ہیں کہ وہ کس قسم کا اسلحہ ہے جو ان ملکوں کے ہاتھوں میں ہے؟ تو جواب میں کہتا ہے کہ وہ ایٹم بم ہے۔

تو پہلے سوال کے جواب میں ہم نے لفظ کا تفسیر کیا کیونکہ ہم نے اس لفظ کے لغوی معنی کو بیان کیا۔ دوسرے سوال کے جواب میں ہم نے معنی کی تفسیر کیا یعنی ہم نے مصداق کا تعین کیا اور یہ جملہ جس پر تطبیق ہوتا ہے اس کی طرف اشارہ کیا۔ پہلے مرحلہ کو تفسیر لفظ اور تفسیر لغوی نام رکھا ہے اور یہ مفاہیم کے معیّن کرنے کا مرحلہ ہے اور دوسرے مرحلہ کو ہم نے تفسیر معنی نام رکھا ہے اور یہ وہ مرحلہ ہے کہ جہاں یہ مفاہیم ایک معین اور محدود صورتوں میں مجسم ہوتے ہیں۔ اس بارے میں قرآن کریم میں بہت ساری مثالیں پائی جاتی ہیں۔ ہم قرآن میں دیکھتے ہیں کہ خدا کی صفات میں سے حیات، علم، قدرت، سمع، بصر اور کلام......وغیرہ ہیں۔ ان کلمات کے بارے میں دو قسم کے سوال یا بحث کا سامنا ہے:

۱۔ ان کلمات کے لغوی معنی بیان کرتے ہیں جیسے حیات کا معنی کیا ہے یا علم کا معنی کیا ہے وغیرہ۔

۲۔ خدا کی طرف نسبت دی گئی مفاہیم کے معنی اور مصداق کا تعین کرنا ہے یعنی خدا کیسے سنتا ہے؟ کسی عضو کے ذریعہ سنتا ہے؟ یا بغیر اعضاء کے؟ یا خدا کیسے جانتا ہے؟ کیا خدا کا علم اس کی ذات پر زائد ہے؟......

تو پہلے سوال کا جواب آیت کی تفسیر لفظی ہے یا تفسیر لفظ ہے اور دوسرے سوال کا جواب تفسیر معنوی یا تفسیر معنی کا نمونہ ہے اس مثال کا ایک نمونہ ان آیات کریمہ میں ہیں:

﴿وھٰذا کتابٌ انزلناہ مبارکٌ مصدّق الّذی بین یدیہ﴾ ''اور یہ کتاب بھی جو بڑی بابرکت ہے ہم نے نازل کی ہے جو اس سے پہلے آنے والی کی تصدیق کرتی ہے'' (انعام/۹۳)

﴿وانزلنا الحدید فیہ باسٌ شدیدٌ﴾ ''اور ہم نے لوہا اتارا جس میں شدید طاقت ہے'' (حدید/۲۵)

﴿وانزلنا من السّمآء مآءً بقدرٍ فاسکنّاہ فی الارض﴾ ''اور ہم نے آسمان سے ایک خاص مقدار میں پانی برسایا پھر اسے زمین میں ہم نے ٹھہرایا'' (مومنون/۱۸)

ہم دیکھتے ہیں کہ ان آیات میں چند چیزوں نازل ہونے کے بارے میں بحث کی گئی ہے'' کتاب''، ''حدید''، ''ماء'' ان آیات میں تفسیر لفظ یہ ہے کہ ہم نزول کے معنی کا لغت کے لحاظ سے تشریح کریں کہ ''نزول'' کسے کہتے ہیں پھر لفظ ''انزلنا'' کے مفہوم کا تعین کریں کہ یہ لفظ ان تینوں آیات میں ذکر ہوا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ لفظ ''انزلنا'' میں یہ معنی چھپے ہوئے ہیں کہ انزلنا (یعنی کس بلندی سے اترنا ہے) اس میں تفسیر معنی یہ ہے کہ ہم اس ''انزال'' کی حقیقت کو سمجھے اور اس بلندی کی نوعیت کو سمجھے کہ جہاں سے کتاب، حدید، ماء نازل ہوئے ہیں ان میں بلندی سے مراد مادّی بلندی ہے یا معنوی؟۔

تفسیر لفظی اور معنوی میں فرق رکھنے کی ضرورت

تفسیر لفظ مفاہیم کی حد تک اور تفسیر معنی مصادیق تک محدود رکھنا، ان دونوں میں فرق ہے اور یہ تفسیر قرآن میں ایک ابتدائی اور بنیادی نقطہ ہے اور قرآن کریم کی دو حقیقتوں

کے درمیان ظاہری تناقض کا یہ واحد حل ہے یہ دو حقیقتیں ہیں:

۱۔ قرآن بشریت کیلئے ایک کتاب هدایت ہے۔ خداوند عالم نے بشریت کو ظلمتوں سے نور کی طرف نکالنے کیلئے اسے نازل کیا اور اسکی زندگی کے مختلف شعبوں میں بہتر راہنمائی کیلئے اسے نازل کیا اور قرآن نے اپنی توصیف کچھ ان الفاظ میں کی ہے:

﴿...... ھدًی للّناس......﴾ (بقرہ/۱۸۵)

﴿......نورٌ و کتابٌ مّبین﴾ (مائدہ/۱۵)

﴿......تبیاناً لکلّ شئٍ......﴾ (نحل/۸۹)

یہ وہ حقیقت ہے جسکے تحت یہ تسلیم وقبول کرنا پڑے گا کہ قرآن لوگوں کے فہم کے مطابق ہے۔ ہر انسان کیلئے اس کا معنی سمجھنا ممکن ہے اور اسی کے تحت قرآن اپنے اهداف کو حاصل کرسکتا اور اپنا پیغام پہنچا سکتا ہے کیونکہ اگر لوگ سمجھ نہ سکے تو یہ اہداف ومقاصد حاصل نہیں ہوسکتے۔

۲۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ بہت سے ایسے موضوع ہیں جو قرآن نے اٹھائے ہیں یا انکی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن ان موضوعات کا سمجھنا آسان نہیں ہے بلکہ ذہن بشری کیلئے اسکا سمجھنا مشکل ہے۔ میدان فکر میں دقت، عادی اور تجرباتی زندگی سے دور ہونے کی وجہ سے انسان ان موضوعات میں سرگرداں ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم کی وہ آیات جن میں لوح وقلم، عرش ومیزان، شیطان، لوہے کا نازل ہونا، بشر کا دوبارہ خدا کی طرف پلٹ کر جانا، خدا کے خزانے، آسمان وزمین کی حقیقت جیسے مفاہیم ہیں جو عام انسان کیلئے سمجھنا آسان نہیں ہیں۔

پس ان دو حقیقتوں کو سامنے رکھتے ہوئے قرآن کے اہداف اور اسکے پیغام کا تقاضا یہ ہے کہ قرآن کے بعض حصے قابل فہم ہیں اور بعض حصے مشکل اور حیران کن ہیں۔

ان دو حقیقتوں کے درمیان موجود تناقض کا حل صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم لفظ کی تفسیر کرنے اور معنی کی تفسیر کرنے میں تمیز پیدا کریں۔ پہلی حقیقت کی روشنی میں نزول قرآن کے اہداف ومقاصد اور اسکی رسالت کا تقاضا یہ ہے کہ قرآن ایک کلام ہے جو

معنی رکھتا ہے اور اسے عام فہم ہونا چاہیئے ۔ لہٰذا اسکے تحت قرآن سب کیلئے قابل فہم ہے لوگوں کیلئے اسکے معنی والفاظ سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہے ۔لیکن مشکل اسکے حقیقی اور واقعی معنی کے تعین کی حدود میں ہے۔

یہ جو موضوعات ہم نے دوسری حقیقت میں بیان کیے ہیں یہ لغوی حوالے سے واضح ہیں،لغت کے حوالے سے ان کلمات میں کوئی مشکل نہیں ہے بلکہ مشکل لفظ کے معنی کی تفسیر میں موجود ہے نہ کہ خود لفظ کی تفسیر میں ۔ کیونکہ یہ موضوعات ایک ایسے عالم سے مربوط ہیں جو انسان کی زندگی اور اس عالم محسوسات سے بالا ہیں ۔لہٰذا اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان کو انکے مصادیق سمجھنے یا معنی کے حدود کا تعین کرنے میں مشکل پیش آئے گی ۔اور انکے مفہوم کو ایک خاص مفہوم میں تعین کرنا مشکل ہوگا۔

یہاں ایک سوال پیش آتا ہے کہ وہ کونسی ضرورت ہے جسکے تحت قرآن نے ایسے موضوعات کو پیش کیا ہے جس کے سمجھنے انسانی ذہن قاصر ہے اور انھیں سمجھنے میں اسے مشکل پیش آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن ان مشکلات سے دستبردار نہیں ہوسکتا۔ بلکہ ان مشکلات کا خود اپنی جگہ ایک فلسفہ ہے کیونکہ قرآن کا کتاب دین ہونے کے حوالے سے اسکا بنیادی مقصد انسان کو عالم غیب سے ربط دینا ہے۔قرآن انسان کے اندر ایمان بالغیب کا شعور دینے کیلئے آیا ہے اور انسان کے اندران موضوعات کے بغیر ایمان بالغیب نمو نہیں پا سکتا۔انسان کو ان موضوعات کی طرف متوجہ کرنے کا مقصد انسان کو اس عالم سے ہٹ کر ایک بڑے عالم سے مربوط کرنا ہے گرچہ وہ اُس عالم کے حقائق اور خصوصیات پر احاطہ کرنے سے عاجز ہی کیوں نہ ہو۔

تاویل

قرآنی ابحاث میں مفسرین کے نزدیک کلمہ تفسیر کے ساتھ منظر شہود پر آنے والا یہ دوسرا کلمہ ہے۔ انہوں نے اس کلمہ کی تعبیر کچھ یوں کی ہے :یہ کلمہ معنٰی کے لحاظ سے کلمہ تفسیر سے صورت جوہریہ میں متفق ہے۔ پس یہ دونوں کلمے لفظ کے معنٰی بیان کرنے اورابہام کو کشف کرنے پر دلالت کرتے ہیں۔صاحب قاموس نے کہا ہے:

﴿**اوّل الکلام تاویلاً**﴾ یعنی کلمہ کے پیچھے گیا اس کا اندازہ کیا اور اس کی وضاحت کی۔

وہ مفسرین کرام جو عمومی طور پر ان دونوں کلمہ کے توافق ہونے پر اتفاق رائے رکھتے ہیں۔ دونوں کلموں کی تطبیق کے لحاظ سے ان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ہم یہاں پر اس بارے میں کچھ نظریات کا ذکر کریں گے:

(۱) مفسرین قدما کے نزدیک عام رجحان یہ ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے مترادف ہیں پس تفسیر تاویل ہے اور اس کا برعکس بھی صحیح ہے اس بنا پر ان دونوں میں نسبت تساوی ہے۔شاید مجاہد کا قول انہی میں سے ہو:''علماء تاویل قرآن کا علم رکھتے ہیں'' اور ابن جریر طبری کا اپنے تفسیر میں یہ قول:﴿**القول فی تأویل قوله کذا......**﴾ یا ان کا یہ قول :''اہل تأویل نے اس آیت کے بارے میں اختلاف کیا ہے'' پس ان کے نزدیک تفسیر اور تأویل ایک ہی معنٰی میں ہے۔

(۲) دوسرا رجحان ان مفسرین کا ہے جو متأخرین میں سے ہیں ان کے نظر میں بعض شرائط میں تأویل تفسیر سے مختلف ہیں یہ اختلافات یا مفسر اور تأویل کنندہ کے ذوق کی وجہ سے ہے یا اس حکم کے حوالے سے ہیں جسے مفسر یا مؤول صادر کرتے ہیں یا اس دلیل کے حوالہ سے ہیں جس پر مفسر اور مؤول نے اعتماد کیا ہے پس یہاں پر مختلف نظریات کے حامل گروہ ہیں ہم ان میں سے تین کو یہاں پر ذکر کریں گے:

ا۔ مفسر کے میدان طبیعت کے حوالے سے تفسیر اور تأویل میں فرق رکھنا۔اس فکر کے حامل افراد کی فکر کی بنیاد یہ ہے کہ تفسیر اور تأویل میں اختلاف عموم وخصوص ہے پس

تاویل ہراس کلام کی نسبت میں صدق آتا ہے جس کا کوئی ظاہری معنٰی ہو اور آپ اس کو اس کے علاوہ کسی اور معنٰی پر حمل کریں تو یہ حمل تأویل ہے جبکہ تفسیر اس سے اعم ہے تفسیر کا معنٰی لفظ کے مدلول کو بیان کرنا ہے چاہے ظاہری معنٰی کو بیان کریں یا خلاف ظاہر معنی کو بیان کریں۔

۲۔ نوع حکم کے حوالہ سے تفسیر اور تأویل میں فرق پایا جاتا ہے اس قول کی بنیاد یہ ہے کہ تفسیر اور تأویل آپس میں ایک دوسرے کے متباین ہیں کیونکہ تفسیر یہ ہے کہ جس سے قطع اور یقین پیدا ہوتا ہے کہ خداوند عالم کی مراد یہی ہے جبکہ تأویل یہ ہے کہ اس کے احتمالات میں سے ایک کو بغیر قطع ویقین کے ترجیح دینا ہے۔ پس مفسر کے احکام قطعی ہوتے ہیں اور مؤول کے احکام ترجیحی ہوتے ہیں۔

۳۔ تفسیر اور تأویل کے طبیعت دلیل میں فرق: یہ نظریہ اس قول پر قائم ہے کہ تفسیر میں کسی شرعی دلیل پر اعتماد کر کے لفظ کے معنٰی بیان ہوتا ہے جبکہ تأویل کسی عقلی دلیل پر اعتماد کر کے لفظ کے معنٰی بیان کرنا ہے۔

تفسیر وتاویل کے فرق کے بارے ہمارا موقف

کلمہ تاویل کے معانی کا تعین اور اس کا کلمہ تفسیر کے ساتھ موازنہ اور مقابلہ میں بحث وگفتگو کی بہت گنجائش ہے۔ اگر ہم ان تمام وجوہات کو قبول کریں تو یہ بحث صرف علم تفسیر میں کلمہ تاویل کے اصطلاحی معنی کی تعریف کی حد تک محدود رہے گی کیونکہ وہ معانی مفسر کیلئے ایک ضرورت ہے ممکن ہے کہ وہ دونوں کیلئے کلمہ تاویل استعمال کرتا ہو۔ تاکہ ایک خاص مجال یا خاص درجہ کی طرف اشارہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں لیکن خطر وہاں پر ہے جہاں اصطلاحی معنی کو لفظ کا واحد معنی گردانتے اور اگر کسی نص شرعی میں یہ کلمہ استعمال ہو تو کلمہ تاویل کو اسی معنی میں استعمال کرے۔

ہم جب کلمہ تاویل اور اس کے استعمال کے مواقع کو قرآن میں دیکھتے ہیں تو ہمیں کوئی اور معنی ملتے ہیں جو اصطلاحی معنی جسے بمعنی تفسیر قرار دیا ہے سے مطابقت نہیں رکھتے

اور یہ تاویل تفسیر سے صرف چند حدود اور تفصیلات کے لحاظ سے مختلف ہے اور آپس میں فرق پایا جاتا ہے ہمیں کلمہ تاویل کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ اس کے معنائے اصطلاحی کے ساتھ اس کے وہ معنی کو بھی اٹھائیں جو قرآن میں آیا ہے یہ کلمہ قرآن کریم کے سات (۷) سوروں میں آیا ہے:

۱۔﴿ھو الذیٓ انزل علیک الکتاب منہ آیاتٌ محکماتٌ ھنّ امّ الکتاب واخر متشابھاتٌ فامّا الذین فی قلوبھم زیغٌ فیتّبعون ماتشابہ منہ ابتغآء الفتنۃ وابتغآء تأویلہ ومایعلم تأویلہ الّا اللّٰہ والرّاسخون فی العلم یقولون اٰمنّابہ کلٌّ مّن عند ربّنا ومایذّکّر الّا اولوا الالباب﴾ ''وہی ذات ہے جس نے آپ پر وہ کتاب نازل فرمائی جس کی بعض آیات محکم (واضح) ہیں وہی اصل کتاب ہے اور کچھ متشابہ ہیں۔ جنکے دلوں میں کجی ہے وہ فتنہ اور تاویل کی تلاش میں متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں جبکہ اسکی (حقیقی) تاویل تو صرف خدا اور علم میں راسخ مقام رکھنے والے ہی جانتے ہیں وہ کہتے ہیں: ہم اس پر ایمان لے آئے ہیں یہ سب کچھ ہمارے رب کی طرف سے ہے اور نصیحت تو صرف عقلمند ہی قبول کرتے ہیں'' (آل عمران/۷)

۲۔﴿یٰایّھا الّذین اٰمنوا اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرّسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیءٍ فردّوہ الی اللّٰہ والرّسول ان کنتم تؤمنون باللّٰہ والیوم الاٰخر ذالک خیرٌ وّاحسن تأویلاً﴾ ''ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو رسول اور صاحبان امر کی اطاعت کرو جو تمہیں میں سے ہیں پھر اگر آپس میں کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو اسے خدا اور رسول کی طرف پلٹا دو اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھنے والے ہو یہی تمہارے حق میں خیر اور انجام کے اعتبار سے بہترین بات ہے'' (نساء/۵۹)

۳۔﴿ولقد جئناھم بکتابٍ فصّلناہ علٰی علمٍ ھدًی وّرحمۃً لّقومٍ یّؤمنون﴾ ''ہم ان کے پاس ایسی کتاب لے آئے ہیں جسے علم واطلاع کے ساتھ مفصل

بیان کیا ہے اور وہ صاحبان ایمان کیلئے ہدایت اور رحمت ہے''(اعراف/۵۲)

۴۔﴿بلْ كذّبوُا بما لمْ يحيطوُا بعلْمهٖ ولمّا يأتهمْ تأويْله كذالك كذّب الّذيْن منْ قبْلهمْ فانْظرْ كيْف كان عاقبة الظّالميْن﴾''درحقیقت ان لوگوں نے اس چیز کی تکذیب کی ہے جس کا مکمل علم بھی نہیں ہے اور اس کی تاویل بھی ان کے پاس نہیں آئی ہے اس طرح ان کے پہلے والوں نے بھی تکذیب کی تھی اب دیکھو کہ ظلم کرنے والوں کا انجام کیا ہوتا ہے''(یونس/ ۳۹)

۵۔﴿وكذالك يجْتبيْك ربّك ويعلّمك منْ تأويل الْاحاديث ويتمّ نعمته عليْك وعلٰى اٰل يعْقوْب كمآ اتمّها علٰى ابويْك منْ قبْل ابراهيْمْ واسْحاق انّ ربّك عليْمٌ حكيْمٌ﴾''اور اسی طرح تمہارا پروردگار تمہیں منتخب کرے گا اور تمہیں باتوں کی تاویل سکھائے گا اور تم پر اور یعقوب کی دوسری اولاد پر اپنی نعمت کو تمام کرے گا جس طرح تمہارے دادا پردادا ابراہیم اور اسحاق پر تمام کر چکا ہے بے شک تمہارا پروردگار بڑا جاننے والا اور صاحب حکمت ہے''(یوسف/ ٦)

٦۔﴿واوْفوا الْكيْل اذا كلْتمْ وزنوْا بالْقسْطاس الْمسْتقيْم ذالك خيْرٌ وّاحسن تأويْلاً﴾''اور جب ناپو تو پورا ناپو اور جب تولو تو صحیح ترازو سے تولو کہ یہی بہتری اور بہترین انجام کا ذریعہ ہے''(اسراء/ ۳۵)

۷۔﴿قال هٰذا فراق بيني وبينك سانبّئك بتأوْيل ما لمْ تسْتطعْ عّليْه صبْرًا﴾''بندہ صالح نے کہا کہ یہ میرے اور تمہارے درمیان جدائی کا موقع ہے عنقریب میں تمہیں ان تمام باتوں کی تاویل بتادوں گا جن پر تم صبر نہیں کر سکے''(کہف/ ۷۸)

ان آیات کو ملاحظہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی میں بھی کلمہ تاویل تفسیر کے معنی میں نہیں آیا ہے اور لفظ کے مدلول کے بیان میں بھی نہیں آیا ہے اور نہ ہی یہ ممکن نظر آتا ہے کہ یہ کلمہ تفسیر کے معنی میں آیا ہو سوائے سورہ آل عمران آیت نمبر ے کے

کیونکہ اس میں تأویل کو آیات متشابہات کی طرف نسبت دیا ہے لہٰذا بہت سے مفسرین نے کہا ہے: کہ تأویل متشابہ آیت کی تفسیر کرنے اور لفظ کے مدلول کو بیان کرنے کا نام ہے تو یہ آیت اس چیز پر دلالت کرتی ہے کہ آیات متشابہات کی تفسیر جائز نہیں ہے۔اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قرآن کا ایک حصّہ فہم کیلئے ممکن نہیں اور وہ نہیں جانتا سوائے خدا اور راسخون فی العلم کے۔امّا جہاں عادی انسان کیلئے آیت کی فہم وتفسیر اور معنی کا ادراک میسر ہے وہ صرف آیات محکمہ ہیں۔

یہ وہی موقف ہے جو مفسرین نے اس آیت کے بارے میں انتخاب کیا ہے اور انھوں نے کلمہ تاویل کو ایک حوالے سے تفسیر کے معنوں میں استعمال کیا ہے چونکہ ان کا جھکاؤ کلمہ تاویل کی معنائے اصطلاحی کی طرف تھا لیکن ہم اس قسم کے موقف میں ہر چیز سے پہلے واجب سمجھتے ہیں کہ یہ واضح کریں کہ آیا معنائے اصطلاحی زمان نزول قرآن میں موجود تھا؟ آیا کلمہ تاویل اصطلاحی معنوں میں اس وقت استعمال ہوتا تھا؟۔صرف بعض مفسرین کا معنائے اصطلاحی کی طرف رجحان ہونا کافی نہیں ہے کہ ہم کلمہ تاویل کو اس معنی میں استعمال کریں۔

پہلی آیت کے علاوہ جتنے بھی آیات میں کلمہ تاویل استعمال ہوا ہے وہ دلالت کرتے ہیں کہ کلمہ تاویل قرآن کریم میں تفسیر کے علاوہ کسی اور معنی میں استعمال ہوا ہے ہمارے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے کہ یہ کلمہ قرآن کریم میں کسی بھی تفسیر کے معنی میں استعمال ہوا ہو۔وہ معنی جو ان آیات سے مناسبت رکھتے ہیں وہ کلمہ تاویل کا لغوی معنی ہے یعنی جائے برگشت کے لہٰذا لفظ تاویل کبھی اضافہ ہوا ہے خدا اور رسول کی طرف برگشت کا، کسی آیت میں کتاب کی طرف، کسی آیت میں خواب کی طرف، کسی آیت میں صحیح وزن کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے بلکہ احتمال قوی ہے کہ کلمہ تاویل سے مراد پہلی آیت میں جو آیات متشابہ کی طرف نسبت دی ہے یہی معنی مراد ہے۔یہاں آیات متشابہ کے تأویل سے مراد مدلول لفظ کے معنی بیان کرنا نہیں ہے اور نہ ہی تفسیر کے معنی میں بلکہ جس کی طرف

یہ معانی برگشت کرتے ہیں جب عقل کسی معنی کو کسی معین صورت میں محدود و مجسم اور صحیح تصوّر کرتی ہے تو وہ معنی عام ہوتا ہے پس یہ معین صورت اس عمومی معنی کی تاؑویل ہے۔ اس بنیاد پر اس آیت میں تاویل کا معنی وہی ہے جسے ہم نے تفسیر معنیٰ نام دیا ہے کیونکہ جن کے دلوں میں میل کچیل ہے وہ چاہتے ہیں کہ آیات متشابہ کی معین صورت کو فتنے کیلئے اٹھائیں کیونکہ بہت سی آیات متشابہات کے معانی عالم غیب سے تعلق رکھتے ہیں اور ان معانی کو محدود کرنا اور ایک خاص ذہنی صورت میں پیش کرنا باعث خطر اور فتنے کا سبب ہے۔ ہم اس سے دو نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں:

۱۔ قرآن کریم میں تاویل کا معنی یوں آیا ہے کہ جس کی طرف اس کا برگشت ہو تفسیر کے معنی میں نہیں ہے۔ اس معنی کو بیان کرنے کیلئے ہم نے کلمہ تفسیر لفظ کی جگہ پر تفسیر معنی کو استعمال کیا۔

۲۔ خدا اور راسخین علم کی خصوصیات میں ہے کہ وہ آیات متشابہ کا علم رکھتے ہیں۔ اس کا معنی یہ نہیں ہے کہ آیات متشابہ کا کوئی معنی نہیں اور خدا ہی لفظ کا معنی اور تفسیر جانتا ہے۔ بلکہ یوں ہے کہ یہ جس معنی کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس کے حدود و قیود پر احاطہ رکھتا ہے لیکن معنائے لفظ آیہ متشابہ کا سبب بنتا ہے کیونکہ قرآن کریم فرماتا ہے: جن کے دلوں میں مرض ہے وہ آیات متشابہ کی طرف جاتے ہیں۔ اگر لفظ کا کوئی معنی نہ ہو تو کلمہ کا اتباع صحیح نہیں۔ یہاں جب تک آیہ متشابہ ہے اسکی پیروی کرے۔ ضروری ہے کہ لفظ کیلئے معنی ہو اور یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ لفظ کیلئے معنی نہ ہو جبکہ یہ آیت قرآن کا جز ہے جسے خداوند عالم نے انسان کی ہدایت کیلئے نازل کیا ہے اور اس میں ہر چیز کا بیان موجود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تفسیر لفظ اور تفسیر معنیٰ میں تمیز نہ کر سکنے کی وجہ سے اس عقیدے پر منتہی ہوا ہے کہ تاویل کا علم خدا سے مخصوص ہے۔ یہاں نتیجہ اس بات پر پہنچتا ہے کہ بعض آیات کا کوئی معنی و مفہوم نہیں چونکہ اس کا تاؑویل خدا سے مختص ہے۔

ہم اگر تفسیر لفظ اور تفسیر معنی میں تمیز کرتے تو ہم یہ جان لیتے کہ جو چیز خدا سے

مخصوص ہے وہ تاویل آیات متشابہ ہیں یعنی آیات متشابہ کی تفسیر معنی معلوم نہیں نہ کہ تفسیر لفظی۔ اس طرح اس بیان کی روشنی میں ہمارے لئے ممکن ہے کہ کلمہ تاویل کے اصطلاحی معنی کے ساتھ اس کا ایک اور معنی کا بھی اضافہ کریں وہ تفسیر معنی لفظ ہے اور جس بات پر مفہوم عام نے احاطہ کیا ہے اور اسکی صورت مجسم ہو جاتی ہے۔

وہ شرائط جن کا ایک مفسر قرآن میں ہونا ضروری ہے

بہ حیثیت علم تفسیر کے اس میدان میں داخل ہونے سے پہلے ایک مفسر میں چند شرائط کا ہونا ضروری ہے۔ اور ان شرائط کے بغیر قرآن کریم کی بحث میں کامیاب ہونا ممکن نہیں اور مفسر اپنے اس عمل میں موفق اور کامیاب نہیں ہوسکتا۔ ہم ذیل کے چار نقاط میں ان شرائط کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:

۱۔ وہ مفسر جو قرآن کریم کو پڑھنا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلامی ذہنیّت سے اس کی تفسیر کرے۔ یعنی قرآن کی بحث و تفسیر کے دوران خود کو اسلامی دائرے میں رکھے اور اپنی بحث کو ہمیشہ اسی بنیاد پر قائم کرے کہ قرآن کتاب خدا ہے۔ خدا نے یہ کتاب انسان کی ہدایت اور جتنا ہو سکے اسے بہتر طریقہ سے انسانیت کے راستے پر گامزن کرنے کیلئے بھیجی ہے اور مفسر کے لئے ضروری ہے کہ وہ عوامل، اسباب اور شرائط کے آگے خاضع نہ ہو جائے کہ جہاں معرفت انسانی کے مختلف میدانوں میں نتائج فکری انہی کے آگے گھٹنا ٹیک دیتے ہیں کیونکہ یہی وہ واحد بنیاد ہے جس کے ذریعے قرآن کا سمجھنا اور اس کے ظواہر کی صحیح طریقہ سے تفسیر کرنا ممکن ہے۔ لیکن جب مفسر درس قرآن میں ان عادی اصولوں اور قواعد کو اپنائے گا جو کسی اور چیز کی طرف دعوت دینے والی کتاب یا بشری افکار کی کتاب کو پڑھتے وقت اپنائے جاتے ہیں تو یقیناً وہ بہت سی خطاؤں اور غلطیوں میں گر جائے گا اور اس سے غلط نتائج پیش کرے گا۔ چنانچہ بہت سے مستشرقین کی قرآنی بحث و گفتگو میں یہی چیزیں واقع ہوئی ہیں کیونکہ انھوں نے قرآن کریم کو ان افکار اور نظریات کی روشنی میں پڑھا ہے جسطرح معاشرہ کے دیگر حوادث اور واقعات کا مطالعہ کیا کرتے ہیں۔ اور وہ

خود کو معاشرہ پر اثر انداز ہونے والی چیزوں کے عوامل سے مربوط کرتے ہیں اور اس وجہ سے اس کی حالت بدل جاتی ہے۔

اس شرط کی ضرورت اس علم کی طبیعت کا تقاضا ہے کیونکہ وہ مفہوم جس کو مفسر نے قرآن کے بارے میں اپنے ذہن میں پیدا کیا ہے وہی قرآن کریم کی تفصیلات سمجھنے کے لئے بنیادی اصول ہے اور اس کی مختلف پہلوؤں کو پڑھنے کے لئے یہی بنیاد ہے لہٰذا ضروری ہے کہ تفسیر قرآن ایک صحیح مفہوم اور صحیح و سالم بنیاد پر ہو کہ وہ بنیاد اور قرآن کا مفہوم جو ذہن میں پیدا کیا ہے صحیح اسلامی فکر کے دائرے کے اندر ہو تا کہ آیات کی تفسیر و تحلیل کرتے وقت صحیح سمت کی طرف متوجہ رہے۔ لیکن اگر مفسر نے قرآن کی تفسیر کرتے وقت قرآن کے بارے میں اپنی فکر کو غلط اصول اور بنیاد پر رکھا تو بنیادی غلطی کا اثر اس کی تفصیلات پر پڑے گا اور اس سے تحلیل و تجزیہ اور جو نتیجہ اخذ ہو گا وہ غلط ہو گا۔

اس سلسلے میں ذیل میں ہم بعض مثالیں اور نمونے آپکی خدمت میں پیش کرتے ہیں جن میں ان دو قسم کے فکر رکھنے والے مفسرین کے درمیان فرق واضح و روشن ہو گا۔ یعنی ایک قرآن کریم کو کتاب ہدایت اور کتاب الٰہی کے عقیدے کے تحت پڑھنے والے اور دوسرا اس کتاب کو معاشرے میں دوسروں سے متاثر ہونے یا بیرونی عوامل و اسباب سے متاثر ہونے والی کتاب سمجھ کر پڑھنے والوں میں فرق نمایاں ہو گا اور یہ بھی واضح ہو گا کہ جس فکر کی بنیاد تفسیر کر رہے ہیں اس سے تفصیلات تجزیہ اور تحلیل کے طریقہ اور نتیجہ گیری میں وہ کیسے اثر انداز ہو گا؟۔

(الف) قرآن کریم میں پیغمبر اکرمؐ کی بعثت سے پہلے عرب میں رائج بعض عادات و رسومات اور سلوک کو باقی رکھا گیا ہے۔ اس حوالہ سے وہ افراد جنکی فکر ایک غلط نظریہ پر قائم ہے اور وہ انہی غلط اصولوں پر قرآن کی تفسیر کرنے کے عادی ہیں جن اصولوں کے تحت وہ زمین کی دوسری چیزوں کی تفسیر کرتے ہیں۔ وہ قرآن کے اس عمل یعنی بعض عادات و رسومات کو باقی رکھنے کے بارے میں یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ قرآن کے اس وقت

کے معاشرے سے متاثر ہونے کی علامت ہے۔ اگر ہم قرآن کریم کو کتاب خدا، انسانی ہدایت اور اسکی صحیح تعمیر کیلئے آنے والی کتاب کے نظریہ پر بات کریں اور اسے انسانیت کو اس کی پاک فطرت کی طرف پلٹانے اور اس کو اس کی حقیقی اہداف تک پہنچانے کے لئے آنے والی کتاب کے حوالہ سے بات کریں تو یہ جو تفسیر پہلے گروہ نے کی ہے اس کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا۔

بلکہ ہم اس صحیح اصول کی بنیاد پر کہ قرآن کریم کا ان رسومات کو باقی رکھنے کے صحیح مفہوم کو سمجھ سکیں گے۔ کیونکہ جو کتاب انسان کی ہدایت و راہنمائی کیلئے ہو ضروری نہیں وہ ان تمام رسومات و عادات جو اس سے پہلے تھے سب کو ختم کر دے اسکی کوئی منطق نہیں ہے۔ کیونکہ انسان جتنا بھی خراب ہو جائے جتنا اپنے فطرت سے منحرف ہو جائے جتنا اپنے بلند اھداف سے منحرف ہو جائے لیکن وہ پورے کا پورا فاسد نہیں ہوتا یعنی ہر لحاظ سے فاسد نہیں ہوتا بلکہ اسکی زندگی کے کچھ اچھے پہلو باقی رہتے ہیں جو اسکی فطرت یا نیک تجربہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ لہٰذا یہ ایک طبیعی بات ہے کہ قرآن کریم ان بعض چیزوں کو باقی رکھے اور دوسرے بہت سارے پہلوؤں کو اپنے اس بڑے تغیر کے راستہ میں ختم کر لیں حتی کہ ان باقی رکھی جانے والی چیزوں کو بھی اپنے نئے اصول سے جوڑا ہو اور ان عادات و رسومات میں جاہلیت کی فکر کو کاٹا ہو۔

(ب) قرآن کریم نے بیان شریعت میں تدریجی اور مرحلہ وار طریقہ کو اپنایا ہے۔
یہاں سے وہ لوگ جو غلط اصول کے تحت بات کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ قرآن بشری افکار ہے ان کے اذہان میں یہ بات آئی ہے کہ قرآن کا جو تعمیراتی کام ہے وہ قرآن کے بشری ہونے کے طبیعت سے مرتبط ہے کیونکہ قرآن کریم ایک علمی کتاب کے طور پر نازل نہیں کیا ہے جسے علماء درس و تدریس کیلئے منتخب کریں بلکہ قرآن انسانیت کو نئے سرے سے تغیر دینے اور اسے بہتر بنیادوں پر تعمیر کرنے کیلئے آیا ہے اور نئے سرے سے تعمیر یقیناً اپنی جگہ تدریج اور مرحلہ وار طور پر راستہ طے کرنے کا محتاج ہے۔

(ج) ہم قرآن کریم میں بہت سے ایسے احکام شریعت اور مفاہیم پاتے ہیں جن کا مبنا دوسرے آسمانی شرعی جیسے یہود ونصاریٰ ہیں۔ یہاں سے ان لوگوں کے اذہان میں جو قرآن کی تفسیر غلط بنیاد پر کرتے ہیں یہ فطور آیا ہے کہ قرآن کریم اس سلسلے میں گذشتہ ادیان سے متاثر ہوا ہے۔ یعنی پیغمبرؐ ان ادیان سے متاثر ہوئے ہیں اور پھر یہ نفسیات کا اثر خود قرآن پر ہوا ہے۔

لیکن اگر حقیقت اور واقعیت پر نظر رکھیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ قرآن کریم جو اسلام کو پہنچا تا رہا ہے درحقیقت گذشتہ ادیان سماوی کا تسلسل ہے اور ان ادیان سماوی کا خاتم ہے اور یہ ایک طبیعی بات ہے کہ اس دین خاتم میں بہت سی چیزیں ایسی ہونگی جو گذشتہ ادیان میں موجود تھیں اور ان چیزوں کو ختم کیا جاتا ہے جو آنے والے انسانوں کی ذہنی وفکری حالات سے سازگار نہ ہوں کیونکہ ان تمام رسالتوں کا مصدر اور برگشت ایک ہی ہے اور وہ خدا حق سبحانہ وتعالی ہے۔ اسلام اس سلسلے میں تمام ادیان کو ایک دین واحد سمجھتا ہے اور سب کی برگشت خدا کی طرف گردانتا ہے اور اس پر اسلام کی تاکید بھی ہے۔

۲۔ قرآن فہمی اور خود قرآن کے بارے میں صحیح بنیاد پر بنائے ہوئے اصول کی ضرورت کو بیان کرنے کے بعد یہ بھی ضروری ہے کہ مفسر میں یہ شرط بھی پائی جائے کہ وہ لغت عرب کے کلمات اور اسکے قواعد وضوابط سے اعلی درجہ کی آگاہی رکھتا ہو کیونکہ قرآن کریم اس لغت کے قانون اور ضوابط کے تحت نازل ہوئی ہے لہذا اگر ہمیں ان قوانین وضوابط پر عبور حاصل نہ ہو تو ہم قرآنی معانی پر احاطہ پیدا نہیں کرسکتے۔ یہاں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مفسر قرآن کیلئے علم صرف ونحو معانی و بیان اور دیگر علوم عربیہ سے آگاہی ضروری ہے لیکن اس ضرورت کی مقدار کی کمیت اس مفسر کے ارادہ سے مربوط ہے کہ مفسر قرآن کس زاویے سے تفسیر کرنا چاہتا ہے اسی حوالے سے اس مقدار کا تعین ہوگا لہذا اگر مفسر، قرآن کریم سے احکام فقہی معلوم کرنا چاہتا ہے تو اسکے لئے عربی قواعد وضوابط پر اتنی تحقیق کی ضرورت نہیں ہے جتنی مقدار میں اس شخص کے لئے ضروری ہے جو قرآن میں موجود قصص

پر تحقیق کرنا چاہتا ہے یا مثلاً اس شخص کی طرح جو قرآن میں مجاز کو معلوم کرنا چاہتا ہے اس کے لئے اس پہلے شخص سے زیادہ شرائط پر عبور حاصل ہونے کی ضرورت ہے۔

۳۔ مفسر کیلئے ضروری ہے کہ جتنا بھی ممکن ہو سکے تفسیر کے وقت خود کو قرآن میں مستغرق رکھے یعنی اس میں حل ہو جائے قرآن میں حل ہونے سے ہماری مراد نص قرآنی میں غور وفکر اور خود قرآن سے معنی کو اخذ کرنا ہے اور قرآن کریم کے علاوہ کسی اور معین طریقہ سے اپنے ذہن میں کوئی معنی بنایا ہوا نہ ہونا چاہئے جیسا کہ بعض اصحاب مذاہب قرآن کی تفسیر میں اپنے مذہبی عقیدے کے سامنے قرآنی آیات کو خاضع کرتے ہیں۔ وہ قرآن کو اس حوالے سے نہیں پڑھتے کہ حقائق کو کشف کریں بلکہ یہ اپنے مذہبی جھکاؤ کو قرآن پر ٹھونستے ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے مخصوص عقائد کی چار دیواری میں قرآن کو سمجھتے ہیں۔ یہ درحقیقت تفسیر نہیں ہے بلکہ اپنے مذہب کا جواز نکالنے کی کوشش ہے اپنے مذہب کو قرآن سے ربط دینے کی کوشش ہے لہذا یہ شرط مفسر کیلئے بہت زیادہ ضروری ہے کہ شخص مفسر کو قرآن سے استفادہ کرتے وقت ذہن کو آزاد رکھنا چاہئے اور اسے قرآن میں بہت زیادہ مستغرق ہونے کی ضرورت ہے اور قرآن ہی کو مذہب کا دائرہ اور مصدر بنانا چاہیئے بجائے اس کے کہ ایک محدود مذہب کو قرآن سمجھنے کی بنیاد بنائیں۔

۴۔ آخری شرط یہ ہے کہ مفسر کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس تفسیر کا ایک کلی طریقہ ہونا چاہئے جس میں تفسیر کے طریقہ میں اپنے علمی تحقیق اور وہ ذرائع اور وسائل جو تفسیر کیلئے استعمال ہوتے ہیں اس کے حدود معین ہوں اور یہ بھی واضح ہو جائے کہ وہ خود لفظ اور روایات کی ظاہر پر کس حد تک اعتماد کرتے ہیں اور ان قرآئن عقلی پر جو آیت کی صراحت پر دلالت کرتے ہیں ان پر کس حد تک اعتماد کرتے ہیں یہ سب واضح ہونا چاہئے کیونکہ یہ سب اختلافی مسائل ہیں اور ان میں بہت سارے نظریات پائے جاتے ہیں لہذا ممکن نہیں کہ ان اختلافی نقاط کے واضح ہوئے بغیر انسان عمل تفسیر میں گہرائی کے ساتھ داخل ہو جائے ان سب چیزوں سے عہدہ برا ہونے کے بعد ہی تفسیر کرنے کے لئے مفسر کے پاس

ایک کلی قاعدہ ہاتھ آتا ہے کہ جس کے ذریعہ وہ تفسیر کرسکتے ہیں اور یہ اختلافات عملی کہ جن کا اوپر بیان ہوا علم اصول، کلام اور علم رجال وغیرہ سے مربوط ہے۔ لہٰذا مفسر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اختلافات کو معلوم کرنے کے لئے ان علوم میں بہت زیادہ دقیق ہو۔

تفسیر دور رسولؐ میں

نزول وحی کے دوران بھی قرآن کی تفصیلی فہم اور ادراک وافر مقدار میں میسر نہیں تھے۔

گرچہ قرآن کریم اپنے طریقۂ بیان میں عربی زبان میں ایک خاص نمایاں امتیاز رکھتا ہے اسی وجہ سے وہ اعجاز کے درجہ پر فائز ہوا ہے۔ اسکے باوجود وہ لغت عربی کے قواعد وضوابط سے ہم آہنگ تھے۔ وہ اپنی تعبیر وادائیگی میں عربی زبان کے طریقے اور اس کے قواعد کے مطابق تھے اور فن گفتگو میں ذوق عربی سے ہم آہنگ تھے اسی بنیاد پر دوران نزول اس کا عام لوگوں کے لئے اجمالی فہم سب کے لئے عمومی طور پر میسر تھا قرآن کریم کے اسی انداز بیان کی وجہ سے مشرکین کے دلوں پر گہرا اثر پڑا اور انکے دلوں کے دروازے نور قرآن کے لئے کھل گئے اور یہیں سے بہت سے لوگوں نے قرآن کی دعوت کو قبول کیا۔ چند آیات کے سنتے ہی خدا نے انکے سینے اسلام کے لئے کھول دیئے۔ اگر قرآن کا یہ اجمالی فہم عام لوگوں کے لئے میسر نہ ہوتا تو یہ ممکن نہیں تھا لوگوں کے دلوں میں اتنی بڑی تأثیر پیدا ہوتی جو اس جاہلیت اور اس کی تاریکی میں زندگی گزار رہے تھے۔

اس کا یہ معنی بھی نہیں کہ زمان نزول میں موجود لوگ قرآن کی آیات میں مفردات اور مرکبات کو بطور کامل وشامل سب سمجھتے تھے۔ اس طریقے سے یہ بھی نہیں کہ ہر ایک انسان کے لئے قرآن کے تمام کلمات، جملے اور آیات کے معانی اور مفاہیم کا احاطہ کرنا ممکن ہو اگر چہ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں بیان کیا ہے: قرآن عربی زبان میں اور اسکی انداز بلاغت میں نازل ہوا لہٰذا پورے عرب قرآن کے معانی اور مفاہیم کو سمجھتے تھے اور اسکے

مفردات اور مرکبات سے سب واقف تھے (تاریخ ابن خلدون، ج ا ص ۴۳۸)۔

قرآن کریم کا عربی زبان میں نازل ہونا اور بلاغت قرآن کے اسلوب پر نازل ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ عرب لوگ عمومی طور پر سب قرآن کو سمجھ لیں اور اس کے مفردات اور مرکبات کے معانی سے واقف ہوں اور ہر وہ چیز جس پر لفظ قرآن دلالت کرتا ہو جیسے احکام اور مفاہیم ان سب کو درک کرتے ہوں۔ ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی انسان ایک معین زبان والا ہونے کا یہ معنی نہیں ہے کہ اس لغت کے بارے میں کامل وشامل اطلاع رکھتا ہو اور اس کے تمام مفردات اور تعبیرات کے اسلوب پر احاطہ کیا ہوا ہو اور ادائیگی پر مکمل تسلط رکھتا ہو، بلکہ وہ شخص اپنی اس زبان اتنی حد تک آشنا ہوتا ہے جس قدر اس کی عادی زندگی میں اس کی ضرورت پڑتی ہے۔

ایک اور زاویئے سے کسی کلام کو سمجھنا اور اس پر احاطہ کرنا تنہا اس بات پر موقوف نہیں کہ وہ اس زبان کے صرف لغوی معلومات کو رکھتا ہو بلکہ اس زبان کے لغوی معلومات پر عبور رکھنے کے ساتھ ایک خاص فکری استعداد پر بھی موقوف ہے اور عقلی تمرین میں اس کلام کے مضمون سے تناسب ہونا ضروری ہے اور اس کلام کے وہ معانی جسے یہ بیان کر رہا ہے اس سے بھی تناسب ہونا چاہئے۔

عرب اس وقت بنیاد سے اوپر تک جاہلیت کی زندگی گزار رہے تھے اور ایک طویل عرصہ سے ان کی زندگی کے مختلف میدانوں میں جاہلیت حاوی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب وہ اسلام میں بطور مستقیم داخل ہوئے تو ذہنی اور روحی طور پر تمام معانی ومفہوم کلمات قرآن پر احاطہ کرنا ان کے لئے ممکن نہیں تھا اور قرآن کریم کے معانی جو جاہلیت کی زندگی کو ختم کرنے اور اسے بنیاد سے منہدم کر کے ایک اور نئے سرے سے انسان کی تعمیر کے لئے آیا تھا ان سب سے آشنائی میسر نہیں تھی۔

دوسرا زاویئے سے ہم جانتے ہیں کہ فہم قرآن کے لئے ایک جملہ، ایک آیت پر غور کرنا کافی نہیں بلکہ اس آیت کے ٹکڑے اور اس جملہ کو سمجھنے کے لئے اس کا اس کتاب

میں آئے ہوئے دیگر آیات کے ساتھ موازنہ اور مقابلہ کرنا ضروری ہے یا ان حالات وشرائط کو مدنظر رکھیں جو اس وقت چھائے ہوئے تھے ۔ اور ان کا آپس میں موازنہ کرنا اور شرائط اور حالات کا مدنظر رکھنے کا اپنا ایک مزاج ہے اور اپنی خصوصی فکری شرائط ہیں کہ جو صحیح لغوی معانی کے سمجھنے کے علاوہ ہونا چاہئے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اُس وقت کے حالات یہ بتاتے ہیں کہ صحابہ کرام قرآن کریم کو اجمالی طور پر جانتے تھے لیکن کلی طور پر اور تفصیلی طور پر آیات کے مفردات اور ترکیبات پر احاطہ نہیں رکھتے تھے۔

عصر نزول میں تفصیلی طور پر فہم قرآن نہ ہونے کے شواہد

اس مدعٰی پر اس وقت کے تقاضے کے علاوہ بہت سی احادیث اور واقعات بھی اس کی تأکید کرتے ہیں کہ اصحاب اکثر و بیشتر آیات قرآنی پر کامل عبور نہیں رکھتے تھے اور اس کے معنی کو نہیں سمجھتے تھے۔ اس کی وجہ یا تو اس کلمہ قرآن کے لغوی معنی سے وہ لوگ نا آشنا تھے یا فکری استعداد اور صلاحیت کا فقدان تھا کہ وہ آیت کے کامل معنی کو درک کرتے ، یا اس کی وجہ اس جملہ اور ٹکڑے کے حالات وشرائط جس میں یہ آیت اتری ہے اس کا نہیں جاننا تھا ۔اس سلسلہ میں چند احادیث اور واقعات ملاحظہ ہوں: (اس بارے میں ساری احادیث اور تفاسیر کی کتابوں میں بہت سے شواہد ملیں گے، جیسے طبری، صحیح بخاری، مستدرک، حاکم نیشابوری وغیرہ) (مؤلفین قدس سرّہ)

☆ الحاکم نے مستدرک میں لکھا ہے کہ انس نے کہا: ایک دن حضرت عمرؓ اپنے اصحاب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے وہاں پر یہ آیات پڑھی گئیں:

﴿**فانبتنا فیہا حبًّا. وّعنبًا وّقضبًا وّزیتونًا وّنخلًا. وّحدآئق غلبًا. وّفاکہۃً وّابًّا**﴾ ''پھر ہم نے اس میں دانے اگائے۔ نیز انگور اور سبزیاں۔ اور زیتون اور کھجوریں۔ اور گھنے باغات۔ اور میوے اور چارے بھی'' (عبس/ ۲۷ تا ۳۱) تو اس نے کہا کہ ہم ان سب کو جانتے ہیں لیکن ''ابّ'' کو نہیں جانتے یہ کیا ہے؟ کہتے ہیں کہ اس وقت حضرت عمر کے ہاتھ میں عصا تھی وہ زمین پر مار کر کہا کہ خدا کی قسم یہ تکلف ہے زحمت ہے لہٰذا

اس چیز کو اٹھاؤ جو تمہارے لئے واضح ہے اور اس پر عمل کرو اور جس چیز کو تم نہیں جانتے ہو اسے خدا پر چھوڑ و (**المستدرک علی الصحیحین**، ج۲، ص۵۱۴ تعبیر میں کچھ اختلاف کے ساتھ)

☆ ایک اور روایت میں آیا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر منبر پر تھے تو سورۂ نحل کی آیت نمبر ۴۷ تلاوت ہوئی:

﴿**اویاخذہم علٰی تخوّفٍ فان ربّکم لرء وفٌ رّحیمٌ**﴾ ''یا انہیں خوف میں رکھ کر گرفت میں لیا جائے؟ پس تمہارا رب یقیناً بڑا شفقت کرنے والا مہربان ہے'' کسی نے معنٰی تخوف کے بارے میں سوال کیا تو بنی ھذیل کے ایک آدمی نے جواب دیا کہ تخوف ہمارے ہاں کمی کو کہتے ہیں۔

☆ اسی طرح ابن عباس سے نقل ہے کہ: مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ ﴿**فاطر السماوات**﴾ کسے کہتے ہیں لیکن جب دو عرب ایک کنواں کے بارے میں نزاع لے کر آئے ایک نے کہا کہ میں نے اس کی فطر کی ہے یعنی ''انا فطرنا: میں نے ابتداء کی ہے'' اس وقت مجھے اس کلمہ کا معنی معلوم ہو گیا۔

☆ اسی طرح تفسیر طبری میں ہے ابا الجلد نے سورۂ رعد کی آیت نمبر ۱۲ میں موجود کلمہ ''برق'' کے معنی پوچھا:

﴿**ھو الّذی یریکم البرق خوفًا وّطمعًا وّینشیء السّحاب الثّقال**﴾ ''وہی ہے جو تمہیں ڈرانے اور امید دلانے کے لئے بجلی کی چمک دکھاتا ہے اور بھاری بادلوں کو پیدا کرتا ہے'' تو اسنے کہا: برق مطر کو کہتے ہیں مطر کا معنی بارش ہے ۔(تفسیر طبری ج۱۳، ص۸۲)

☆ تفسیر طبری میں آیا ہے کہ حضرت عمر نے لوگوں سے سورۂ بقرہ کی آیت ۲۶۶ کے بارے میں پوچھا:

﴿**ایودّ احدکم ان تکون لہ جنۃٌ مّن نّخیلٍ وّاعنابٍ تجری من**

تحتها الانهار له فیها من کلّ الثّمرات واصابه الکبر وله ذرّیّةٌ ضعفآء فاصابها اعصارٌ فیه نارٌ فاحترقتْ کذالک یبین اللّٰه لکم الأیات لعلکم تتفکّروْن ﴾ ''کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے لئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو جس کے نیچے نہریں جاری ہوں اور اس میں اس کے لئے ہر قسم کے میوے موجود ہوں اور جب بڑھاپا آجائے اور اس کے بچے بھی ناتواں ہوں تو ناگہاں یہ باغ ایک ایسے بگولے کی زد میں آجائے جس میں آگ ہو اور وہ جل جائے؟ اللہ یوں تمہارے لئے نشانیاں کھول کر بیان کرتا ہے شاید تم غور وفکر کرو'' ۔تو ان کوئی تشفی والا جواب نہ دے سکا یہاں تک کہ ان کے پیچھے بیٹھے ابن عبّاس نے کہا کہ یا امیرالمومنین میرے ذہن میں اس کے بارے میں کوئی چیز آتی ہے۔ حضرت عمر نے کہا اپنے اس فکر وخیال سے منصرف ہو جاؤ اور اپنے آپ کو حقیر نہ کرو۔ ابن عباس نے کہا: یہ ایک ضرب المثل ہے جو خدا نے دیا ہے فرماتا ہے: آیا تم میں سے کوئی عمر بھر اہل خیر وسعادت والے کام انجام دیں لیکن اس وقت کہ جب اس کی زیادہ ضرورت ہوا سے اپنی عمر کے اختتام اور اجل کے قریب کے وقت کو خیر وعافیت کے ساتھ ختم کرے تو اس وقت یہ شخص اپنے عمل کو اہل شقاء کے کام پر ختم کرے اور اس کو پورے طور پر ختم کرے اور جلا دیے لیکن اس کو اس وقت اس عمل خیر کی بہت زیادہ ضرورت اور بہت زیادہ محتاج مند ہیں (تفسیر طبری، ج۳، ص۵۱)

یہاں تک کہ اپنے آخری عمر کو اختتام تک پہنچائیں اور اس کا اجل آئے تو اس وقت ایک ایسی فاسد عمل انجام دے۔

صحیح بخاری میں آیا ہے: عدی بن حاتم اس آیت کے معنی کو نہیں سمجھے تھے:

﴿...... **وکلوا واشربوا حتّٰی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر**....(بقرہ/۱۸۷)﴾

یہاں تک کہ انھوں نے کچھ سفید اور کچھ سیاہ رسی ہاتھ میں لیا اور جب رات کا کچھ حصہ گزر گیا تو ان دونوں تمیز نہیں کر سکا جب صبح ہوئی تو پیغمبرؐ نے انھیں اس آیت کے بارے

میں بتایا تو وہ اس آیت کے مقصود سے آگاہ ہوئے۔(صحیح بخاری۳/۳۶)

۳۔ روایت میں آیا ہے کہ حضرت عمر نے قدامة بن مظعون کو بحرین کا والی بنایا اس وقت جارود نے آکر حضرت عمر کو یہ خبر دی کہ قدامة شراب پی کر مست ہوا ہے تو حضرت عمر نے پوچھا کہ کون تمہاری اس بات کا گواہی دے گا تو جارود نے کہا کہ ابوھریرہ اس کی گواہی دیتا ہے تو حضرت عمر نے قدامة سے کہا کہ میں تمہیں تازیانہ ماروں گا تو قدامة نے کہا: خدا کی قسم جیسا کہ یہ لوگ بتا رہے ہیں اگر میں شراب پیا ہے تب بھی آپ مجھے تازیانہ نہیں مار سکتے حضرت عمر نے پوچھا کیوں نہیں مار سکتا قدامة نے کہا اس لیے کہ خدا قرآن میں فرماتا ہے:

﴿**لیس علی الّذین اٰمنوا وعملوا الصّالحات جناحٌ فیما طعموا اذا ما اتّقوا وّاٰمنوا وعملوا الصّالحات ثم اتّقوا وّاٰمنوا ثم اتّقوا وّاحسنوا واللّٰه یحبّ المحسنین**﴾ ''جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک اعمال بجالائے ان کی ان چیزوں پر کوئی گرفت نہیں ہوگی جو وہ کھا پی چکے بشرطیکہ (آئندہ) پرہیز کریں اور ایمان پر قائم رہیں اور نیک اعمال بجالائیں پھر پرہیز کریں اور ایمان پر قائم رہیں پھر پرہیز کریں اور نیکی کریں اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے'' (مائدہ/۹۳)

لہٰذا ہم ایمان لائے عمل صالح انجام دیے تقویٰ اختیار کی پھر نیک عمل کیا اور نیکی کی اور بدر، احد، خندق اور دیگر جنگوں میں پیغمبرؐ کے ساتھ رہا ہوں تو حضرت عمر نے کہا کہ کیا تم میں سے کوئی ابوقدامة کو رد نہیں کرے گا؟ تو ابن عباس نے کہا: اس طرح کی آیات جو لوگ گزر گئے ہیں ان کی عذرخواہی اور آنے والوں کے لئے حجت دلیل کے طور پر نازل ہوئے ہیں کیونکہ خداوند عالم فرماتے ہیں:

﴿**یاایها الذین اٰمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجسٌ مّن عمل الشّیطان فاجتنبوه لعلکم تفلحون**﴾ ''اے ایمان والو! شراب اور جوا اور مقدس تھان اور پانسے سب ناپاک شیطانی عمل ہیں پس اس سے پرہیز کرو تا کہ تم نجات حاصل

کرسکو‘‘(مائدہ/۹۰)

حضرت عمر نے کہا کہ تم نے سچ کہا ہے(تفسیر القرطبی، ج۶،ص ۲۹۷)

یہ واقعات دلالت کرتے ہیں کہ بہت سے صحابہ کرام آیات قرآنی کو آسانی سے نہیں سمجھتے تھے وہ فہم قرآن کے لئے سوال اور بحث وگفتگو کے نیاز مند ہوتے تھے اس کی وجہ یا یہ تھی کہ وہ لوگ اسکے لغوی معنٰی بطور کامل نہیں جانتے تھے جیسا کہ پہلے حصے میں بیان کر چکے یا فکری حوالہ سے ان کی سطحِ فکر اس درجے پر نہیں پہنچی تھی کہ وہ ان اہداف ومقاصد کو درک کر سکتے جیسا کہ دوسری صورت میں بیان ہوا یا آیات کی تجزیہ وتحلیل میں اشتباہ کرتے تھے جیسا کہ قدامۃ بن مضعون نے کی ہے۔

اس سلسلہ میں ہم ایک اور نکتہ کا بھی اضافہ کر سکتے ہیں کہ کبھی آیت لغوی حوالہ سے لوگوں کے لئے سمجھنا میسر ہے لیکن اس کے معنی پر احاطہ کرنے کے لئے بحث وگفتگو اور سوال وجواب کی ضرورت اپنی جگہ باقی رہ جاتی ہے تا کہ جس مصداق پر مدلول لفظ دلالت کر رہا ہے اس کا یقین وتعین ہو جائے۔ چنانچہ سورۂ والفجر کی پہلی اور دوسری آیت کے بارے میں پیش آیا:

﴿والفجر. وليالٍ عشرٍ﴾ ’’قسم ہے فجر کی۔ اور دس راتوں کی‘‘ اس وقت صحابہ کرام جو عرب تھے، عرب میں نشونما پائے تھے تو یہ ایک طبیعی سی بات تھی کہ وہ معنائے لیالٍ اور معنی کلمہ عشر کو جانتے تھے لیکن اس لیالٍ عشرٍ سے خداوند عالم نے کون سی دس راتیں مراد لی ہیں وہ نہیں جانتے تھے۔ اس کو جاننے کی ضرورت اپنی جگہ باقی ہے۔ اسی طرح:

﴿والعاديات ضبحا﴾ ’’قسم ہے ان (گھوڑوں) کی جو ہانپتے ہوئے دوڑتے ہیں‘‘ (عادیات/۱)

﴿والذاريات ذروا﴾ ’’قسم ہے بکھیر کر اڑانے والی (ہواؤں) کی‘‘ (ذاریات/۱) ان دونوں کے لغوی معنی جانتے تھے لیکن وہ کہاں اور کس جگہ ہے وہ نہیں جانتے تھے لہٰذا ان میدانوں میں صرف لغت کا معنی جاننا کافی نہیں ہے۔

اس طرح ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے تھے کہ دور رسول میں قرآن کی تفصیلی فہم سب کے لئے عمومی طور پر میسر نہیں تھے بلکہ ان میں سے اکثر وبیشتر سوال اور بحث وتفسیر کے محتاج تھے۔

تفسیر قرآن میں پیغمبر اکرمؐ کا کردار

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تفسیر قرآن کی ذمہ داری رسول اکرمؐ پر ہی تھی۔ آپؐ ہی وہ پہلے مفسر ہیں کہ نص آیات قرآنی کی تشریح کرتے تھے۔ اسکے اہداف کو روشن کرتے تھے اور آپؐ ہی لوگوں میں سے ہر ایک کی قابلیت اور صلاحیت کے مطابق انھیں قرآن سے نزدیک فرماتے تھے۔ قرآن فہمی میں مسلمانوں کو جو مشکل پیش آتی وہ آپؐ حل فرماتے تھے۔ اور قرآنی آیات اور اسکے مفاہیم میں جو شبہات لوگوں کو پیش آتے انھیں واضح فرماتے۔ کیونکہ پیغمبر اکرمؐ صاحب رسالت اور مرکز وحی ہونے کے حوالہ سے اس اہم کام کیلئے الٰہی طور پر آمادہ تھے جیسا کہ اس کے علاوہ مثلاً دعوت اسلام اور پیغام آسمانی کیلئے آمادہ رہتے تھے۔ خداوند عالم نے قرآن کے حفظ اور بیان کو اپنے ذمہ لیا ہے:

﴿انّ علينا جمعه و ترانه. فاذا قرأناه فاتّبع قرآنه. ثمّ انّ علينا بيانه﴾ ’’اس کا جمع کرنا اور پڑھوانا یقیناً ہمارے ذمے ہے۔ پس جب ہم اسے پڑھ چکیں تو پھر آپ (بھی) اسی طرح پڑھا کریں۔ پھر اس کی وضاحت ہمارے ذمے ہے‘‘ (قیامت/۱۷تا۱۹)

مسلمانوں کے درمیان اس بنیادی کردار کے بارے میں کوئی اختلاف پایا نہیں جاتا جسے پیغمبر اکرمؐ نے قرآن کے مفسر اول ہونے کی حیثیت سے انجام دیا تھا کہ آپؐ کائنات اور زندگی کے مسائل میں مفاہیم قرآن کی تطبیق فرماتے تھے اس سلسلے میں مسلمانوں میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔

لیکن ایک سوال جو عموماً اس سلسلے میں پیش آتا ہے، وہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کس حد تک تفسیر فرماتے تھے؟ کیا تمام آیات کی تفسیر فرماتے تھے؟ یا ایک حد تک تفسیر پر اکتفاء فرماتے تھے؟ یا صرف ان آیات کی تفسیر فرماتے جن کا سمجھنا اصحاب کیلئے مشکل ہوتا تھا جن کے بارے میں اصحاب آپؐ سے سوال کرتے تھے؟۔

بعض کا خیال ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے صرف بعض آیات کی تفسیر کی ہے اور اس سلسلے میں اصحاب یہ روایات استناد کے طور پر پیش کرتے ہیں جن میں یہ بات نقل ہوئی ہے کہ رسول اکرمؐ نے پورے قرآن کی تفسیر نہیں کی ہے۔ اس نظریہ کے حامل صف اول میں جلا الدین سیوطی ہیں۔ (الاتقان فی علوم القرآن ج۴ص۱۹۶، ۲۰۰ سیوطیؒ)

انھیں روایات میں سے ہے جسے بزار نے اُم المومنین جناب عائشہؓ سے نقل کیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ تفسیر نہیں فرماتے تھے......سوائے محدود آیات کے......۔

(**التفسیر والمفسرون** ج۱ص۱۵۱ ذہبی)

اور اس قول کی تائید سب سے زیادہ اس وقت کے معاشرے کی طبیعی حالت کرتی ہے۔ کیونکہ پیغمبر اکرمؐ کے اصحاب سے تفسیر قرآن کے بارے میں بہت کم احادیث نقل ہوئی ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ پیغمبرؐ اصحاب کے لئے تمام آیات کی تفسیر نہیں فرتے تھے اگر ایسا کرتے تو اصحاب سے اس سلسلے میں بہت سی روایات نقل ہوتیں لیکن ہمیں یہ دیکھنے میں ملتا ہے کہ اصحاب میں سے بہت زیادہ اور بڑی شخصیات کسی آیت کے معنی میں متحیر بلکہ اس کے برعکس سرگردان نظر آتے ہیں یا آیت کلمہ کے بارے میں حیران ہوتے نظر آتے ہیں اور وہ لوگ حتیٰ کہ نص قرآنی کے لفظی دلائل سے بھی ناواقف ہیں اور ان آیات کے کیا اہداف ہیں وہ بھی نہیں جانتے جیسا کہ پہلے ذکر شدہ روایات اور واقعات میں بیان ہوا۔

اس نظریہ کے مقابل بعض ادلہ اور شواہد پائے جاتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے کلِ قرآن کی تفسیر کی ہے شاید اس نظریّے کی سب سے پہلی تائید یہ آیات ہوں:

﴿**کمآ ارسلنا فیکم رسولاً مّنکم یتلوا علیکم اٰیٰتنا ویزکّیکم ویعلّمکم الکتاب والحکمة ویعلّمکم مّالم تکونوا تعلمون**﴾ ''جیسے ہم نے تمہارے درمیان خود تم ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تمہیں ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور تمہیں پاکیزہ کرتا ہے اور تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں ان چیزوں کی تعلیم دیتا ہے

جو تم نہیں جانتے تھے'' (بقرہ/۱۵۱)

﴿**بالبیّنات والزّبر وانزلنآ الیک الذّکر لتبیّن للنّاس مانزّل الیھم ولعلّھم یتفکّرون**﴾ ''(جنھیں) دلائل اور کتابیں دے کر بھیجا تھا اور (اے رسول) آپ پر بھی ہم نے ذکر اس لئے نازل کیا ہے تا کہ آپ لوگوں کو وہ باتیں کھول کر بتادیں جو ان کے لئے نازل کی گئی ہیں اور شاید وہ (ان میں) غور کریں'' (نحل/۴۴)

اگر اس وقت کے حالات کی طرف پہلے زاویہ سے مختلف ایک اور زاویہ سے دیکھیں تو یہ حالات اس چیز پر دلالت کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے کل قرآن کی تفسیر بطور کامل واتم کی ہے۔

کیونکہ ہم ایک طرف یہ جانتے ہیں کہ قرآن کا اجمالی فہم کافی نہیں تھا تا کہ اصحاب کل قرآن کے دقائق کو سمجھ سکیں اور تمام اصحاب کا لغت عربیہ کی طرف نسبت ہونا پوری آیات قرآنی پر احاطہ قائم کرنے اور اس کے معانی کو درک کرنے کے لیئے کافی نہیں ہے۔

دوسری طرف ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ قرآن مسلمانوں کی زندگی میں صرف ادبی کتاب نہیں ہے یا کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے صرف عبادات اور رسومات میں پڑھنے تک محدود رکھا جائے۔ بلکہ یہ خداوند عالم کی نازل کردہ وہ کتاب ہے جو انسانوں کو ظلمت سے نکال کر نور کی طرف لانے کے لئے آئی ہے جو ان کی تزکیہ کرنے اور انہیں تعلیم دینے کیلئے آئی ہے اور ہر لحاظ، ہر زاویے سے انکی فکری سطح کو بلند کرنے کیلئے آئی ہے تا کہ ایک اسلامی شخصیت کی تعمیر ہو سکے۔

یقیناً یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قرآن اس وقت تک کامل اور شامل صورت میں یہ کردار ادا نہیں کی سکتا جب تک یہ قابل فہم نہ ہو، جب تک مسلمان اس کے معنی واہداف تک نہ پہنچیں اور اسکے مفاہیم اور اصطلاحات میں خود کو حل نہ کر لیں۔

اگر قرآن رسالت الٰہی کی رہنمائی کے بغیر کسی تفسیر اور توجیہ کیلئے چھوڑا گیا ہو اور اس سے یہ سمجھیں کہ خود مسلمان اسے اپنی فکری اور فرہنگی سطح کے مطابق سمجھیں۔ تو جس

معاشرہ اور فرہنگ میں وہ زندگی گزار رہا ہے اس وقت اس کی تفسیر میں تمام فرسودہ تصورات داخل ہوسکتے ہیں اور تمام چیزیں جو بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں پہلے سے موجود ہیں وہ بھی قرآن پر ٹھونسا جائے گا۔

یہاں پر اپنے آپ کو ان دو اقوال کے تناقص کے درمیان پاتے ہیں اور ہر ایک قول کے لئے اپنے تائید اور شواہد ہیں اور یہ تناقض حل طلب ہے۔

اس سلسلہ میں ہمیں کوئی قابل قبول عقلی اور استدلالی حلّ بھی نہیں ملتے کہ پیغمبر اکرمؐ نے قرآن کی دو سطح پر تفسیر کی ہے۔

ایک عام سطح کی تفسیر ہے یعنی جو ضروریات اور حاجات پیش آتی اسکی تفسیر کرتے تھے۔لہٰذا اس حوالے سے پیغمبر اکرمؐ نے کل قرآن کی تفسیر نہیں کی ہے۔

دوسرا یہ کہ پیغمبرؐ ایک خاص سطح کی تفسیر فرماتے جو اپنے درجہ اتم تک پہنچی ہوتی جس نے کل آیات کا احاطہ کیا ہوا ہو اس نیت سے کہ کسی کو اس ورثہ کا حامل بنا لیں اور وہ شخص قرآن کریم سے اس طرح گھل مل جائے کہ اس کیلئے یہ موقع فراہم کریں کہ وہ بعد میں امت کے فہم قرآن کیلئے مرجع ہو اور ساتھ یہ کام اس چیز کی بھی ضامن ہو کہ امت قرآن کو سمجھنے میں ایک خاص فکری چاردیواری اور پہلے سے ان میں موجود قانون اور جاہلیت کے رسومات سے متاثر نہ ہوں۔

اگر ہم اس روشنی میں اپنے موقف کی تفسیر کریں تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے اس وقت کے حالات اور تقاضوں کے ساتھ اتفاق کیا ہے۔

لہٰذا تفسیر کے بارے میں نبی اکرمؐ سے اصحاب نے صحیح روایات بہت ہی کم نقل کی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تفسیر عمومی طور پر تمام آیات کے بارے میں نہیں ہے بلکہ تفسیر وقت کی ضرورت تک محدود تھی۔

پیغمبر اکرمؐ کی ذمہ داری تھی کہ وہ امت کو قرآن سمجھائیں اور قرآن کو انحرافات سے بچائیں۔اس ذمہ داری کو تفسیر میں ایک مخصوص انداز سے تفسیر کیا جاتا ہے اور اس خاص

قسم کی تفسیر کیلئے ایک ضامن کی ضرورت ہے اور عام سطح کی تفسیر اس کیلئے کافی نہیں ہے اگرچہ وہ سب اپنے اندر لئے ہوئے کیوں نہ ہو کیونکہ وہ اس صورت میں متفرق ہوگی اور وہ شخص حقیقت میں قرآن میں مدغم نہیں ہوسکتا۔جبکہ امانت قرآن کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شخص کا کلی طور پر قرآن میں مدغم ہونا ضروری شرائط میں سے ہے۔

اور اسی منصوبہ بندی کا رسالت کے دوسرے فکری میدانوں میں بھی ہونا ضروری ہے جیسے تفسیر یا فقہ یا ان دونوں کے علاوہ باقی جوانب۔

یہ اس مسئلہ کا ایک منطقی حل ہے جسکے لئے نصوص متواتر موجود ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے اس رسالت کے مختلف پہلوؤں کے بیان کیلئے اہل بیتؑ کو مرجع و مرکز بنایا ہے قرآن کی خالص تفصیلات بطور خاص اہل بیتؑ کے پاس موجود ہیں جنھیں انھوں نے پیغمبرؐ سے اخذ کیا ہے جیسے تفسیر اور فقہ وغیرہ کے مختلف موضوعات۔

وہ نصوص بہت ہیں جن میں اہل بیتؑ کو بطور مرجع معرفی کیا ہے جیسے حدیث ثقلین۔ چونکہ اس بحث کو وسعت دینے کیلئے مناسب جگہ دروس فقہ ہے لہٰذا ہم یہاں امیر المومنین حضرت علیؑ کا ایک کلام بیان کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں تاکہ جو نتیجہ ہم نے اس گفتگو میں بیان کیا ہے اسکی وضاحت ہو سکے اور تفسیر کی دونوں سطح کے بارے میں خود حضرتؑ نے جو کوششیں کی ہیں ان کے بارے میں بھی گفتگو ہو وہ حدیث یہ ہے:

ثقہ اسلام محمد ابن یعقوب کلینی نے علی بن ابراھیم بن قاسم سے، انھوں نے اپنے باپ سے، انھوں نے حماد بن عیسیٰ سے، انھوں نے ابراہیم بن عمر الیمانی سے، انھوں نے ابان ابن ابی عیاش سے، انھوں نے سلیم بن قیس ھلالی سے نقل کیا ہے کہ اس نے کہا: میں نے حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے عرض کیا: میں نے مقداد، ابوذر اور سلمان سے کچھ تفسیر قرآن اور پیغمبر اکرمؐ کی کچھ احادیث سنی ہیں کہ جو ان سے مختلف ہیں جو لوگوں کے ہاتھ میں ہیں۔ پھر ہم آپؑ سے جو سنتے ہیں وہ اسکی تصدیق کرتی ہے جسے ہم نے ان تینوں سے سنا ہے اور میں لوگوں کے ہاتھوں میں قرآن کریم کے تفسیر کے بارے میں بہت سی چیزیں

پاتا ہوں اوراسی طرح احادیث نبوی بھی بہت ان کے ہاتھوں میں ہیں لیکن آپ لوگ ان کے مخالف ہیں اوران سب کو باطل تصور کرتے ہیں۔ آیا لوگوں کے پاس جو کچھ موجود ہے وہ باطل ہے آیا لوگوں نے عمداً پیغمبرؐ کی طرف جھوٹ کی نسبت دی ہے اورتفسیر میں اپنی رائے کو استعمال کیا ہے۔ یہ سننے کے بعد امیر المومنینؑ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: تم نے سوال کیا تو اب جواب سنو لوگوں کے ہاتھوں میں حق بھی ہے باطل بھی، وہم بھی سچ بھی، لوگوں نے رسولؐ کی طرف جھوٹ کی نسبت بھی دی ہے اور یہ نسبت خود رسولؐ کی زندگی میں دی گئی حتیٰ کہ رسولؐ نے کھڑے ہوکر خطبہ دیا کہ (تم نے میری حیات میں میری طرف بہت زیادہ جھوٹ کی نسبت دی ہے اگر تم نے عمداً میری طرف جھوٹ کی نسبت دی تو تمہارا ٹھکانا جہنم ہوگا) اوراس کے بعد بھی ان کی طرف جھوٹی نسبت دی گئی لہٰذا اب پیغمبر اکرمؐ کی کوئی حدیث جو تم تک پہنچتی ہیں ان کی برگشت چار حالتوں کی طرف ہوگی، اسکی پانچویں حالت نہیں ہوگی۔ ایک بیان کرنے والا منافق انسان ہے جو اپنے ایمان کا اظہار کرتا ہے اپنے اسلام کو سچا کر پیش کرتا ہے رسول اللہؐ سے عمداً جھوٹی نسبت دینے میں وہ کوئی گناہ اور کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتا۔ اگر لوگوں کو پتہ چل جائے کہ یہ منافق ہے تو لوگ اسکی تصدیق نہیں کرتے بلکہ لوگ بولیں گے کہ یہ پیغمبرؐ کا صحابی ہے اس نے انھیںؐ دیکھا ہے اوران سے سنا ہے لیکن وہ لوگ اس کی حالت کو نہیں جانتے خدا نے منافق کی صفات بیان کی ہیں اوران کی صفات وہی ہونگی جیسے خدا نے فرمایا ہے:

﴿واذا رایتم تعجبک اجسامھم و انْ یّقولوا تسمعْ لقولھم کانّھم خشبٌ مّسنّدۃٌ یحسبون کلّ صیحۃٍ علیھم ھم العدوّ فاحذرھم قاتلھم اللّٰہ انّٰی یوفکون﴾ ''اور جب آپ انہیں دیکھ لیں تو ان کے جسم آپ کو بھلے معلوم ہوں گے اور جب وہ بولیں تو آپ ان کی باتیں توجہ سے سنتے ہیں (مگر وہ ایسے بے روح ہیں) گویا وہ دیوار سے لگائی گئی لکڑیاں ہیں ہر آواز کو اپنے خلاف تصور کرتے ہیں یہی لوگ (بڑے) دشمن ہیں لہٰذا آپ ان سے محتاط رہیں اللہ انہیں ہلاک کرے یہ کہاں بہکے پھرتے

ہیں'' (منافقون/۴)

لوگوں کے چار اقسام میں سے ایک قسم یہ ہے۔

ایک گروہ وہ ہے جس نے پیغمبرؐ سے سنا ہے لیکن اسے صحیح یاد نہیں رہا لہٰذا اس نے اسے گمان کیا ہے اس نے جھوٹ کی نسبت نہیں دی ہے بلکہ اسکے پاس جو کچھ موجود ہے اس پر عمل کرتا ہے نقل کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے اسے رسولؐ سے سنا ہے اگر لوگوں کو پتہ چل جائے کہ اس نے اسے اپنے گمان کے تحت بنایا ہے تو لوگ اسے قبول نہیں کریں گے اوراسے مسترد کردیں گے۔

اور تیسرا شخص وہ ہے جس نے کسی مسئلہ پر رسول سے کوئی حدیث سنی ہے لیکن بعد میں رسول اکرمؐ نے اس چیز کو منع کردیا لیکن اس نے نہیں سنا یا پیغمبر نے کسی چیز کی نہی کا حکم دیا مگر بعد میں اجازت دے دی لیکن اس نے نہیں سنا۔ اس شخص نے منسوخ حفظ کیا لیکن ناسخ کو حفظ نہیں کیا اگر اسے یہ معلوم ہوتا کہ یہ منسوخ ہوا ہے تو اسے رد کرتے یا اگر لوگوں کو اسکا پتہ چلتا تو اسے رد کرتے۔

چوتھا وہ شخص ہے جس نے پیغمبر سے جھوٹ کی نسبت نہیں دی، وہ خدا سے ڈرتا ہے، رسول اللہ کی عظمت کا معتقد ہے، اس سے اشتباہ نہیں ہوا ہے جو کچھ سنا ہے اسے یاد رکھا ہے اس میں نہ کمی کی ہے نہ زیادتی، یہ ناسخ اور منسوخ دونوں کو جانتا ہے کیونکہ پیغمبرؐ کے قول میں ناسخ ومنسوخ ہے، محکم ومتشابہ ہے، خاص وعام ہے، کبھی رسول اللہؐ کی کلام میں دو وجہ پائے جاتے ہیں، عام اور خاص کلام پایا جاتا ہے، جسطرح قرآن میں ہے۔

خداوندعالم نے اپنی کتاب میں فرمایا ''جو کچھ بھی رسول تمہیں دے دے اسے لے لو اور جس چیز سے منع کردے اس سے رک جاؤ'' جس کے بارے میں وہ نہیں جانتے تھے یا انھیں معلوم نہیں ہوتے تھے ان کے بارے میں اشتباہ کرتے تھے کہ خدا اور رسول اللہؐ نے اس سے کیا مراد لیا ہے اور رسولؐ کے تمام اصحاب ایسے نہ تھے کہ وہ پیغمبر سے کسی چیز کے بارے میں از خود پوچھتے اور جان لیتے کیونکہ اصحاب میں سے بعض ایسے تھے جو سوال نہیں

کرتے تھے تفسیر نہیں پوچھتے تھے اوران افراد کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ باہر سے کوئی عرب بدو یا کوئی تازہ آنے والا آئے اور سوال کرے تا کہ لوگ سنیں لیکن میں پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں ہر دن حاضر ہوتا تھا ہر رات حاضر ہوتا تھا پیغمبرؐ مجھے خلوت فرماتے تھے آپؐ جہاں بھی تشریف لے جاتے میں ان کے ساتھ ہوتا تھا اور یہ بات اصحاب رسولؐ جانتے ہیں کہ پیغمبر میرے ساتھ کیسا سلوک فرماتے تھے اور ایسا سلوک میرے سوا کسی سے نہیں کیا کرتے تھے اور کبھی میں اپنے گھر میں ہوتا تو پیغمبرؐ تشریف لاتے اور اگر میں پیغمبرؐ کے گھر جاتا تو وہ مجھے خلوت فرماتے تھے جب میں ان کے گھر جاتا تو وہ اپنی بیویوں کو وہاں سے ہٹا دیتے تھے تا کہ آپؐ کے پاس میرے علاوہ کوئی اور نہ رہے اور اگر میرے گھر تشریف لاتے تو حضرت فاطمہؑ اور میری اولاد میرے ساتھ نہ ہوتے، جب میں پیغمبر سے سوال کرتا تو وہ جواب فرماتے اور جب میں خاموش ہوتا تو پیغمبر از خود گفتگو فرماتے۔ پیغمبر پر کوئی آیت ایسی نہیں اتری جو انھوں نے مجھے نہ بتائی ہو، مجھے اسکی املا اسکی تاویل اور تفسیر نہ سکھائی ہو، مجھے ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ، خاص و عام سب کا علم دیا اور خدا سے دعا کی کہ مجھے ان آیات کا فہم دے۔ لہٰذا میں کوئی آیت نہیں بھولا اور کوئی ایسا علم نہیں کہ جسے مجھے املاء بتایا ہو اور میں نے اسے لکھنے کے بعد انھوں نے خدا سے میرے حق میں دعا نہ کی ہو۔ مجھے پیغمبرؐ نے جو حلال و حرام، امر و نہی، جو گذر گیا اور جو آنے والا ہے، سب بتایا اور میں اس میں سے کچھ نہیں بھولا اور ہر اطاعت اور معصیت کے بارے میں مجھے تعلیم دی اور میں ایک حرف بھی نہیں بھولا۔

تفسیر کس دور میں وجود میں آئی

دین اسلام کے مسلمات میں سے ہے کہ قرآن ایک علمی کتاب نہیں کہ جسے پیغمبر اکرمؐ علمی نظریات کی تفسیر و توضیح کیلئے لے کر آئے ہوں بلکہ یہ ایک کتاب ہدایت ہے جسکا بنیادی مقصد جاہل معاشرے کو تغیر دینا ہے اور امت اسلامی کا ان افکار و نظریات پر بنیاد رکھنا ہے جسے پیغمبر اکرمؐ لے کر آئے ہیں۔ ان اہداف و غایات کا حصول ایک تدریجی

عمل ہے تا کہ مسائل کو بروقت حل کیا جائے یعنی مشکلات کو اپنے مناسب مقام پر حل کیا جائے اور اس سلسلے میں تغیر اور تعمیر کیلئے تدریج اور بردباری کے جو تقاضے ہیں انھیں پورا کیا جائے۔ تا کہ اجتماعی اور انسانی تمام میدانوں میں انقلاب آجائے یہ انقلاب انسانِ مسلمان کے داخل سے نکلا ہوا ہو کہ معاشرہ کی اوپر کی تعمیر ہو سکے۔

اسی وجہ سے اس وقت کے مسلمان عام طور پر یہ احساس نہیں کرتے تھے کہ قرآن کے الفاظ کے بارے میں مکمل آگاہی اور شعور حاصل کریں وہ قرآن کو اس انداز سے نہیں دیکھتے تھے کہ جسطرح علمی کتب کو دیکھا جاتا تھا یعنی وہ تجزیہ اور تحقیق کے انداز سے قرآن کو نہیں دیکھتے تھے بلکہ وہ لوگ قرآن کریم کے بارے میں ایک سادہ شعور رکھتے تھے جو انکی حیات و زندگی کے ساتھ ہوتے تھے اور قرآن کریم میں مختلف قسم کے موجود تھے لہٰذا وہ اپنی روحی و سیاسی مشکلات کا علاج اس سے کرتے اور اپنی جاہلیت کے افکار کو اس کے ذریعے مسترد کرتے۔ اہل کتاب کے عقائد اور اجتماعی انحرافات پر نقد و تنقید کرتے اور جو آنے والے زمانہ کی مشکلات ہیں وہ اس کے ذریعے حل کرتے اور ان تمام امور کو ایک دوسرے سے جوڑتے یعنی دین، کائنات، معاشرہ اور اخلاق کے بارے میں نظریات کو آپس میں جوڑتے۔

یہ سب چیزیں قرآن نے بروقت انجام دیں لیکن تدریجی طور پر اور عام مسلمانوں کیلئے اس کی طرف دیکھنا ممکن تھا اور اس کی طرف ایک ایسے واقعہ کی طرح دیکھ سکتے تھے جو ان کے اجتماعی زندگی کے ایک جزء کو تشکیل دیتا ہے اور اس وقت کے مسلمان اسی سادہ نظریّہ کو جو قرآن کے بارے میں رکھتے تھے انہی سے وہ لوگ قرآن کو سمجھتے تھے اور ان کے پاس جو عمومی آگاہی تھی اسی کی بنیاد پر قرآن کو سمجھتے تھے۔ اور ان عمومی آگاہی سے مراد وہ تمام معلومات ہیں جو انسان کو اپنی عادی زندگی میں حاصل ہوتی ہیں۔ ان عمومی آگاہی کو جس کے ذریعے مسلمان نص قرآنی کو سمجھتے ہیں ذیل میں خلاصۃً بیان کریں گے:

ا۔ لغت کے مفاہیم عام تھے: قرآن عربی زبان میں نازل ہوا جو اس زمانے میں

مسلمانوں کی زبان تھی اسلام کا وجود اتنا نہیں پھیلا تھا دوسری اقوام کیلئے اسلام کے دروازے نہیں کھلے تھے یہ لغت کی ثقافت جو مسلمانوں کو میّسر تھی وہ اسی انداز سے اجمالی طور پر قرآن کو سمجھتے تھے۔

۲۔مسلمان اسباب نزول اور اسلامی واقعات کے ساتھ آمیختہ تھے۔

۳۔عربی رسم ورواج اور عادات کو سمجھنے میں سب مشترک تھے: ہم جانتے ہیں کہ قرآن کریم نے بعض عادات اور رسومات سے جنگ لڑی ہے اور ان کو چیلنج کیا ہے اور عرب اپنے اجتماعی حالات کی وجہ سے ان عادات سے کیا مراد ہیں سب جانتے تھے اور ان عادات کے جدید مفہوم سے بھی واقف تھے چنانچہ ان کا ان آیات کے معانی کو جاننا ایک طبیعی بات تھی۔:

﴿انـماالنّسیٓء زیادةٌ فی الْکفُر ......﴾ ''(حرمت کے مہینوں میں) تقدیم وتاخیر بے شک کفر میں اضافہ کرنا ہے توبہ/۳۷)''

﴿ولیس البرّ بانْ تاتوا الْبیوُت من ظھورھا ﴾''پشت خانہ سے داخل ہونا کوئی نیکی نہیں ہے''(بقرہ/۱۸۹)

﴿یاایّھاالّذین امنوْاانّماالْخمر والمیُسر والْانصاب والازلام رجسٌ ﴾''اے ایمان والو! جوا اور مقدس تھان اور پانسے سب ناپاک شیطانی عمل ہیں''(مائدہ/۹۰)

وہ لوگ لفظ نسی کے بارے میں جانتے تھے وہ چھت سے آنے کے بارے میں جانتے تھے انصاب اور ازلام کو بھی جانتے تھے۔ یہ ایسے امور تھے کہ جو جاہل معاشرہ میں موجود تھے۔

۴۔رسول اکرمؐ خود مسلمانوں کی عادی زندگی کے حالات کی تفسیر فرماتے تھے۔

قرآن کریم اور اس کے معانی کے بارے میں مسلمانوں کے ذہنوں میں جو سوالات پیدا ہوتے تھے ان کا جواب فرماتے تھے اور آپؐ کے مقام ومنزلت کے حوالہ سے جو ذمہ داری بنتی تھی اس وجہ سے آپ مناسبات اور مواقع پر نص قرآنی کی تشریح فرماتے تھے چاہے وہ موعظہ ہو یا راہنمائی کرنا ہو یا اللہ کی راہ یا اسلام کی طرف رغبت دلانا ہو۔

یہ عناصر درحقیقت مسلمانوں کی قرآن کریم کے سادہ فہم ہونے کی ایک مثال ہے چونکہ یہ وہ عناصر ہیں جو مسلمانوں کے عام زندگی میں ہوتے تھے اور اس میں ذہنی جہد وکوشش اور تکلف اور کسی علمی سرمایہ گزاری کی ضرورت نہیں رہتی۔ ہمارے پاس چند نصوص موجود ہیں جو اس مدعا کیلئے کافی ہیں کہ اس وقت کے لوگ سادہ زبان میں اور اپنی فکر کے تحت قرآن کو سمجھتے تھے۔ جیسے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب کے لئے کلمہ ابًّا سمجھنا مشکل تھا، عدی بن حاتم اس وقت حیرت میں پڑ گے جب یہ آیت پڑھی ﴿حتّٰی یتبیـن لـکم الخیط الابیض من الخیط الاسود ﴾ اسی طرح مسلمانوں کا ایک گروہ اس حیرت میں ان کے شریک تھا، اسی طرح ابن عباس کو فاطر کے معنی سمجھ میں نہیں آیا اور کسی اعرابی کے ذریعے معلوم ہوا۔

یہ واقعات وحوادث واضح کرتے ہیں کہ نزول قرآن کے وقت مسلمانوں کی کیا حالت تھی۔ مسلمانوں کے سادہ فہم ہونے کی ایک دلیل شاید یہ بھی ہو کہ ہمیں قرآن کے بارے میں مسلمانوں کے درمیان متعدد قرأتیں نظر آتی ہیں جو اصحاب کرام میں سے بعض قراء کے قرآنی کلمہ لکھنے میں سستی برتنے سے نکلے ہیں اور ان کی ایسی صورت میں قرآئت کرنے سے نکلے ہیں کہ جو عصر نزول قرآن میں بعض لغوی جہات سے متفق تھے اور بعد کے مسلمانوں نے اسے ایک قرآئت اسلامی سمجھ کر اخذ کر لیا اور پھر اسکو پیغمبر کی طرف نسبت دی۔

اس وقت کے مسلمان قرآن کو سادہ انداز میں سمجھتے تھے ممکن ہے اسکے عوامل میں سے ایک پیغمبر اکرمؐ کی وہ زندگی ہے جو مشقت اور حوادث سے بھری تھی اور مسلمانوں کی زندگی عام طور پر اسی سے متاثر ہوئی تھی جیسا کہ ذکر ہوا کہ امیر المومنینؑ کی اپنی گفتگو میں جسے ثقہ اسلام شیخ کلینیؒ نے نقل کیا ہے اس طرف اشارہ ہے کہ اس وقت صحابہ کرام کس حالت میں تھے چنانچہ جناب امیرؑ نے فرمایا''ایک شخص نے رسولؐ سے سنا لیکن اسے اسی انداز سے حفظ نہیں کیا پھر اس میں اس نے گمان سے کام لیا اور کسی نے اس میں عمداً جھوٹ نہیں بولا لیکن ایک تیسرا شخص ہے جس نے رسول اللہؐ سے کسی چیز کے بارے میں حکم کرتے ہوئے

سنا ہے لیکن بعد میں آپ ؐ نے اس سے نہی کیا ہے لیکن وہ شخص اسے نہیں جانتا یا اس نے کسی چیز سے منع کرتے سنا ہے پھر اس کے بعد کرنے کا حکم دیا ہے لیکن وہ شخص اسے نہیں جانتا۔ لہٰذا اس نے منسوخ کو یاد رکھا ہے اور ناسخ کو نہیں جانتا''لوگوں کی قرآن کے بارے میں سادہ فہمی پیغمبر ؐ کی قیادت کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ پیغمبر کی زندگی مشکلات سے بھری ہوئی تھی انکے پاس اتنا موقع اور فرصت نہیں تھی کہ وہ عام مسلمانوں تک قرآن کی واضح انداز میں تفسیر کرتے یعنی عمومیت اور وسیع انداز میں تفسیر کرتے۔ ہمیں یہاں اس بات کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس وقت کے تمام لوگوں کا قرآن کریم کے بارے میں سادہ فہم ہونا پیغمبر اکرم ؐ کے دور قیادت کے ذمہ داری کے منافی نہیں ہے کیونکہ ہم یہ جان چکے ہیں کہ رسول اکرم ؐ نے اپنی زندگی مشکل اعمال اور واقعات میں گزاری اور ان کو یہ فرصت اور موقع فراہم نہیں ہوا کہ آپ ؐ عام مسلمانوں کیلئے قرآن کریم کی تفسیر فرماتے۔

درس اول

اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم
وأفضل الصلوات علی سید الخلق محمد و علی آلہٖ الطیبین الطاھرین.
ربنا فقھنا فی کتابک و اکشف عن قلوبنا ظلمات الذنوب لکی نتفھم آیاتک وأزح عن بصائرنا غشاوۃ الدنیا و بریقھا الکاذب لکی نملأ نفوسنا بھداک و اجعلنا من حملۃ قرآنک و سنۃ نبیک و السائرین علی طریق طاعتک ندعو بلغۃ القرآن و بلسان القرآن:

خداوندا ہمیں اپنی کتاب سے آگاہ فرمائے اور ہمارے دلوں سے گناہوں کی تاریکی کو ہٹا دے تا کہ تیری آیات کو سمجھ سکیں اور ہماری بصیرت سے دنیا کے پردے اور اسکی جھوٹی روشنائی کو ہٹا دے تا کہ ہمارے نفوس تیری ہدایت سے پُر ہو جائیں۔ ہمیں اپنے قرآن اور نبی ؐ کی سنت کا حامل بنا اور اپنی اطاعت کے راستہ پر چلنے والوں میں سے قرار دے۔ ہم تجھ سے اس سلسلے میں قرآنی لغت اور زبان قرآنی میں دعا کرتے ہیں:

﴿**ربنا اتمم لنا نورنا و اغفرلنا انک علی کل شئی قدیر**﴾ ''پروردگار ہمارا نور ہمارے لئے پورا کر دے اور ہم سے درگزر فرما بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔'' (تحریم/۸)

﴿**ربنا لاتؤاخذنآ ان نسینآ او اخطانا ربنا و لاتحمل علینآ اصرًا کما حملتہ علی الذین من قبلنا ربنا و لاتحملنا مالا طاقۃ لنا بہٖ و اعف عنا و اغفرلنا و ارحمنا انت مولٰنا فانصرنا علیٰ القوم الکٰفرین**﴾ ''پروردگار ہم جو بھول جائیں یا ہم سے غلطی ہو جائے اس کا ہم سے مواخذہ نہ کرنا۔ خدایا ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈالنا جیسا پہلے والی امتوں پر ڈالا گیا ہے۔ پروردگار ہم پر وہ بار نہ ڈالنا جس کی ہم میں طاقت نہ ہو۔ ہمیں معاف کر دینا، ہمیں بخش دینا، ہم پر رحم کرنا تو ہمارا مولا اور مالک ہے

اب کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔'' (بقرہ/۲۸۶)

﴿ربنااغفرلناولاخوانناالذین سبقونابالایمان ولاتجعل فی قلوبناغلاّللذین اٰمنواربنآانک رءُوف رحیم﴾ ''پروردگار! ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں اور ہمارے دلوں میں ایمان لانے والوں کے لئے کوئی عداوت نہ رکھ۔ ہمارے رب! تو یقیناً بڑا مہربان، رحم کرنے والا ہے''

(حشر/۱۰)

تفاسیر میں مختلف اقسام اور اس بارے میں مختلف آراء و نظریات کے پائے جانے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ اور بعض مواقع تو اس کے مختلف پہلوؤں اور جہت کو اہمیت دینے کے بارے میں تباین اور تضاد بھی نظر آتا ہے۔ بطور مثال ایک گروہ نے اپنی کاوش کو قرآن کی آیات کی ادبی زاویے سے تفسیر کرنے پر مرکوز کیا یعنی نص قرآنی کی لفظی ،ادبی اور بلاغت کے پہلو کو بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ جبکہ ایک گروہ نے قرآنی آیات کے مفاہیم ،مضمون اور معانی کی تفسیر کی طرف توجہ دی ہے۔ اسکے علاوہ ایک گروہ نے اہل بیتؑ ،صحابہ کرامؓ اور تابعین سے مروی روایات کو بنیاد بنا کر قرآن کی تفسیر کی ہے۔ جبکہ ایک گروہ نے کتاب خدا کی تفسیر کیلئے عقل کو ذریعہ بنایا ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جو تفسیر قرآن میں علماء گذشتگان وسلف کے نظریات پر توقف کیا ہے اور آیات قرآنی کو ان کی نظریات پر منطبق کرتا ہے۔ اسکے علاوہ ایک گروہ وہ ہے جو آیات قرآنی کی تفسیر میں غیر جانبدارای طور پر آیات قرآنی کی خود آیات سے ہی تفسیر کرتا ہے اور قرآن سے ہی معنی اخذ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن ساتھ میں اپنی آراء کو قرآن پر منطبق کرتا ہے قرآن کو اپنی آراء پر مختلف نہیں کرتا۔ ان کے علاوہ تفاسیر اسلامی میں اور بھی منطبق زاویے پائے جاتے ہیں۔

لیکن جو چیز خصوصی طور پر ہمارے لئے ضروری ہے اور ہم اس وقت قرآن سے انہی ابواب کے بارے میں جاننا چاہ رہے ہیں۔ وہ تفسیر قرآن کے سلسلے میں فکر اسلامی میں پائے جانے والے دو طریقے ہیں، ان میں سے ایک راستہ تفسیر تجزئی کے نام سے پکارا جاتا

ہے اور دوسرا کو تفسیر موضوعی یا توحیدی سے۔ تفسیر تجزئی سے مراد یہ ہے کہ مفسرِ قرآن، قرآن کی ایک ایک آیت کو جس ترتیب سے خود مصحف شریف میں ہے اسی ترتیب وتسلسل سے تفسیر کرتا ہے اس نہج پر مفسر خود قرآن کے ساتھ حرکت کرتا ہے اور اس کی ہر قطعہ قطعہ کی تدریجاً تفسیر کرتا ہے اور تفسیر کرنے میں جو وسائل وذرائع ممد ومعاون ہوں ان پر اعتماد کرتا ہے آیات کی ظہور یا احادیث جو اس سلسلے میں وارد ہوئی ہیں یا وہ آیات ہیں جو اس آیت کی اصطلاح یا مفہوم میں مشترک ہیں۔ ان وسائل وذرائع پر اعتماد اس حد تک ہوتا ہے کہ آیت کی جس حصہ کی وہ تفسیر کرنا چاہ رہے ہیں اس کے معانی روشن اور واضح ہو جاتے ہیں، ساتھ میں جس سیاق میں یہ حصہ واقع ہوا ہے اس کو بھی مدنظر رکھتے ہیں۔

جب ہم تفسیر تجزئی کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو ہمارے سامنے وہ وسیع و کامل شکل ہوتی ہے جس کی انتہا اس تفسیر پر ہوتی ہے۔ تاریخ میں اسکا سفر تدریجی ہے اب اس نے پورے قرآن کا احاطہ کیا ہے۔

یہ تفسیر صحابہ کرام اور تابعین کے زمانہ سے شروع ہوئی۔ اس وقت بعض آیات کی یا بعض مفردات کی تفسیر تجزئی ہوتی تھی لیکن گردش زمانہ کے ساتھ ساتھ مزید آیات قرآنی کی تفسیر کی حاجت بڑھتی گئی اور اس کی انتہا وہاں ہوئی جہاں پر ابن ماجہ اور طبری وغیرہ نے قدم اٹھایا۔ انھوں نے تیرہویں صدی کے آواخر اور چودہویں صدی کے اوائل میں تفسیر کی باقاعدہ کتابیں لکھیں۔ یہ تفسیریں منہج تجزئی کی کامل ترین صورت ہیں۔

تفسیر تجزئی کا طریقہ یہ ہے مثلاً کلمہ ''الـلہٰ'' کا معنی سمجھنا چاہتا ہے چونکہ اللہ کا معنی سمجھنا ابتدائی دور میں بہت سارے لوگوں کیلئے آسان تھا پھر اس لفظ میں گزشتہ زمانہ گزرنے زمان کے ساتھ زیادہ فاصلہ پیدا ہوا نئے تجربات اور قدروں کا انبار نئے حالات اور واقعات کے ڈھیر سے اس لفظ کے معانی میں پیچیدگیاں اور غموض پیدا ہوئے۔

یہاں سے تفسیر تجزئی میں وسعت شروع ہوئی کیونکہ آیات قرآنی میں غموض (غیر فہم وغیر واضح) پیش آیا اور اسی طرح لفظ اللہ کے معنی معین کرنے میں شک کرنے لگے

اور موضوعات تفسیر جو ہم دیکھ رہے ہیں وہاں پر اس تفسیر کی اختتام ہوئی کہ جس میں مفسر سورہ حمد کی پہلی آیت سے شروع کرتے ہیں اور سورہ الناس تک ہر ایک ایک آیت کی تفسیر لکھتے ہیں کیونکہ زمانہ گزرنے کے ساتھ بہت ساری آیت کا بہت ساری آیات کے لفظی معنیٰ اور مدلول کو سمجھنے کیلئے نئے وسائل اور تجربات وغیرہ کے ساتھ معانی کرنے کی ضرورت کا احساس ہوا۔ یہ وہ تفسیر تجزئی ہے۔

اس نہج تفسیری میں تجزئی سے ہماری مراد یہ نہیں کہ مفسر کی نظریں ساری آیات سے منقطع ہوتی ہیں اور مورد بحث آیت کے سمجھنے کیلئے دوسری آیات سے مدد نہیں لیتے ہوں نہیں بلکہ وہ دوسری آیات سے مدد لیتے ہیں جسطرح آیت کی تفسیر کیلئے احادیث اور روایات سے مدد لیتے ہیں لیکن چونکہ ان کا مقصد صرف الفاظ کے لفظی معنیٰ کو سمجھنا ہوتا ہے لہٰذا یہ صرف اسی حد تک مدد لیتے ہیں یعنی جو آیت یا لفظ انکے سامنے ہے ان کی نظر اسی تک محدود ہے۔ ان کا ہدف جزئی ہوتا ہے کیونکہ وہ ہمیشہ نص قرآنی میں سے اس جزء کو سمجھنے تک محدود ہوتا ہے اور اسکی حدود سے باہر نہیں جاتے۔ یعنی قرآن کے لفظی معنی کی حد تک تفسیر جزئی کا کردار موجود ہے پوری قرآن کریم کی تفسیر تجزئی کا ماحصل اس کی تجزئی نظر کو ملاحظہ کرتے ہوئے مدلولات قرآن کریم کے مجموعہ کا ایک بہت اچھا حصہ ہے لیکن پراگندہ اور منتشر شکل میں ہے۔ نہ ان کے آپس کے ارتباط کے وجوہات بیان ہوئے ہیں اور نہ افکار کے اس مجموعہ کو الگ الگ حصہ کرنے کی ترکیب کو کشف کیا ہے اور نہ ہم نے اس زندگی کے مختلف میدانوں کے بارے میں قرآنی نظریہ کو اخذ کیا ہے۔ البتہ آپ کے پاس معلومات کا ایک ذخیرہ ضرور موجود ہوگا۔

مگر ان معلومات کے مجموعہ اور ان کے درمیان ارتباط (کہ جس سے نظریہ اور فکری مجموعہ بنتا ہے) سے ممکن ہے ہم مختلف میدانوں اور جگہوں کے لئے قرآنی نظریہ حاصل کر سکیں لیکن یہ منہج تفسیر تجزئی کا ذاتی ہدف ومقصد نہیں ہے اگرچہ کبھی احیاناً حاصل بھی ہو جاتا ہے۔

نہج تجزئی میں تفسیر کے حوالہ سے منتشر اور پراگندہ ہونے کی وجہ سے یہ جامعہ اسلامی میں مختلف مذہبی تناقضات کے ظہور کا سبب بنے۔ کیونکہ یہی کافی تھا کہ اس مفسر یا اُس مفسر کے لئے ایک آیت واضح ہو جاتی جو اسکے فرقہ کی تائید کرے تاکہ اس کا اعلان کرے اور لوگوں کو اپنے گرد اکٹھا کر یے چنانچہ علم الکلام کے مسائل میں ایسا بہت واقع ہوا ہے جیسے مسئلۂ جبر وتفویض واختیار وغیرہ۔ حالانکہ مفسرین تفسیر تجزئی اسی وقت ان اختلافات کو ختم کر سکتے تھے اس صورت میں ایک قدم اور آگے بڑھاتے اور صرف عددی ذخائر کے جمع کرنے پر ہی اکتفاء نہ کرتے۔ چنانچہ آپکو یہ چیز تفسیر کی دوسری قسم میں ملے گی۔

تفسیر توحیدی یا موضوعی

قرآنی تفاسیر کی دوسری نہج تفسیر موضوعی ہے۔ اس میں تفسیر تجزئی کی طرح قرآن کی صرف ایک ایک آیت کو مفسر سامنے نہیں رکھتا بلکہ یہ زندگی کے مختلف شعبوں مثلاً عقائد، اجتماعیات یا تکوینیات میں سے کسی ایک کے بارے میں قرآن سے گفتگو کرنا چاہتا ہے ۔ پھر وہ بیان کرتا ہے اور موضوعات پر بحث کرتا ہے عقیدۂ توحید قرآن کے نظر میں، نبوت قرآنی نقطہ ونظر سے، اقتصاد پر قرآنی نظریہ یا سننِ تاریخ قرآنی حوالہ سے یا آسمان وزمین کے بارے میں قرآنی نظریہ کو پیش کرتا ہے۔

قرآن کی تفسیر توحیدی یا موضوعی کا مقصد منتخب موضوع کے بارے میں قرآنی نظریہ پیش کرنا ہے اور نتیجتاً زندگی اور کائنات کے موضوعات میں سے اُس معین موضوع کے بارے میں اسلامی نظریّہ کو ثابت کرنا ہے۔

یہ واضح ہونے کی ضرورت ہے کہ تفسیر کے ان دونوں طریقوں میں فاصلہ عملی اعتبار سے اور طول تاریخ میں بالکل الگ تھلگ نہیں ہے کیونکہ تفسیر موضوعی طبیعی طور پر ان آیات کی مدلولات تجزئی کی محتاج ہے جن سے وہ ایک موضوع کو نکالنا چاہ رہا ہے۔ اسی طرح تفسیر تجزئی مثلاً قیامت کے بارے میں بحث کرتے وقت حقیقت قرآنیہ کی محتاج

ہے۔لیکن بہرحال یہ دونوں طریقے کلی طور پر اہداف انظار اور مصلحتوں کے حوالہ سے مختلف ہیں۔

تفسیر تجزئی کو اتنے مشہور ہونے اور صدیوں تک اس کا سیطرہ رہنے میں جو مدد ملی ہے وہ کچھ روایات اور احادیث ہیں یہ تفسیر حقیقت میں اور ابتداء میں حدیث کا ہی ایک شعبہ ہے۔تفسیر کی بنیاد حدیث ہوتی تھی اسکے علاوہ کچھ ادبی، اور تاریخی مواد بھی مفسر کے پیش نظر ہوتا تھا۔اس حقیقت کی روشنی میں یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ اس وقت تفسیر صرف انہی احادیث تک محدود تھی جو پیغمبر اکرمؐ، صحابہ و تابعین سے وارد ہوئی تھیں۔لیکن جب لوگوں کی طرف سے عقلی سوالات ہونا شروع ہوئے تو مفسرین کے بس میں نہ تھا کہ وہ صرف ان احادیث کو بنیاد بنا کر لوگوں کے سوالات کے جواب دیں۔لہٰذا قرآنی مفاہیم اور دیگر چیزوں میں موازنہ کرنا اور کوئی حل نکالنا مشکل ہوگیا۔اسکے علاوہ انکے لئے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ ایک اور قدم اٹھاتے اور قرآن کریم کے مدلولات کو آپس میں ترتیب دیتے اور ان لفظی مدلولات کے ذریعے کوئی نظریہ اخذ کرتے۔تفسیر تجزئی اپنی ابتدائی سرشت میں ایک لفظی اور مفردات کی تفسیر تھی لیکن جب مفردات میں تبدیلی آئی اور بعض نئی اصطلاحات کی شرح ہونے لگی اور بعض مفاہیم اسباب النزول قرآن سے تطبیق ہونے لگے تو اس کام میں مدلول لغوی اور لفظی سے ہٹ کر اجتہاد اور نئے طریقہ سے ممکن نہیں تھا اور ایسے طریقے سے قرآن کریم کے اساسی افکار کہ جو آیت کے ضمن سے نکل آتے ہیں وہاں تک بھی پہنچنا ممکن نہیں تھا۔

تفسیر اور فقہ میں موازنہ

ہم تفسیر کے ان دونوں مختلف طریقوں کو ایک مثال کے ذریعے آپ کے لئے زیادہ واضح کرسکتے ہیں وہ مثال ہے فقہ۔پیغمبر اکرمؐ و آئمہ اطہارؑ سے احادیث وارد ہوئی ہیں کہ فقہ سے مراد انہی احادیث کی تفسیر ہیں۔فقہی بحث میں ہم جانتے ہیں کہ ایک فقہی کتاب لکھی گئی ہے جس میں احادیث کو ایک ایک کر کے تشریح کی ہے پوری حدیث شامل

ہیں، فقہی میدان میں تفسیر احادیث کی منہج اور اس کے متن، سند اور دلالت کے بارے میں بحث کی ہے یا شارحوں کے مختلف مناہج کے تحت سند، دلالت اور متن پر بحث کرتے ہیں جسے ہم اپنی کتب اربعہ اور وسائل کی شرح لکھنے والوں سے معلوم کرسکتے ہیں۔لیکن کتب فقہی کی بڑی تعداد اور اس بارے میں علمی گفتگو کرنے والوں نے یہ طریقہ نہیں اپنایا۔بلکہ انھوں نے زندگی کے حالات کے مطابق پہلے مسائل کی تقسیم بندی کی اور پھر ان سے مربوط احادیث کو اس میں جمع کیا اور پھر ان احادیث کی اتنی تفسیر کی کہ جس سے یہ مسئلہ واضح اور روشن ہوجائے اور اس بارے میں اسلام کا نقطہ نظر معلوم ہوجائے یہ فقہی میدان میں طریقہ موضوعی ہے جبکہ پہلے بیان کردہ طریقہ تجزئی تھا۔کتاب ''جواہر'' روایاتِ کتب اربعہ کی ایک قسم کی شرح ہے۔کتب اربعہ میں موجود تمام روایات کی کامل شرح لیکن ایسی شرح نہیں جس میں کتبِ اربعہ کے روایات کی بتداء سے ایک ایک حدیث کی تشریح کی گئی ہو بلکہ اس میں زندگی کو درپیش مسائل سے متعلق احادیث کی موضوع کے لحاظ سے تقسیم بندی کی گئی ہے۔مثلاً کتاب بیع، کتاب جعالہ، کتاب احیاء واموات اور کتاب نکاح وغیرہ۔پھر ان عناوین میں سے ہر عنوان کے ذیل میں اس کے بارے میں روایات کو جمع کر کے تشریح کی ہے اور ان کا آپس میں ربط دیا ہے اور پھر تجزیہ و تحلیل کے بعد اسلامی نقطہ نظر کو پیش کیا گیا ہے کیونکہ نظریہ کے استخراج کے لئے صرف اس روایت کا الگ اور اس روایت کا الگ معنی سمجھنا کافی نہیں ہے۔اس طرح انسان کا حکم شرعی تک رسائی ممکن نہیں بلکہ حکم شرعی تک پہنچنے کے لئے تمام روایات کو جو اس بارے میں ہیں جمع کر کے ایک نظریہ نکالتے ہی کہ جو روایت کے مجموعہ سے نکلتی ہے نہ کہ ایک ایک روایت سے۔یہ ہے احادیث میں اتجاہ موضوعی۔

ہم جب درس قرآن اور فقہ کا موازنہ کرتے ہیں تو دونوں میدانوں میں واضح اختلاف نظر آتے ہیں۔فقہ کے میدان میں تجزئی و موضوعی دونوں مناہج نظر آتے ہیں کیونکہ فقہ نے بہت سے میدانوں میں قدم آگے بڑھائے ہیں۔لہٰذا یہ نہج اس کے اہم ابحاث میں شامل ہوا ہے جبکہ تفسیر قرآن پر تیرہ سو سال میں صرف تفسیر تجزئی ہی سیطرہ رہا ہے۔ہر مفسر

نے اپنی تفسیر کا آغاز وہاں سے ہی شروع کیا جہاں سے پہلے علماء نے شروع کیا تھا لہٰذا آیت آیت کر کے قرآن کی تفسیر لکھی گئی۔ اس سے واضح ہوا کہ فقہ میں نہج موضوعی غالب تھی جبکہ قرآن میں تجزئی۔

لیکن قرآن کی تفسیر تجزئی میں ہمیں کہیں کہیں بعض مفسرین موضوعاتی حوالے سے گفتگو کرتے نظر آتے ہیں کہ وہاں ایک معین موضوع کے بارے میں بحث کرتے ہیں کہ جو قرآن کریم سے متعلق ہے جیسے اسباب نزول قرآن، ناسخ ومنسوخ جیسے موضوعات۔ لیکن یہ درحقیقت اس تفسیر موضوعی اور توحیدی کے معنی میں نہیں ہے کہ جس معنی پر ہم گفتگو کر رہے ہیں بلکہ اس میں تفسیر تجزئی کے ان موضوعات کو ایک جگہ جمع کیا گیا ہے جن کے آپس میں ایک قسم کی شباہت پائی جاتی ہے جسکی وجہ سے ہمیں یہ موضوعی نظر آرہا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں بتادیں کہ ہر مطالب کے جمع کرنے اور کچھ مطالب کے نکالنے کو موضوعی نہیں کہا جاتا بلکہ ہماری تفسیر موضوعی سے مراد یہ ہے کہ انسانی زندگی سے مربوط مسائل میں سے کسی ایک کو موضوع بنایا جائے جیسے عقائد، اجتماعیات، کائنات وغیرہ پھر اس میں قرآنی زاویہ سے تجزیہ وتحلیل کرتے ہیں تاکہ اس بارے میں قرآن کا نقطہ نظر معلوم ہو سکے۔

میرے خیال میں فقہ کے اتنے میدانوں میں وسعت اور خود کفیل ہونے کا راز اسکی نہج توحیدی اور موضوعی ہے اور اسی طرح قرآن میں جمود کی وجہ اسکی تفسیر تجزئی ہے۔ گویا تکرار ہی تکرار ہے صدیاں گذر گئیں لیکن کوئی نئی فکر وجود میں نہیں آئی۔ حتی کہ ہم یہاں تک بھی بیان کرسکتے ہیں: تفاسیر طبری، رازی اور شیخ طوسی کے بعد طویل عرصہ سے زمان منجمد ہے۔ اس عرصہ میں کوئی جدید اسلامی فکر وجود میں نہیں آئی، اور تفسیر اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہیں کر رہی۔ اگر ہوئی ہے تو بھی بہت ہی مختصر جبکہ انسانی زندگی کتنے ہی مراحل سے گذر چکی ہے اور سابقہ زمانے سے بالکل مختلف ہے۔ ہم انشاء اللہ ان دونوں طریقوں کے فرق کو بیان کرتے وقت یہ بھی واضح کریں گے کہ ایک میں جمود اور دوسرے میں نمو پانے کے کیا اسرار و رموز ہیں۔

اتجاہ تجزئی اور موضوعی میں پائے جانے والے فرق:۔

روش تفسیر تجزئی کیوں ہماری فکر کو جامد کرنے کا سبب بنی اور موضوعی کیوں فکر کو ابتکار اور اجتہاد میں وسعت لانے کا سبب بنی۔

یہ جاننے کے لئے کہ کیوں ایک میں جمود اور دوسرے میں نمو ہے ضروری ہے کہ ہم ان دو راستوں کی مزید وضاحت کریں البتہ ہم اس کی وضاحت ان دونوں کے درمیان موجود بعض اختلافات کو بیان کرنے کے بعد ہی کریں گے۔

ان دونوں تفاسیر کے مناہج کے درمیان موجود واضح فرق شاید مندرجہ ذیل ہوں:

اتجاہ تجزئی میں کردار منفی ہے اور اتجاہ موضوعی میں کردار مثبت:

تفسیر تجزئی کرنے والا مفسر اپنا کردار ہمیشہ منفی رکھتا ہے وہ ایک آیت یا ایک حصہ کو معین کرتا ہے۔ اس کے پاس اس سے متعلق پہلے سے کوئی معلومات یا مفروضات نہیں ہیں۔ وہ صرف اسکے معنی یا اس سے متصل قرینے سے استفادہ کرتا ہے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں اسکا کام صرف ایک نص قرآنی کو سمجھنا ہے اور قرآن اسکو بتاتا ہے اور یہ سنتا ہے۔ قرآن متکلم ہے اور یہ اسکا سامع۔ یہ وہی ہے جسے ہم نے دور سلبی (منفی) نام رکھا ہے یہاں مفسر کا کام سننا ہے لیکن ایک صاف اور سادہ ذہن کے ساتھ سوائے آداب لغت اور کچھ تعبیرات کے معنی کے اسکے ذہن میں کچھ موجود نہیں ہوتے ہیں۔

اس طرح کی روح، ذہن اور فکر جو قرآن کے سامنے قرآن کو سننے کے لئے بیٹھا ہے پس اس کی حرکت ایک سلبی (منفی) حرکت ہے لیکن اس کی طرف قرآن کی حرکت، ایک حرکت ایجابی ہے اس وقت قرآن اسے عطا کرتا ہے اور وہ وہی سب کچھ لکھتا ہے جو اس نے مدلول لفظ سے سمجھے ہیں۔ جبکہ اسکے برعکس تفسیر موضوعی میں مفسر اپنا عمل نص قرآنی سے شروع نہیں کرتا بلکہ انسانی زندگی سے مربوط واقعات سے شروع کرتا ہے اور اپنی نظر کو زندگی کے مشکل موضوعات جیسے عقائد، اجتماعی اور کائناتی موضوع میں سے ایک

موضوع پر مرکوز کرتا ہے۔

اس موضوع کے لئے فکر انسانی نے جو مشکلات پیدا کی ہیں اور اب سے پہلے فکر انسانی نے اس کے حل کے لئے جو نظریہ پیش کیا ہے اور تاریخ میں جہاں جہاں اس کے بارے میں سوال چھوڑا گیا ہے اور وہ جواب سے خالی رہے ہیں ان سب پر وہ اپنی نظر کو مرکوز کرتے ہیں پھر وہ نص قرآنی کی طرف آتا ہے نہ اس لحاظ سے کہ اپنے آپ کو نص قرآنی کے سامنے صرف ایک مستمع کی شکل میں پیش کریں اور ایک ٹیپ کی مانند سنتا جائے بلکہ وہ نص قرآنی کے سامنے بشر کے اعمال اور بہت سارے افکار سے بھرے ہوئے ایک موضوع کے ساتھ پیش ہوتا ہے، پھر نص قرآنی سے گفتگو شروع کرتا ہے، مفسر سوال کرتا ہے اور قرآن اسے جواب دیتا ہے۔ یہاں مفسر بشر کے ناقص تجربات سے جو چیز حاصل ہوئی ہے کہ جو جہاں تک یہ مفسر جمع کر سکتے ہیں ان کو جمع کرتا ہے اور زمین پر مفکروں نے صحیح یا غلط اعمال جو انجام لائے ہیں خلاصہ وہ تمام چیز جو اس موضوع سے مربوط ہو اور اس کی قدرت میں ہو سب کو جمع کرتا ہے، پھر ان سے جدا ہوتا ہے تا کہ قرآن کے سامنے بیٹھیں وہ قرآن کے سامنے خاموشی اختیار کر کے صرف سننے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس کے ساتھ گفتگو کے لئے بیٹھ جاتے ہیں اس کے سامنے سوال کرنے، سمجھنے کے لئے مُدبّر کی شکل میں بیٹھتے ہیں اور اس موضوع کے بارے میں وہ نص قرآنی سے شروع کرتے ہیں اور اس سے اس کا ہدف ومقصد اس موضوع کے بارے میں قرآن کریم کے موقف کو کشف کرتے ہیں اور اس نظریہ کو کشف کرنا مقصود ہے جو اس موضوع میں موجود افکار اور نص قرآنی کے موازنہ کرنے سے آیات سے الہام ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تفسیر موضوعی کے نتائج ہمیشہ انسانی تجربات کی لہروں سے مربوط ہوتے ہیں کیونکہ اس تفسیر میں ہمیشہ زندگی کے مختلف شعبوں میں سے ایک شعبہ کے بارے میں اسلامی نظریہ بیان ہوتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ تفسیر موضوعی کا یہ کام قرآن کریم سے گفتگو اور طلب نطق کا کام ہے۔ اس میں صرف ایک منفی انداز کی قبولیت نہیں بلکہ اس میں ایک فعال وظیفہ شناس

قبولیت ہے۔ اس میں زندگی کے حقائق میں سے ایک حقیقت کشف کرنے کے لئے نص قرآنی کو راہنما بنایا جاتا ہے۔

امیر المؤمنین علیہ الصلاۃ والسلام نے (آپؑ قرآن کیطرف سے گفتگو) میں فرمایا:

﴿ذٰلک القرآن فاستنطقوه ولن ینطق ولکن اُخبرکم عنه ألا انّ فیه علمَ مایاتیَ والحدیث عن الماضیَ ودواء دائکم ونظم مابینکم﴾ ''اور وہ یہی قرآن ہے۔ اسے بُلوا کر دیکھو اور یہ خود نہیں بولے گا۔ میں اس طرف سے ترجمانی کروں گا۔ یاد رکھو کہ اس میں مستقبل کا علم ہے اور ماضی کی داستان ہے۔ تمہارے درد کی دوا ہے اور تمہارے امور کی تنظیم کا سامان ہے۔'' نہج البلاغہ (خ/۱۵۱، ص۲۹۴ جوادی)

یہ فرزند قرآن علیہ الصلاۃ والسلام کا قرآن سے گفتگو کرنے کی ایک تعبیر ہے یہ تفسیر موضوعی کے عملی ہونے کی بہترین تعبیر ہے کہ جو قرآن کریم سے گفتگو کرنے اور اپنے مسائل ومشکلات کا قرآن سے عرض کرنے کی بہترین روش ہے تا کہ ان کے لئے قرآنی جواب مل جائے۔

پس ان دونوں طریقوں میں اختلاف کی پہلی وجہ یہ ہے کہ اتجاہ تجزئی میں مفسر کا کردار منفی ہوتا ہے: جو سنتا ہے وہی قرطاس پر ضبط میں لاتا ہے لیکن تفسیر موضوعی کا مطلب کچھ اور ہے۔ اس کا رویہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ تفسیر موضوعی کا وظیفہ ہمیشہ ہر مرحلہ پر اور ہر زمانے میں یہ ہے کہ جس زمانہ میں وہ زندگی گزار رہے ہیں وہاں کی تمام انسانی اساس کو اٹھائیں، اس زمانہ کے تمام افکار کو اٹھائیں اور انسانی تجربات کے وہ مقولات جسے سکھایا جاتا ہے ان کو بھی اٹھا کر لائیں اور ان سب کو قرآن کے سامنے رکھ دیں، اُس کتاب کے سامنے رکھ دیں (جس کے نہ آگے سے باطل آ سکتا ہے اور نہ ہی پیچھے سے) تا کہ ان کے بارے میں اُتنا حکم اور نظریہ پیش کریں جتنا اس مفسر کے پاس سمجھنے، شفا لینے وغیرہ کی قوت اور صلاحیت ہے ان سب کو آیات شریفہ کے درمیان سے بیان کروانا ہے۔

یہاں قرآن واقع اور حقیقت سے ملتا ہے، یہاں قرآن انسانی معاشرے سے

جاملتا ہے۔ یہاں تفسیر واقع سے شروع ہوتی ہے اور قرآن پر ختم ہوتی ہے نہ کہ قرآن سے شروع ہوتی ہو اور قرآن پر ہی ختم ہوتی ہو۔ اور اگر ایسا ہوتا تو یہ عمل واقع سے ایک الگ چیز ہوتا۔ انسانی تجربات سے بالکل جدا نہیں ہوا ایسا نہیں بلکہ یہاں بشر واقع سے شروع کرتا ہے اور قرآن قیم پر ختم کرتا ہے۔ قرآن اسکے لیئے مصدر ہے۔ وہ اسکی روشنی میں واقع کی راہنمائی حاصل کرتا ہے۔

یہاں سے قرآن کی نظارت اور قیام کی قدرت اس کے لئے دائمی طور پر باقی رہتی ہے۔ اس کی عنایت میں حدیث (جدید) کی قدرت دائمی ہو جاتی ہے۔ اس کی ایجاد و ابتکار کی قدرت دائمی ہوتی ہے کیونکہ یہاں تفسیر لفظ میں وہ بات نہیں ہے، تفسیر لغوی کی طاقت ایسی نہیں کہ جو غیر متناہی ہو، بلکہ یہ ایک متناہی اور محدود چیز ہے جبکہ قرآن کریم جیسا کہ روایات میں آیا ہے نہ ختم ہونے والا کلام ہے: ﴿**وبحر لاینزفہ المستنزفون**﴾ ''یہ وہ سمندر ہے جسے پانی نکالنے والے ختم نہیں کر سکتے ہیں'' (نہج البلاغہ خطبہ/ ۱۹۸)۔ اسکی قرآن نے تصریح کی ہے کہ اس کے کلمات نہ ختم ہونے والے ہیں۔

﴿**ولوان مافی الارض من شجرۃٍ اقلام والبحر یمدہ من بعدہٖ سبعۃ ابحرٍ مانفدت کلمٰت اللہ**﴾ ''اور اگر روئے زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور سمندر کا سہارا دینے کیلئے سات سمندر اور آجائیں تو بھی کلمات الٰہی تمام ہونے والے نہیں ہیں'' (لقمان/ ۲۷)

﴿**قل لو کان البحر مداداً لکلمٰت ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمٰت ربی ولو جئنا بمثلہٖ مدداً**﴾ ''کہہ دیجئے: میرے پروردگار کے کلمات (لکھنے) کے لئے اگر سمندر بھی روشنائی بن جائیں تو سمندر ختم ہو جائیں گے لیکن میرے رب کے کلمات ختم نہ ہوں ہونگے اگر چہ ہم اتنے ہی سے مزید کمک رسائی کریں'' (کہف/ ۱۰۹) قرآن کی عطا نہ ختم ہونے والی ہے جبکہ تفسیر لغوی محدود ہے کیونکہ لغت کے حدود میں کوئی تجدید نہیں ہے اگر اس میں تجدید ہوئی تو بھی وہ قرآن پر حمل نہیں ہو سکتی اور اگر قرآن کی بعد کوئی اور لغت پائی

جائے تو یہ کوئی معنی نہیں رکھتا کہ ہم قرآن کو اس جدید لغت اور ان جدید اصطلاحات میں سمجھائیں یا ان الفاظ کے ذریعے سمجھائیں جو قرآن کے بعد وجود میں آئے ہیں۔ لہٰذا یہاں سے واضح ہوا کہ یہ جو قرآن کی نہ ختم ہونے والی عطا و بخشش ہے اور یہ جو قرآن کی ختم نہ ہونے والے معانی ہیں جن کی طرف خود قرآن نے تصریح کی ہے اور اہل بیت علیھم السلام کی احادیث میں اس کی تصریح ہوئی ہے۔ یہ ختم نہ ہونے کی حالت اس نہج موضوعی میں پوشیدہ ہے کیونکہ اس میں ہم قرآن سے طلب نطق کرتے ہیں اور اس قرآن میں گذشتہ اور آئندہ کے علوم ہیں۔ اس قرآن میں ہمارے مرض کی دوا ہے۔ اس قرآن میں ہمارے درمیان ارتباط کا نظام بیان ہوا ہے۔ ہم اس سے اہل زمین کے بارے میں آسمانی نقطہ نظر حاصل کر سکتے۔ ہیں یہاں سے ہمیں تفسیر موضوعی کی قدرت اور وسعت کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ترقی و تمدن اور ارتقاء کی صلاحیت رکھتی ہے، اس میں نمو کی صلاحیت ہے، اس میں بے نیازی ہے، اس میں تجربہ بشری سے استفادہ ہے اور اس کے بعد انسانی تجربات کے ساتھ درس قرآن اور اسی میں تدبر کا مقام ہے جو اسے ثروت مند بناتا ہے اور اسے توانائی مہیا کرتا ہے تا کہ وہ اسلام کو قرآن کی صحیح روشنی میں سمجھنے میں مددگار رہو۔

درس دوم

اعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم
وأفضل الصلوات علی أفضل النبیین وآلہ الطیبین الطاهرین.

ہم ان دوتفسیروں یعنی تفسیر موضوعی اور تفسیر تجزئی کے درمیان بنیادی اختلافات کو واضح کرنا چاہ رہے تھے اس حوالے سے ہماری گذشتہ توضیحات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا ممکن ہے کہ ان دونوں کے درمیان دودقیق اور بڑے فرق پائے جاتے ہیں اور ان دواختلافات سے اور بھی ثانوی فرق سامنے آتے ہیں۔

ا۔ تفسیر تجزئی پر منفی اور تفسیر موضوعی پر مثبت غلبہ ہے:۔

پہلا فرق:

جیسا کہ ہم نے کل واضح کیا کہ تفسیر موضوعی میں مفسر واقع خارجی سے شروع کرتا ہے یعنی حقیقت خارجی سے جو انسانی تجربے سے حاصل ہوتا ہے اور اس پر اس تجربہ کے نتیجہ اور اس تجربہ کے افکار اور مضامین سے جو کچھ اس کے ہاتھ آتا ہے وہ بھی اس پر اضافہ ہوتا ہے پھر سب کو ان تجربات پر اضافہ کرتا ہے پھر اسکے بعد وہ قرآن کی طرف رجوع کرتا ہے تا کہ قرآن سے حکم دریافت کرے۔ مولا امیر المومنینؑ کے تعبیر کے مطابق وہ قرآن سے طلب نُطق کرتا ہے۔ یہاں مفسر کا کردار استنطاق ہے یعنی طلب نطق ہے۔ یہاں مفسر گفتگو کرتا ہے، اسکا کردار مثبت ہے۔ یہاں وہ مشکلات کو پیش کرتا ہے، استفسار کرتا ہے، جو حقائق اسے تجربات کے نتیجہ میں حاصل ہوئے ہیں ان کے بارے میں سوال کرتا ہے پھر وہ اس عظیم کتاب سے طلب نطق اور گفتگو کے درمیان مختلف آیات سے جوابات بھی لیتا ہے۔

اس تفسیر موضوعی میں ابتداء واقع خارجی سے ہوتی ہے اور برگشت قرآن کی طرف ہوتی ہے۔ جبکہ تفسیر تجزئی میں مفسر قرآن سے شروع کرتا ہے اور قرآن پر ہی ختم کرتا ہے۔ اس میں نہ واقع خارجی سے قرآن کی طرف حرکت ہے اور نہ قرآن سے واقع کی طرف بلکہ قرآن سے ابتداء ہے اور قرآن پر ہی خاتمہ ہے۔ مفسر کا کردار یہاں منفی کردار ہے جیسا کہ ہم نے کل عرض کیا۔ اسکا ذہن تمام قسم کی معلومات سے خالی ہوتا ہے۔ اسکے ذہن میں کوئی مشکل یا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ وہ ایک سننے والے کی حیثیت سے قرآن کے سامنے بیٹھتا ہے قرآن سے گفتگو کرنے کے انداز میں اسکا ارادہ قرآن سے کسی چیز کے سمجھنے کے لئے سوال کرنا نہیں ہے بلکہ یہ سننے کیلئے بیٹھتا ہے اور اس سننے کے نتیجہ میں جو کچھ اس کے ذہن میں داخل ہوگا یہ اسے ضبط تحریر میں لائے گا۔

دوسرا فرق:۔

تفسیر تجزئی میں تفصیلی ماحصل کو مقدم رکھا جاتا ہے جبکہ تفسیر موضوعی میں مفسر نئے نظریات حاصل کرنا چاہتا ہے: اس فرق میں تفسیر موضوعی، تفسیر تجزئی سے ایک قدم آگے ہے کیونکہ تفسیر تجزئی میں آیات قرآنی کی تفصیلی سوالات پر اکتفاء کیا جاتا ہے جبکہ تفسیر موضوعی اس سے زیادہ کی خواہش مند ہے کہ اسکا میدان اس سے وسیع ہے یہاں ان تفصیلی مدلولات کے درمیان ارتباط کی صورتوں کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہاں مفسر کوشش کرتا ہے کہ آیات قرآنی کی مجموعی ترکیب سے قرآنی نظریہ اخذ کرلے۔ وہ ترکیب جو ان آیات کے درمیان پائی جاتی ہے جسے ہم آجکل کی زبان میں نظریہ کہتے ہیں یعنی مفسر مثلاً نبوت یا اقتصاد یا قانون تاریخ سے متعلق قرآنی نظریہ تک پہنچنا چاہتا ہے۔

اسی طرح آسمانوں اور زمین کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔ یہاں تفسیر موضوعی، تفسیر تجزئی سے ایک قدم آگے ہے کہ وہ اس مرکب نظریہ کے حصول کا قصد کئے ہوئے ہے کہ جو موقف قرآن میں عقائد اجتماع یا کائنات سے متعلق موضوعات میں سے ایک موضوع ہے اس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہ وہ دو بڑے فرق ہیں کہ جو تفسیر موضوع کی نہج اور تفسیر تجزئی کی نہج میں پائے جاتے ہیں۔ ہم نے اس سے پہلے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ بحث فقہی میں ہم موضوعیت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اس میں موضوعیت کو اپنایا ہوتا ہے جبکہ تفسیر قرآن میں اکثر نہج موضوعی کی طرف متوجہ نہیں بلکہ تفسیر تجزئی کی طرف متوجہ ہیں۔

موضوعیت سے کیا مراد ہے:

اصطلاح موضوعیت پہلے فرق کی روشنی میں بیان ہوا کہ تفسیر موضوعی میں تفسیر موضوع سے اور واقع خارجی سے شروع کرتا ہے اور اسکی برگشت قرآن کی طرف ہوتی ہے جسے ہم موضوعی کہتے ہیں۔ پہلے فرق کی روشنی میں اس اعتبار سے کہ وہ موضوع خارجی سے شروع ہوتا ہے اور قرآن کریم پر ختم ہوتا ہے۔ اسکو تفسیر توحیدی بھی کہتے ہیں اسکی وجہ یہ ہے کہ یہاں تجربہ بشر اور آیات قرآنی کو جمع کی جاتی ہیں۔ دونوں کو جوڑا جاتا ہے۔ اسکا یہ مطلب نہیں کہ تجربہ بشری کو قرآن پر ٹھونسا جاتا ہے۔ اس معنی میں نہیں کہ قرآن کو تجربہ بشری کے سامنے خاضع کرتا ہے بلکہ ہماری مراد یہ ہے کہ ہم نے ایک ہی بحث میں ان دونوں کو جمع کیا ہے تا کہ اس سے کوئی نتیجہ ملے اور اس تجربہ اور فکری مقولہ کہ جس کے بارے میں ہم بحث کر رہے ہیں اس کے بارے میں اسلام کے معین کردہ حکم کو قرآنی مفہوم سے اخذ کریں اور اسلام کا اس بارے میں نقطہ ونظر واضح ہو جائے۔

دوسرے فرق کی بنیاد پر بھی یہ تفسیر موضوعی ہے کیونکہ اس نے آیات قرآنی کے ایک مجموعہ کو اختیار کیا ہے کہ جو موضوع واحد ہونے میں مشترک ہے اور یہ توحیدی ہے اس اعتبار سے کہ ان آیات میں وحدت قائم کیا ہے، موضوع کے لحاظ سے ان آیات کے مدلولات میں ایک نظریہ کے مرکب ہونے کے حوالہ سے وحدت پایا جاتا ہے پس اس موضوعیہ کی اصطلاح اور توحیدیہ کی اصطلاح ان دونوں فرق سے مناسب سے ہیں۔

موضوعی سے یہاں پر ہماری مراد وہ موضوعی نہیں ہے جو کہ جانبداری کے مقابل میں آتا ہے یعنی موضوعیت بمعنی غیر جانبدار مثلاً کہا جاتا ہے: یہ بحث موضوعی ہے اس بات

کے مقابل کہ یہ بحث جانبداری اور طرف داری ہے طبعاً موضوعیہ اس معنی میں دونوں قسم کے تفسیر، تفسیر موضوعی اور تفسیر تجزئی میں پایا جاتا ہے اس معنٰی میں موضوعی تفسیر تجزئی کے مقابل تفسیر موضوعی کے امتیازات میں سے نہیں ہے۔ اس معنٰی میں موضوعیہ سے مراد بحث میں امانتداری ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ بحث کے موضوع پر ہی قائم رہے۔ یہ موضوعیہ دونوں طریقوں میں ضروری ہے لیکن تفسیر تجزئی کے مقابل ہم نے جس کو موضوعیت قرار دیا ہے وہ اس موضوعیت سے جدا اور مختلف ہے جو ذاتیہ اور جانبداری کے مقابل میں آتا ہے۔ یہاں پر موضوعیت سے مراد حقیقت سے شروع کر کے قرآن پر ختم ہونا ہے۔

دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ آیات کے ایک مجموعہ کو لے لیں جو ایک ہی موضوع کے بارے میں ہو پھر عمل توحیدی کے ذریعے ان کے مدلولات کو واضح کریں تا کہ اس موضوع کے متعلق قرآنی نقطہ ونظر معلوم ہو جائے۔

بحث فقہی میں موضوعیت

جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا کہ ہم بحث فقہی میں موضوعیت کو اپنائے ہوئے ہیں جبکہ تفسیر میں تجزئی کا غلبہ ہے۔ ہماری اس سے بات یہ مراد نہیں کہ بحث فقہی میں موضوعیت اپنی انتہاء اور درجہ کمال تک پہنچ چکی ہے۔ بحث فقہی اگرچہ موضوعیت کے رخ پر ہے لیکن اسکی موضوعیت کے مراحل ختم نہیں ہوئے ہیں۔ بحث فقہی میں آج بھی مزید موضوعیت اپنانے کی ضرورت ہے ایک ایسی موضوعیت جو اُفقی (عرضی) ہو اور عمودی (بلندی پر) ہو۔ جہاں تک عرضی سے متعلق موضوعیت اپنانے کا تعلق ہے جیسا کہ پہلے ذکر کر چکے ہیں یہاں انسان واقع خارجی سے شروع کرتا ہے اور نظریہ تک پہنچتا ہے حکم شریعت تک پہنچتا ہے یہ علماء کا وطیرہ رہا ہے فقہاء کی سنت رہی ہے کہ وہ زندگی سے متعلق مسائل سے شروع کرتے جو انکو درپیش تھے جیسے جعالہ، مضاربہ، مساقات، رہن، نکاح وغیرہ یہ وہ واقعات ہیں جو انھیں درپیش تھے پھر وہ انھیں مصادر شریعت کے سامنے پیش کرتے تا کہ ان کے بارے میں شریعت کے مصادر سے حکم شرعی کا استنباط کر سکیں۔ اسکو موضوعی رخ کہتے ہیں کیونکہ اس میں

واقع خارجی سے شروع ہوا ہے اور شریعت پر اس کے حکم کی شناخت پر منتہی ہوا ہے۔

لیکن اس میدان میں فقہ کو مزید پھیلانے کی ضرورت ہے کیونکہ اس سلسلے میں جن علماء نے کردار ادا کیا وہ چندین صدی پہلے گذرے ہیں۔ انکی خواہش تھی کہ ہمیشہ ان واقعات کو شریعت کے سامنے پیش کریں تا کہ ان سے متعلق احکام کو استنباط کریں۔لیکن وقت کے ساتھ ساتھ زندگی کے مسائل میں تجدید ہوتی رہتی ہے، اس میں کثرت آتی ہے، زندگی کو نئے مسائل کا سامنا ہے، لہٰذا اس عمل میں ہمیشہ اضافے اور نمو کی ضرورت ہے یعنی جو چیز زندگی میں تازہ پیدا ہوئی ہے اس کے بارے میں حکم دریافت کریں۔ وہ واقعات جو گذشتہ علماء جیسے شیخ طوسیؒ یا محقق حلیؒ کی زندگی میں پیش ہوئے اور انہوں نے ان کے بارے میں حکم شرعی کو اخذ کیا وہ ان کے زمانے کے لئے کافی تھے اور انکی ضروریات کو پورا کرتے تھے۔لیکن زندگی کی تدریجی ترقی کی وجہ سے کتنے ہی نئے باب کھل چکے ہیں ان ابواب کو بھی شریعت کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم بحث فقہی میں موضوعیت کو دوام بخشنا چاہتے ہیں تو موضوعیت کے اس عمل کو ان نئے ابواب تک وسعت دیں۔ کتنے ہی ایسے ابواب سامنے آئے ہیں جو پرانی فقہی کتب میں نہیں ہیں۔ تجارت کے ضمن میں مضاربہ، مساقات جو ماضی میں ایک ہزار یا آٹھ سو سال پہلے رائج تھے وہ آج کی تجارت یا اقتصادی تعلقات میں نہیں ہیں۔موجودہ اقتصادی تعلقات وسیع ہیں۔ایک دوسرے سے جُڑے ہیں لہٰذا جس طرح وہ علماء فقہ اس معاملہ میں خواہشمند تھے کہ ان مسائل زندگی کو شریعت کے سامنے پیش کریں تا کہ حکم شرعی حاصل کریں اسی طرح آج بھی اس عمل کو اُفقی طور پر وسعت دینے کی ضرورت ہے جسطرح گذشتہ دور میں تھی۔

اسی طرح عمودی طور پر بھی فقہ کے اس اتجاہ موضوعی میں داخل ہونے کی ضرورت ہے۔ضروری ہے کہ عمودی طور پر بھی نافذ ہوں، ضروری ہے کہ اسلام کے بنیادی نظریات تک پہنچ جائیں، ضروری ہے کہ شریعت کے اوپر کے ڈھانچہ پر اکتفانہ کریں بلکہ شریعت کی ان تفصیلات کی گہرائی تک جانے کی ضرورت ہے۔جن اساسی اور بنیادی نظریات پر اسلام

کی نظر ہے ان تک پہنچنے کے لئے اس کے ڈھانچہ سے آگے بڑھ کر تہہ تک پہنچ جانے کی ضرورت ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ زندگی کے مختلف شعبات کے ہر شعبہ میں شرعی احکام کا جو مجموعہ ہے وہ ایک بنیادی نظریات سے مربوط ہے بڑے بڑے تصورات سے مربوط ہے۔ اقتصادی میدان کے اسلامی احکام اور اسلام کے تشریعات اسلام کے نظریہ سے مربوط ہیں وہ اسلام میں اقتصادی پہلو سے مربوط ہیں۔ نکاح ،طلاق ،شادی اور مرد وعورت کے درمیان تعلقات کے میدانون میں اسلام کے احکام اسلام کے ان بنیادی نظریات سے مربوط ہیں۔ جو نظریہ ایک مرد اور عورت اور ان دونوں کے درمیان تعلقات کے حوالہ سے ہے یہ بنیادی نظریات کہ جن سے شریعت کے ڈھانچہ کے قواعد بنے ہیں ،ان بنیادی نظریات تک پہنچنے کی ضرورت ہے۔ہمیں ان کو فقہ سے الگ، جدا اور ایک قسم کے فن، ایک قسم کے ادب کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے بلکہ یہ فقہ کی ضروریات میں سے ایک ضرورت ہے۔ ان نظریات تک عمودی طور پر بھی داخل ہونے کی ضرورت ہے تا کہ طاقت بشری کی اہمیت اور صلاحیت کی حد تک ان نظریات کو کشف کیا جائے۔

تفسیر میں موضوعی نہج کو ترجیح دینا:۔

اب ہم دوبارہ برگشت کرتے ہیں تفسیر کے بارے میں یعنی ان امتیازات اور فرق کی طرف جو تفسیر موضوعی اور تجزئی کے درمیان ہوں اس سلسلے میں چند ترجیحات آپ کی خدمت میں پیش کریں گے جو تفسیر موضوعی کو تفسیر تجزئی پر مقدم کرنے کا سبب بنی ہیں۔ جو تفسیر موضوعی ہم نے بیان کی ہے اسکا افق وسیع ہے کشادہ ہے اور زیادہ ثمر بخش ہے۔اس حوالے سے یہ تفسیر تجزئی سے ایک قدم آگے ہے۔ اسی طرح اس میں نئ ایجادات اور انکشافات کے ذریعہ تجدد اور استمرار کی صلاحیت بھی ہے اس لحاظ سے کہ انسانی تجربہ کے مواد جب اس تفسیر کے سامنے پیش ہوتے ہیں تو وہ اسی لحاظ سے اسے بے نیاز کرتی ہے۔ پھر یہ شخص ان مواد کو قرآن کریم کے سامنے مطرح کرتا ہے تا کہ قرآن کریم سے اس بارے میں جواب حاصل کرسکیں۔ یہی اسلام کے اساسی نظریات کو حاصل کرنے کا واحد راستہ ہے

اورقرآن کریم کے لئے انسانی زندگی کے موضوعات کے لحاظ سے مختلف موضوعات ہیں۔
ہاں کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ کیا ضرورت ہے کہ ہم ان بنیادی نظریات کو حاصل کریں؟ کیا ضرورت ہے کہ نبوت کو عمومی شکل میں اسلام کے نقطہ نظر سے سمجھیں؟ کیا ضرورت ہے کہ قانون تاریخ کو سمجھیں؟ کیا ضرورت ہے تغیر اجتماع کو سمجھیں؟ اسی طرح کیا ضرورت ہے اقتصاد یا آسمان وزمین کے بارے میں قرآنی نظریہ اخذ کریں؟ ان نظریات پر بحث کرنے کے کیا فوائد ہیں کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے ان نظریات کو ایک عمومی اور خصوصی شکل میں بیان نہیں کیا ہے بلکہ اس قرآن کو اسی ترتیب کے ساتھ مسلمانوں کے ہاتھ میں دے دیا،تو کیا ضرورت ہے کہ ہم ان نظریات کو سمجھنے کے لئے اپنے آپ کو مشقت میں ڈالیں؟ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبرؐ نے اس مجموع کو اس کلیات کے ڈھیر میں اس شکل میں دینے پر اکتفا کیا ہے تو کیا ضرورت ہے کہ ہم ان مسائل کی تہہ تک پہنچیں اور اسکے بارے میں بنیادی نظریات حاصل کریں۔

حقیقت میں ان نظریات کی حدود کا تعین کرنا اور ان نظریات کا حاصل کرنا اس زمانہ کی بنیادی ضرورت میں سے ہے ان نظریات کو حاصل کریں۔ ہمارے لئے یہ ممکن نہیں کہ ہم اپنے آپ کو ان نظریات سے بے نیاز تصور کریں۔ پیغمبر اکرمؐ ان نظریات کو دیتے تھے لیکن ایک نظریہ کی صورت میں نہیں کہ یہ ایک نظریہ ہے بلکہ اسے تطبیقی صورت میں بیان فرماتے تھے اور اس وقت جو قرآنی اور اسلامی ماحول کی فضا تھی اس میں انکو بیان فرماتے تھے۔ چونکہ ہر فرد مسلمان اس ماحول میں زندگی گزار رہا تھا اسلئے ان نظریات کو سمجھتا تھا اگرچہ اجمالی اور ارتکازی ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اس وقت جو فکری، تربیتی اور اجتماعی ماحول پیغمبرؐ نے پیدا کیا تھا اس میں یہ قدرت تھی کہ ان نظریات کو سالم طریقے سے ان کو سمجھا دیں اور مختلف مواقع اور حوادث میں اپنا موقف ان پر واضح کر دیں۔

اس حقیقت سے اگر ہم اپنے اذہان میں رسوخ پیدا کرنا چاہیں تو ان دو حالتوں کا موازنہ کرنا پڑے گا: ایک انسان ہے جو ایک لغت یا زبان میں زندگی گزارتا ہے لیکن اس

کے مقابل ایک انسان ہے جس کیلئے یہ زبان اجنبی ہے یہ انسان جاننا چاہتا ہے کہ اس زبان کے لوگ ان الفاظ سے کیسے معانی کو اپنے اذہان کی طرف منتقل کرتے ہیں؟ یہ کیسے ان الفاظ سے معنی کو درک کرتے ہیں۔

یہاں دو حالات پائے جاتے ہیں: وہ یہ کہ ہم اس انسان کو اس عُرف کے درمیان لائیں، اسے اس ماحول میں رکھیں، اسے یہاں زندگی گزارنے کا موقع دیں تا کہ وہ اس لغت اور زبان میں زندگی گزارے۔ اس طرح ایک طویل عرصہ اس لغت میں زندگی گزارنے کے بعد اس کے پاس اس لغت اور عرف کا ایک ذخیرہ جمع ہوگا۔ اب وہ سمجھے گا کہ کس طرح اسکا ذہن اس لغت کے الفاظ کی تہ تک پہنچتا ہے اور وہ مطالب کو سمجھتا ہے۔ کیونکہ اس کے پاس لغت کے قواعد موجود ہیں جو اجمالی طور پر اسکے ذہن میں نقش بستہ ہیں۔ اسکے پاس ایک سالم نظریہ موجود ہے غلط اور صحیح میں تمیز کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس نے ایک عرصہ اس لغت کے ماحول میں زندگی گزاری ہے، اس نے اس لغت کو تطبیق کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس لغت میں اس نے وجدان بنائے ہیں۔ اس لغت میں اس نے افکار کو بنایا ہے۔ اسکے برعکس ایک انسان ہے جو اس لغت کے دائرے سے دور ہے۔ اس عرف سے دور ہے تو اگر آپ چاہیں کہ اس کے ذہن کو اس لغت کے قریب کریں اور آپ چاہتے ہیں کہ اس کے ذہن میں اس لغت کے صحیح اور غلط میں تمیز کرنے کی قدرت پیدا ہو تو آپ کیسے اس قدرت کو اس کے ذہن کے لئے بنا سکتے ہیں۔ اسکا یہی ایک طریقہ ہے کہ اُس کو اس لغت کے قواعد کی طرف رجوع کریں۔ ضروری ہے اس عرف کی طرف رجوع کریں جس میں ایسے انسان کی تربیت کی جاتی ہے۔ اس عرف کی طرف رجوع کریں تا کہ اس سے اس کے عمومی قواعد سکھا سکیں۔ اس کا عمومی نظریہ اس کو معلوم ہو سکے۔ بالکل وہی حالت جو علوم عربیہ کے ساتھ پیش آیا ہے' کہ کیسے ایک فرزند لغت کو ابتداء میں علوم عربیہ سیکھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ اسی لغت میں پیدا ہوا ہے، اسی میں زندگی گزاری ہے۔ لیکن جب اسے اس لغت سے دور رکھا گیا ماحول میں فرق آیا اور اس زبان میں وہ کمزور ہو گیا اس میں

دوسری زبان کے الفاظ شامل ہو گئے تو یہاں کے لوگ یہ احساس کرنے لگے کہ لغت کے لئے قواعد کی ضرورت ہے لغت کی نظریات کی حاجت کا احساس کرنے لگے کیونکہ موجودہ صورت حال میں صحیح فکر تک نہیں پہنچ رہے ہیں۔ پس اس صورت میں علم کی ضرورت ہے ،نظریات کی ضرورت ہے تا کہ فکر کر سکیں، تا کہ ایک دوسرے سے مناقشہ کر سکیں تا کہ انہی قواعد اور نظریات کے مطابق اس لغت کو استعمال کر سکیں۔ یہ مثال ہم نے اس فکر کو آپ کے اذہان سے نزدیک کرنے کیلئے پیش کیا ہے۔

اسی طرح اسلام کے ظہور کے وقت صحابہ جنھوں نے پیغمبرؐ کے ساتھ زندگی گزاری انہوں نے اگر اسلامی نظریات کو پیغمبرؐ سے تفصیلی طور پر نہیں لیا ہے تو اجمالی طور پر تو ان نظریات کو حاصل کیا ہے ۔ یہ نظریات ان کے اذہان میں نقش ہوئے ہیں۔ان کے افکار میں رسوخ پیدا کی ہے۔ ان لوگوں نے ایک فکری اور اجتماعی ماحول میں زندگی گزاری۔ یہ ماحول ان نظریات کو سمجھنے میں انکا معاون و مددگار ثابت ہوا اگر چہ اجمالی طور پر سمجھنا ہی کیوں نہ ہو۔ وہ غلط اور صحیح میں تمیز کر سکتے تھے۔لیکن اس ماحول کے ختم ہونے کے بعد موجودہ ماحول بالکل اس سے مختلف ہے۔تو اس صورت میں انسان محتاج ہے کہ ان نظریات کو سیکھے یعنی یہاں قرآن اور اسلام کے نظریہ کو پڑھ کر سمجھنے کی ضرورت ہے اور یہ حاجت ایک ناگزیر حقیقت ہے خصوصاً اس زمانہ میں کہ جہاں عالم اسلام کے انسان اور عالم غرب کے انسان کے اختلاف سے بہت سارے نظریات پیدا ہوئے ہیں اور جب مغرب نے اپنی تمام فکری اور ثقافتی توانائیوں کے ساتھ معرفت بشری کے مختلف میدانوں پر حملہ کیا اور ہماری فکر وسوچ میں مداخلت کی۔

جب عالم اسلامی اور عالم غربی کا یہ اختلاط اپنی انتہا کو پہنچا تو ایک مرد مسلمان نے اپنے آپ کو زندگی کے مختلف میدانوں میں بہت سارے نظریات کے سامنے پایا۔ یہاں اس نے یہ ضرورت محسوس کی کہ ان نظریات کے بارے میں اسلامی موقف کا معلوم ہونا ضروری ہے اور اس بارے میں نصوص اسلامی سے گفتگو ایک ضروری عمل ہے۔ اسکے

لئے ضروری ہے کہ وہ نصوص کی گہرائیوں میں داخل ہو جائے تا کہ وہ ان مسائل کے بارے میں اسلام کے حقیقی نقطہ نظر کو منفی یا مثبت انداز میں حاصل کر سکے تا کہ زندگی کے مختلف میدانوں میں جہاں بشری تجربات کام آتے ہے وہاں کے لئے اسلامی نظریات معلوم ہو سکیں۔ پس یہاں اس مقام پر تفسیر کے دونوں طریقوں میں تفسیر موضوعی ہی افضل و بہتر ہے لیکن اس کے ساتھ یہ تصور کرنا مناسب نہیں کہ ہم تفسیر تجزئی سے بالکل بے نیاز ہو جائیں۔ تفسیر موضوعی کے افضل ہو جانے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ایک طریقہ تفسیر کو چھوڑ کر ایک نئے طریقہ کو اپنائیں یعنی تفسیر تجزئی کو کلی طور پر چھوڑ دیں اور تفسیر موضوعی کو اپنا لیں۔ بلکہ ہمارا مقصود یہ ہے کہ ہم نے ایک رائج طریقہ تفسیر میں ایک اور طریقہ تفسیر کا اضافہ کیا ہے اس لحاظ سے تفسیر موضوعی تفسیر تجزئی سے ایک قدم آگے جانے کا نام ہے۔ اسکا مطلب یہ نہیں کہ ہم تفسیر تجزئی سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔

پس یہاں مسئلہ طریقہ کار کی تبدیلی نہیں بلکہ اس میں اضافہ کی بات ہے ۔یعنی ایک طریقہ میں ایک اور طریقہ کا اضافہ کیا ہے۔ یعنی تفسیر میں طریقہ تجزئی پر طریقہ موضوعی کا اضافہ کیا ہے۔ یعنی ہم نے دو قدم اٹھائے ہیں ، پہلا قدم تفسیر تجزئی اور دوسرا قدم تفسیر موضوعی کی طرف اٹھایا گیا ہے۔

روز چارشنبہ ۱۸ جمادالاول ۱۳۹۹ھ

درس سوم

اعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم
و افضل الصلوات علی سیدالخلق محمد وعلیٰ الھداۃ المیامین من آلہ الطاھرین.

گذشتہ دروس میں ہم نے تفسیر موضوعی کی ضرورت اور اسکی توجیہات بیان کیں تا کہ تفسیر موضوعی یا توحیدی کو تفسیر تجزئی یا تقلیدی پر مقدم رکھا جائے۔ اسکی وجہ تفسیر موضوعی کا ثمر بخش وسودمند ہونا ہے اور یہ زیادہ تحرک وایجاد کی قدرت رکھتی ہے۔ اسکے علاوہ قرآنی نظریات کو بطور کامل وشامل پیش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ اس ضمن میں آپکو ایک عملی جواز پیش کروں وہ یہ کہ تفسیر تجزئی کا سفر بہت ہی طویل سفر ہے یہ سورۂ فاتحہ سے شروع ہوتی ہے اور اختتام سورۂ الناس پر ہوتا۔ ہے لہٰذا اسکے لئے ایک طویل مدت درکار ہے اسی لئے محدود چند علماءِ اسلام کے علاوہ کوئی اس شرف عظیم میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ ان محدود افراد کو اس شریف کتاب کی ابتداء سے آخر تک بیٹھنا نصیب ہوا ہے۔ ہم فکر کرتے ہیں کہ ہماری زندگی کے دن بھی محدود ہیں اور اس طویل سفر کو طے کرنے کے لئے کافی نہیں ہیں اور اسکے علاوہ ہم نے بہتر سمجھا کہ مختصر مسافت والا راستہ اختیار کیا جائے تا کہ ہم بھی قرآنی میدان میں چند قدم طے کرسکیں۔

ہم یہاں پر قرآن سے متعلق چند موضوعات کو پیش کریں گے اور قرآن کریم سے انکے بارے میں روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ ہماری کوشش یہ ہوگی کہ جہاں تک ممکن ہوسکے بحث ہمارے ہاتھ میں رہے اور تمام موضوعات کو نہ چھیڑیں تا کہ ہم کچھ اہم مسائل کو بیان کرسکیں۔ لہٰذا ہم ہر موضوع کے بنیادی افکار اور بڑے عناوین کو بیان کرنے

پر اکتفا کریں گے۔ چونکہ میں چاہتا ہوں کہ ہر موضوع کے محدود دروس ہوں لہٰذا امید ہے کہ آپکی خدمت میں پانچ سے دس دروس دوں تا کہ قرآن کریم کے متنوع ابحاث کا ہم احاطہ کرسکیں اور کامل طور پر بیان بھی ہوسکے۔ اب اس سلسلے میں ہمیں اس کا سامنا ہے کہ وہ کونسا موضوع ہو جس سے ہم انشاءاللہ آغاز کریں۔

بحث وگفتگو کے لئے پہلا موضوع جسے انتخاب کیا گیا ہے وہ ہے ’’قانون تاریخ قرآن کی روشنی میں‘‘ یعنی کیا قرآن میں تاریخ انسانی سے متعلق کوئی قانون بیان ہوا ہے؟ کیا قرآن کے پاس ایسے قوانین ہیں جو انسان کی حیات وحرکت اور اسکی ترقی وتمدن پر حاکم ہو؟ وہ کونسا قانون ہے جو تاریخ بشریت پر حاکم ہے؟ انسانی تاریخ کیسے شروع ہوئی؟ اسکی نمو وترقی کیسے ہوئی؟ یا نظریہ تاریخی کے تحت بنیادی عوامل کونسے ہیں؟ تاریخ بنانے میں انسان کا کیا کردار ہے۔ اجتماعی میدان میں عقیدہ توحید ونبوت کا کیا کردار رہا ہے؟

یہ وہ سوالات ہیں جن پر ہم اس عنوان کے ذیل میں بحث وگفتگو کرنا چاہتے ہیں یہ قرآن کریم میں قانون تاریخ کا عنوان ہے اس بارے میں قرآن کریم کے مفردات اور مطالب ومفاہیم میں بہت ساری بحث وگفتگو ہوئی ہیں۔ لیکن مختلف زاویوں سے۔ مثلاً قرآن میں قصص انبیاء علیھم الصلاۃ والسلام کا بیان تاریخی زاویے سے ایک بڑا جز ہے۔ قرآن کریم نے قصص انبیاء علیھم الصلاۃ والسلام کا تاریخی پہلو سے بحث وگفتگو کیا ہے جسے مورخین نے احاطہ کیا ہے اور انہوں نے ان واقعات اور حوادث کو بھی پیش کیا ہے جسے قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے اور جن چیزوں کے بارے میں اس عظیم کتاب نے بات نہیں کی ان خالی جگہوں کو مفسّرین ومورخین نے روایات یا احادیث سے پر کیا ہے یا سابقہ کتب آسمانی اور جعلی قصوں کہانیوں سے پُر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسطرح قصص قرآنی کے نام سے بہت صفحات تاریخی وجود میں آئے۔ یہ ہوا ایک زاویہ لیکن قصص قرآنی کے بارے میں ایک اور زاویے سے بھی بحث ہوئی ہے۔ وہ زاویہ قرآن کریم میں طریقہ قصّہ گوئی ہے اس زاویہ سے قدرت، ایجاد، قوت اور اصل کس حد تک قرآن سے استفادہ

کرسکتے ہیں اور یہ طریقہ قصہ قرآنی زندگی، حرکت اور ایجادات کے بارے میں اپنے اندر سرمایہ جمع کیا ہوا ہے یہ بھی اس کے مختلف زاویوں میں سے ایک زاویہ ہے جس پر بحث ہوتی ہے۔

قرآن کریم میں اس مادہ سے متعلق ایک دوسرے مادہ سے بھی بحث ہوئی ہے ہم ابھی اس مادہ قرآنی کے بارے میں ایک اور زاویہ سے گفتگو کرنا چاہتے کہ یہ مادہ قانون تاریخ پر کس حد تک روشنی ڈالتا ہے۔ ان قوانین وضوابط اور رموز پر کہ جو قانون تاریخ پر حکم فرما ہیں۔ کیونکہ قرآن میں تاریخ کے رموز، قوانین اور ضوابط پائے جاتے ہیں۔

قانون تاریخ کے بارے میں قرآنی اہتمام:

قانون تاریخ دوسرے قوانین کی طرح ظواہر کے مجموعہ کا ایک ذخیرہ ہے جس طرح قانون فلکیات، قانون فیزکس اور قانون کمیسٹری ظواہر کے مجموعہ کا ایک ذخیرہ ہیں اسی طرح قانون تاریخ بھی مجموعہ ظواہر کا ایک ذخیرہ ہے اس معنٰی میں جسے ہم انشاء اللہ بعد میں بیان کریں گے۔ جس طرح دوسرے قوانین میں سے ایک قانون کے لئے کچھ رموز وقواعد ہیں اسی طرح تاریخ کے لئے بھی ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ سوال کرنے کا حق حاصل ہے کہ کیا جن ظواہر کے ذخیرہ سے قانون تاریخ بنی ہے ان کے لئے بھی قواعد اور رموزات ہیں؟ ان قواعد ورموزات کے بارے میں قرآن کریم کا کیا موقف ہے؟ ان کے بارے میں مثبت یا منفی، اجمالی یا تفصیلی حوالہ سے قرآن کیا بتاتا ہے؟

بعض کا خیال ہے کہ ہمیں اس انتظار میں نہیں ہونا چاہئے کہ قرآن کریم سنن تاریخ کے بارے میں ہم سے کچھ بتائے کیونکہ قانون تاریخ میں بحث وگفتگو ایک علمی گفتگو ہے جیسے طبیعت، نباتات، سبزیوں کے بارے میں گفتگو، خداوند عالم نے اس کتاب کو کتاب اکتشافی بنا کر نہیں بھیجا ہے بلکہ اسے کتاب ہدایت بنا کر بھیجا ہے۔ قرآن کریم ایک نصاب تعلیم کے طور پر نازل ہونے والی کتاب نہیں ہے۔ یہ کتاب پیغمبر اکرمؐ پر اس لئے نازل نہیں ہوئی ہے کہ آپؐ کو ایک رائج تصور کا استاد بنائے اور آپؐ کچھ خاص فکر رکھنے

والے مثلاً ڈاکٹروں اور اعلیٰ سند یافتہ حضرات کو اس کا درس دے دیں بلکہ یہ کتاب آپؐ پر نازل ہوئی ہے تاکہ سارے لوگوں کو تاریکی سے روشنی کی طرف لائیں، تاکہ لوگوں کو جہالت کی تاریکی سے نکال کر ہدایت اسلام کی روشنی میں لائیں، یہ کتاب کتاب ہدایت ہے، کتاب تغییر ہے ظلمت سے نور کی طرف لانے والی کتاب ہے نہ کہ اکتشافات کی کتاب۔

اسی وجہ سے ہم قرآن سے اس انتظار میں نہیں ہیں کہ وہ دوسرے علوم کے عمومی مبادی اور حقائق بتادیے، ہم قرآن سے یہ نہیں چاہتے کہ وہ ہمیں فیزک، کیمیا، طبعیات، حیوانات کے مبادی کے بارے میں ہم سے گفتگو کریے۔ یہ بات صحیح ہے کہ قرآن کریم میں ان سب کی طرف اشارہ ہوا ہے لیکن یہ اشارات اسی حد تک ہیں کہ قرآن کو الٰہی ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اسی مقدار میں ہیں کہ جہاں سے یہ معلوم ہونا ممکن ہو کہ اس کتاب میں خدا نے کتنی گہرائی سے بات کی ہے کہ جو ماضی، مستقبل اور حال سب پر احاطہ کئے ہوئے ہے۔ ان چیزوں کے بارے میں اشارہ اتنی حد تک ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ انسانی تجربے سے سینکڑوں سال پہلے مختلف میدانوں میں یہ حقائق کشف ہوئے ہیں لیکن قرآن کریم کے یہ اشارات اس طرح کے عملی میدان کے مظاہرہ کے لئے ہے نہ کہ ہمیں اس میں فیزک یا کیمیا وغیرہ کی تعلیم دے رہے ہوں۔

قرآن کریم اپنے آپ کو انسانی خلّاقی قدرت کے بدل کے طور پر پیش نہیں کرتا، انسان کی خداداد صلاحیتوں اور قابلیتوں کا بدل نہیں ہے۔ انسان کو زندگی کے تمام میدانوں ومعرفت اور تجربات کے میدانوں میں مشقت ومحنت کرنے سے اوکنے کے لئے نہیں آیا، قرآن اپنے آپ کو ان میدانوں کا بدل بنا کر پیش نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے آپ کو انسانی روحی طاقت کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس کی ان قوتوں کو منفجر کرتا ہے اسے صحیح سمت کی طرف حرکت دیتا ہے۔ پس جب قرآن کریم ایک کتاب ہدایت ورہنما ہے اور اکتشاف اور علم کی کتاب نہیں تو یہ طبیعت سے ہٹ کر بات ہوگی کہ ہم ان علوم میں سے کسی ایک کے مبادی عامہ کے بارے میں قرآن سے کچھ گفتگو کا انتظار کریں۔ کہ جہاں انسانی افکار ان علوم کے

قوانین وضوابط اور رموز کو کشف کرنے کے لئے قدم اٹھا سکتے ہیں ہم قرآن سے کیوں اس انتظار میں رہیں کہ وہ ہمیں کلیات بتا دیے اور اصول وضوابط بتا دیے۔ ہم کیوں قرآن میں قانون تاریخ کے لئے جو اس دنیا کے قوانین میں سے ایک قانون ہے مفہوم علمی کے منتظر ہیں جب کہ دوسرے قوانین کے لئے قرآن میں ایسا نہیں ہے؟ اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ ان میدانوں کے لئے قانون نہیں رکھتا کیونکہ قرآن اگر قوانین کو بیان کرنے لگتا اور ان حقائق کو کشف کرنا شروع کرتا تو یہ کوئی اور کتاب بن جاتی ۔ یہ کتاب بشریت سے ہٹ کر ایک مخصوص گروہ کی کتاب بن جاتی کہ جو اپنی خاص علمی حلقوں میں اس کو پڑھتے ۔ یہ تصور اپنی جگہ صحیح ہے کہ قرآن کتاب اکتشاف نہیں اور قرآن اس لئے نہیں آیا کہ بشر کی رشد ونمو ایجادات اور جستجو طاقت وقدرت کو منجمد کرے بلکہ یہ ایک کتاب ہدایت ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان میدانوں اور تاریخ کے میدان میں واضح فرق نظر آتا ہے۔ اسی بنیادی فرق نے اس میدان کو، اس میدان کے قوانین کو قرآن سے ایک سخت قسم کی ارتباط پیدا کروائی ہے۔ اس کے اسی وظیفہ کی طرح کہ وہ کتاب ہدایت ہے اس میدان یعنی قانون تاریخ کا قرآن سے گہرا ربط ہے جبکہ کائنات کے دیگر علوم وفنون سے قرآن کا اتنا ربط نہیں ہے اور قانون تاریخ اور قرآن کے درمیان رابطہ اس وجہ سے ہے کہ یہ قرآن کتاب ہدایت ہے، یہ تغیر لانے کیلئے آیا ہے، یہ "تغیر" جسکی تعبیر قرآن نے استعمال کی ہے وہ تغییر لوگوں کو ظلمتوں سے نکال کر نور کی طرف لانا ہے۔

تغیر اجتماعی کے دو زاویے ہیں:

پہلا زاویہ: اس تغییر کے محتویٰ اور مضمون کے حوالے سے کہ جس کی طرف یہ عمل تغییر دعوت دے دیا ہے وہ احکام ہو یا اصول یا شریعت کی بنیادی پر اس لحاظ سے یہ تغییر کا ربانی پہلو ہے اس میں خدا کی شریعت تجسم پاتے ہیں کہ جو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی تھی اپنے نزول کے ساتھ تمام ماڈی قوانین تاریخ کو چیلنج کیا کیونکہ یہ شریعت جس ماحول میں اتری تھی اس کی فضا سے بلند وبالا تھی۔ معاشرے کے جن حالات پر اتری تھی

اس سے بھی ارفع تھی اور جس شخص پر اس شریعت کو بھیجا اور اسے اس کی تبلیغ کا ذمہ دار بنایا اس سے بھی یہ بلند مرتبہ والی تھی ۔ عملیہ تغیر کا یہ پہلو محتوی اور مضمون کا زاویہ نظام شریعت ،احکام اور طریقے کہ جس کے لئے یہ عمل واقع ہو رہا ہے یہ پہلو خدائی اور ربانی پہلو ہے لیکن یہاں تغیر اجتماعی کا ایک اور پہلو بھی ہے کہ جسے پیغمبر اکرمؐ اور اصحاب اطہارؓ نے انجام دیا ہے اس عمل تغیر کو اس زاویہ سے ملاحظہ کرتے ہیں کہ جسے لوگوں کے ایک گروہ نے بنایا ہے اور وہ گروہ نبیؐ اور ان کے اصحاب ہیں۔

تغیر کا یہ پہلو اس لحاظ سے کہ اس کے اردگرد اور بھی مختلف اجتماعی ریلے ہیں اس گروہ کے ساتھ مختلف رنگوں جیسے عقائد اجتماعی اور فوجی میدانوں میں نزاع پائے جاتے ہیں۔ جب ہم تغیر کے اس پہلو کو لیتے ہیں اس لحاظ سے کہ ایک بشری پیدا کردہ ہے اور قانون تاریخ پر واقع ہوا ہے جو دوسرے ایسے اجتماعات اور ریلے سے ربط رکھتے ہیں کہ جو یا اس گروہ سے جدا ہیں یا اس کی تائید کرتا ہے یا اس کے ساتھ جنگ کر رہا ہے یہ تغیر کا بشری زاویہ ہے یہ لوگ بھی دیگر انسانوں کی طرح کے انسان ہیں۔ قانون تاریخ ان کے بارے میں ایسے ہی حکم فرما ہے جس طرح باقی لوگوں کو حکم کرتا ہے اور جس طرح گذشتہ زمانوں میں دوسرے معاشروں پر حکم فرما تھا۔

پس واضح ہوا کہ قرآن اور نبی کریمؐ نے جن تغیر کو اپنایا ہے اس کے دو پہلو ہیں۔

ایک پہلو یہ ہے کہ شریعت ،وحی اور مصادر وحی پر جا ملتا ہے لہٰذا یہ ربانی ہے یہ تاریخ سے مافوق ہے لیکن چونکہ یہ ایک عمل ہے جو تاریخ میں واقع ہوا ہے اور اسی زمین پر وقوع پذیر ہوا ہے اس میں بشر کی توانائی خرچ ہوئی ہے اس حوالے سے یہ ایک تاریخی عمل ہے اور اس پر قانون تاریخ نافذ ہے اور اس پر انھی ضوابط کے تحت حکم ہوگا جسے خدا نے اس دنیا کے اس قانون (کہ قانون تاریخ کہا جاتا ہے) کے نظم ونسق کے لئے وضع کیا تھا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن دوسرے پہلو کے بارے میں وہاں گفتگو کرتا ہے جہاں پر تغیر کو لوگوں نے ایجاد کیا ہو تو وہاں بشر کے بارے میں گفتگو ہوتی ہے لوگوں کی بات ہوتی ہے رسالت آسمانی

سے گفتگو نہیں ہوتی بلکہ وہاں پر بشر میں سے کچھ بشر سے بشر ہونے کے لحاظ سے بات ہوتی ہے کہ جن پر قانون حکم فرما ہے وہی قوانین کہ جو دوسروں پر حکم فرما ہے۔

جب قرآن مسلمانوں کے غزوۂ بدر میں فتح یاب ہونے کے بعد جنگ احد میں شکست کی خبر کو بتانا چاہتا ہے تو قرآن اس نقصان اور خسارہ کی بات کرتا ہے۔ کیا کہتا ہے قرآن؟ کیا یہ بتاتا ہے کہ جنگ میں شکست ہونے کی وجہ سے رسالت آسمانی کو خسارہ ہوا ؟نہیں چونکہ رسالت آسمانی مادی لحاظ سے شکست اور کامیابی کے معنی سے مبرّا ہے رسالت آسمانی نے نہ شکست کھائی ہے اور نہ آئندہ کھائے گی بلکہ وہ انسان ہے جسے شکست ہوئی ہے حتٰی یہ انسان حامل رسالت ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اس انسان اس پر قانون تاریخ نافذ ہیں۔

قرآن کیا کہتے ہیں؟ فرماتا ہے: ﴿وتلک الایام نداولھا بین الناس﴾ ''وہ ایام جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں'' (آل عمران / ۱۴۰) یہاں پر خداوند عالم نے ان کو انسان کہہ کر پکارا ہے۔ کہا گیا کہ: یہ واقعہ چونکہ قانون تاریخ سے مربوط ہے مسلمان بدر میں کامیاب ہوئے کیونکہ قانون تاریخ کے مطابق انہوں نے شرائط کو فراہم کر رکھا تھا لیکن احد میں شکست کھائی کیونکہ وہاں پر جن شرائط کو اپنایا تھا وہ ایسے تھے کہ ان کو شکست ہونی تھی ﴿ان یمسسکم قرح فقد مسّ القوم قرح مثله و تلک الایام نداولھا بین الناس﴾ ''اگر تمہیں کوئی زخم لگا ہے تو تمہارے دشمن کو بھی ویسا ہی زخم لگ چکا ہے اور یہ ہیں وہ ایام جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں'' (آل عمران/ ۱۴۰)

یہ خیال نہ کرو کہ کامیابی ایسا حق ہے کہ جسے خدا نے تمہارے لئے رکھا ہے۔ نہیں بلکہ کامیابی ایک طبیعی حق ہے اگر شرائط کو وافر مقدار میں فراہم کیا تو تب وہ کامیابی تمہارے حق میں ہے کیونکہ یہ قانون تاریخ کے تحت ہوتا ہے جسے خدا نے تکوینی قرار دیا ہے نہ کہ تشریعی۔

لہٰذا جب تم جنگ احد میں ان شرائط کے حامل نہیں تھے اسلئے تمھیں اس جنگ میں شکست کا سامنا ہوا۔ لہٰذا یہاں گفتگو بشر سے ہے بشر کے اعمال سے ہے نہ کہ رسالت ربانی

سے بلکہ قرآن کریم اس سے بھی آگے بیان کرتا ہے اور اس گروہ بشری کو چیلنج کرتا ہے کہ جو تاریخ میں سب سے زیادہ پاکیزہ ومطہر ہے۔ ان سے فرماتا ہے کہ اگر تم قانون تاریخ کی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کرو گے شریعت کی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کرو گے تو اسکا یہ مطلب نہیں کہ آسمانی شریعت منسوخ کردی جائے گی اسکا یہ مطلب نہیں کہ قانون تاریخ تمھارے حق میں خاموش رہے گا بلکہ جلد ہی تمہیں بدلا دیا جائے گا۔ قانون تاریخ تمھیں معزول کر دے گا اور ایک نئی قوم کو لائے گا جو ان حالات کو برداشت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہوگی تاکہ وہ ان ذمہ داریوں کو اٹھائے اور لوگوں کی نگراں بن جائے اس وقت کہ جب امت میں اس نگرانی کے لئے کوئی تیار نہ ہو:

﴿الاتنفروا یعذبکم عذابًاالیمًاویستبدل قومًاغیرکم ولاتضروہ شیئًا واللّٰہ علیٰ کل شیٔ قدیر﴾ ''اگر تم نہ نکلو گے تو اللہ تمہیں دردناک عذاب دے گا اور تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کرے گا اور تم اللہ کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکو گے اور اللہ ہر چیز پر خوب قدرت رکھتا ہے'' (توبہ/ ۳۹)

﴿یٰایھاالذین اٰمنوا من یرتد منکم عن دینہٖ فسوف یاتی اللّٰہ بقومٍ یحبھم ویحبونہ اذلۃٍ علی المومنین اعزۃٍ علی الکا فرین یجاھدون فی سبیل اللّٰہ ولایخافون لومۃ لائم ذٰلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء واللّٰہ واسع علیم﴾ ''اے ایمان والو! تم میں سے جو بھی اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ بہت جلد ایسے لوگ پیدا کرے گا جو اللہ سے محبت کریں گے اور جن سے اللہ محبت کرے گا۔ مومنین کے ساتھ نرمی سے اور کافروں کے ساتھ سختی سے پیش آنے والے ہوں گے۔ راہ خدا میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا' بڑا علم والا ہے'' (مائدہ/ ۵۴)

قرآن کریم تغیر کے اس دوسرے زاویے کے حوالے سے بشر سے گفتگو کرتا ہے۔ بشر کی طاقت اور کمزوری کے حوالے سے گفتگو کرتا ہے۔ اسکی استقامت اور انحراف کے

بارے میں گفتگو کرتا ہے۔اس کے پاس موجود شرائط اور حالات کے بارے میں گفتگو کرتا ہے

یہاں سے یہ حقیقت کشف ہوتی ہے کہ قانون تاریخ اور کتاب خدا کے درمیان گہرا ارتباط ہے کیونکہ یہ کتاب ہدایت ہے۔وہ کتاب ہے جو لوگوں کو ظلمتوں سے نور کی طرف لے کر جاتی ہے۔لیکن عملی پہلو اس قانون تاریخ سے ہے۔ بشری اور تطبیقی پہلو اسی قانون تاریخ سے ہے۔وہ مقام ہے جہاں قانون تاریخ کے سامنے خاضع ہوتا ہے۔وہ اس قانون کے سامنے خاضع ہوا ہے۔لہٰذا ہمارے لئے ضروری ہے کہ اس میدان کے لئے قرآن کا اپنا نظریہ اور ہدایت و رہنمائی کو جاننے قانون تاریخ کو قرآن اور اسلام کے دائرہ عمل میں تصور کیا جائے۔

پس واضح ہوا کہ قانون تاریخ دوسرے قوانین مثلاً فزیکی، فلکیات، بیالوجی یا قانون نباتات سے مشابہت نہیں رکھتا ان علوم سے متعلق قوانین بطور مستقیم بشر کے تغیر میں دخالت نہیں رکھتے جبکہ قانون تاریخ بشر کے تغیر میں بطور مستقیم دخالت رکھتا ہے، تغیر کی دوسری قسم کے لحاظ سے ہمیں قرآن سے یہ توقع رکھنی چاہیے کہ وہ اس بارے میں ہمیں کلیات بتائے۔جی ہاں! یہ صحیح نہیں کہ ہم قرآن سے یہ توقع رکھیں کہ وہ ایک تاریخی کتاب کی طرح ہمیں قانون تاریخ کے تمام تفاصیل سے آگاہ کریے اور تمام جزئیات فراہم کرے اور اسکے علاوہ ان باتوں کا بھی ذکر کرے جو اس تغیر اجتماعی میں کوئی دخالت نہیں رکھتے مثلاً جن جنگوں میں پیغمبرؐ نے شرکت کی ہے انکی جزئیات ہمیں فراہم کرے جبکہ قرآن ہمیشہ ایک بنیادی اور اساسی بات کرتا ہے۔اس کتاب کو اپنی کتاب ہدایت اور لوگوں کو ظلمت سے نور کی طرف نکالنے اور انسانی ذمہ داریوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے قانون تاریخ کی اتنی مقدار میں ہی شرح کرے گی جو تغیر کے میدان میں راہنمائی کر سکے یہ جنگ میں پیغمبرؐ کے اس طریقہ کو بیان کرے گی جس سے ہماری راہنمائی ہو سکے ہمیں ہدایت مل سکے تا کہ ہم واقعات کے حالات اور شرائط کو درک کر سکیں۔

قرآن میں قانون تاریخ بیان کرنے کا طریقہ

قرآن کو ملاحظہ کرنے سے اس حقیقت کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ قانون تاریخ ایک حقیقت ہے میدان تاریخ کے کچھ قوانین ہیں جسطرح کائنات کے دیگر امور کے لیے قوانین ہیں اور یہ حقیقت ہمیں قرآن میں روشن اور واضح صورت میں نظر آئے گی اور یہ حقیقت مختلف انداز اور شکل و صورت میں بہت ساری آیات قرآنی میں بیان ہوئی ہے کبھی ایک قاعدہ کلیہ دیا جاتا ہے کہ تاریخ کے لئے ایک قانون ہے۔

اور کچھ دوسری آیات میں یہ حقیقتِ عرضی میں بیان کرتے ہوئے ملیں گے۔اس حقیقت کے قرآن میں بہت سے نمونے اور مصادیق ملیں گے جہاں قانون تاریخ نے تاریخ میں اپنی حکمرانی کا اجراء کیا ہے، اسکا ذکر ملے گا۔اور اسی طرح بعض آیات کے سیاق میں یہ بیان ہوگا جہاں نظریہ کو تطبیق کے ساتھ ملا کر پیش کیا گیا ہے یعنی مفہوم کلی کو بیان کیا گیا ہے اور اس کے ضمن میں اس کے مصادیق بھی بیان ہوئے ہونگے۔

اسی طرح بعض آیات میں انسان کو تاکید کے ساتھ دعوت دی گئی ہے کہ وہ حوادثِ گذشتگان سے استفادہ کرے اور اپنی ہمت میں اضافہ کرے تا کہ وہ تاریخ کو سمجھے اور حوادث کا جائزہ لے۔یہ ایک علمی عمل ہے اور اس کے ذریعے ہم قانون تاریخ کو تلاش کر سکتے ہیں۔اسطرح اگر قانون تاریخ تلاش کرنا مقصود نہیں تو اس بات کا کوئی مفہوم نہیں کہ خداوند متعال فرضی طور پر یہ دعوت فکر ہمیں دے۔

پس واضح ہوا کہ قانون تاریخ کا متعدد آیات قرآنی میں مختلف انداز و بیان میں ذکر ہوا ہے جو اس حقیقت کی توضیح کرنے کے لئے ہے۔

روز سہ شنبہ ۲۵ جمادالاول ۱۳۹۹ھ

درس چہارم

اعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللّٰہ رب العالمین وصلی اللّٰہ علی محمدو آلہ المیامین الطاھرین.

قرآن میں قانون تاریخ کے بیان کرنے کا طریقہ:۔

ہم نے قانون تاریخ کے بارے میں بتایا کہ یہ قانون قرآن کریم میں مختلف شکل اور مختلف انداز میں پیش ہوا ہے بعض آیات میں ایک کلی شکل دی ہے اور بعض آیات میں مختلف مصادیق پر تطبیق کرتے ہوئے پیش ہوا ہے اور بعض آیات میں تاریخی شواہد تک پہنچنے کیلئے استقراء اور جستجو کا حکم دیا گیا ہے تا کہ اس طرح قانون تاریخ تک پہنچ سکیں۔

بعض آیات میں ایک اور شکل وصورت میں پیش کیا ہے ہم ان آیات کریمہ میں سے کچھ کو پڑھیں گے۔ بعض آیات کہ جنہیں ہم آپ کی خدمت میں پیش کریں گے اپنے مقصود پر واضح طور سے دلالت کرتی ہیں اور بعض دوسری آیات ہیں ایک خاص شکل میں دلالت کرتی ہیں اور بعض آیات ایسی ہیں کہ جو اس فکر کی کلی صورت کی تائید کرتی ہیں:

ا۔قانون تاریخ کے کلی فکر کا بیان

بعض آیات کریمہ، یہ فکر دیتی ہیں کہ تاریخ کے لئے قوانین ہیں اور ضوابط ہیں۔وہ آیات یہ ہیں:

﴿ولکل امۃٍ اجل فاذاجآء اجلھم لایستاخرون ساعۃً ولایستقدمون﴾

''اور ہر قوم کے لئے ایک وقت مقرر ہے پس جب ان کا مقرر وقت آجاتا ہے تو نہ ایک گھڑی تاخیر کرسکتے ہیں اور نہ جلدی'' (یونس/ ۴۹)

﴿لکل امۃٍ اجل اذاجآء اجلھم فلایستاخرون ساعۃً ولایستقدمون﴾ ''ہر امت کے لئے ایک وقت مقرر ہے۔جب ان کا مقررہ وقت آئے

گا تو وہ گھڑی بھر کے لئے نہ تاخیر کرسکیں گے اور نہ تقدیم'' (اعراف/۳۴)

ان دوآیات کو ملاحظہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اجل کی نسبت امت کی طرف ہے یعنی انسانی اجتماع کی طرف نسبت ہے نہ کہ ایک فرد کی طرف۔

جب ہر انسان کے لئے ایک معین اور مقرر اجل ہے تو وہاں ایک اور اجل ہے جو ان افراد کے اجتماعی وجود کے لئے ہے، امت کے لئے اجل اس اعتبار سے کہ وہ ایک مجتمع ہے وہ مجتمع کہ جو افراد کے درمیان افکار،نظریات،قدرت اور قابلیت کے تعلقات اور روابط پائے جاتے ہیں۔

اس مجتمع کو کہ جسے قرآن کریم امت سے تعبیر کرتا ہے اس کے لئے ایک اجل ہے ،اس کے لئے موت ہے،اس کے لئے حیات ہے،اس کے لئے حرکت ہے،جس طرح ایک فرد حرکت کرتا ہے وہ زندہ ہے بعد میں مرجاتا ہے اسی طرح امت کے لئے ایک زندگی ہے پھر مرجاتی ہے اور جس طرح فرد کا موت،قانون اور رموزات کے آگے خاضع ہے اسی طرح امتوں کے لئے بھی مدّت معین ہے اور یہاں ایسے رموزات ہیں کہ جو ہر امت کو مدت سے محدود کرتا ہے۔

پس ان دونوں آیات کریمہ نے فکر کلی کو واضح طور سے بتادیا کہ تاریخ کے لئے قانون ہے یہ ایک فکر ہے کہ شخصی قوانین کے بعد سب ان قوانین کے زیر سایہ ہوں گے یعنی اُن قوانین کے بعد کہ جن میں افراد پر اپنی شخصی اعتبار سے حکم ہوتے ہیں۔

﴿ومآ اھلکنا من قریۃٍ الاولھا کتاب معلوم.ماتسبق من امۃٍ اجلھا ومایستاخرون﴾ ''اور ہم نے کسی بستی کو ہلاکت میں نہیں ڈالا مگر یہ کہ اس کے لئے ایک معینہ مدت لکھی ہوئی تھی۔کوئی قوم اپنی معینہ مدت سے نہ آگے نکل سکتی ہے اور نہ پیچھے رہ سکتی ہے'' (حجر/۴تا۵)

﴿ماتسبق من امۃٍ اجلھا ومایستاخرون﴾ ''کوئی امت اپنے مقررہ وقت سے نہ آگے جاسکتی ہے اور نہ پیچھے رہ سکتی ہے'' (مومنون/۴۳)

﴿اولم ینظروا فی ملکوت السمٰوٰت والارض وماخلق الله من شیءٍ وان عسیٰٓ ان یکون قداقترب اجلھم فبای حدیثٍ بعدہ یؤمنون ﴾ ''کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین کی سلطنت اور جو چیزیں اللہ نے پیدا کی ہیں ان میں غور نہیں کیا اور یہ نہیں سوچا کہ شاید ان کی موت کا وقت نزدیک ہو رہا ہو؟ آخر اس (قرآن) کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے؟'' (اعراف/١٨٥)

ان آیات کریمہ سے یہ ظاہر ہے کہ جس اجل کا آپ انتظار کر رہے ہیں وہ قریب ہے یا ان کو تہدید کر رہا ہے کہ وہ قریب ہے وہ اجل اجل اجتماعی ہے نہ کہ اجل فردی کیونکہ عام طور پر ایک پوری قوم ایک ہی وقت میں نہیں مرتی مگر یہ جماعت کا کلی وجود ہے کہ ممکن ہے اس کی اجل قریب آچکی ہو۔

اجل اجتماعی یہاں بیان ہوئی ہے اس سے مراد وہ حالت ہے جو جماعت سے قائم ہو نہ کہ وہ حالت جو اس فرد سے قائم ہے کیونکہ عام طور پر لوگوں پر اگر فردی نظر رکھیں تو ان کی مدّتیں مختلف ہوتی ہیں لیکن جب ان کو ایک اجتماع کے حوالہ سے دیکھیں گے جو ظلم کرنے اور عدل قائم کرنے کے حوالہ سے ایک ہی مجموعہ ہے مصائب اور خوشی کے مواقع پر ایک ہیں تو ان سب کے لئے ایک اجل ہے اور یہ اجل اجتماعی کہ جس کی طرف اشارہ ہوا وہ اجل امت ہے۔ لہٰذا یہ آیت کریمہ پہلے ذکر شدہ آیات کے ساتھ جا ملتی ہے۔

﴿وربّک الغفور ذوالرحمة لویؤاخذھم بما کسبوا لعجّل لھم العذاب بل لھم موعدلن یجدوا من دونہٖ موئلاً. وتلک القرٰٓی اھلکنٰھم لما ظلموا وجعلنا لمھلکھم موعدًا ﴾ ''اور آپ کا پروردگار بڑا بخشنے والا رحمت کا مالک ہے اگر وہ ان کی حرکات پر انہیں گرفت میں لینا چاہتا تو انہیں جلد ہی عذاب دے دیتا لیکن ان کے وعدے کا وقت مقرر ہے وہ اس کے سوا کوئی پناہ گاہ ہرگز نہیں پائیں گے۔ اور ان بستیوں کو ہم نے اس وقت ہلاکت میں ڈال دیا جب انہوں نے ظلم کیا اور ہم نے ان کی ہلاکت کے لئے بھی ایک وقت مقرر کر رکھا تھا'' (کہف/ ٥٨تا٥٩)

﴿ولو یؤاخذ الله الناس بظلمھم ماترک علیھا من دآبةٍ ولٰکن یؤخرھم الٰی اجلٍ مسمیً فاذاجآء اجلھم لایستاْخرون ساعةً ولایستقدمون ﴾ ''اور اگر لوگوں کے ظلم کی وجہ سے اللہ ان کا مواخذہ کرتا تو روئے زمین پر ایک جاندار بھی نہ چھوڑتا لیکن اللہ انہیں ایک مقررہ وقت تک مہلت دیتا ہے پس جب ان کا مقررہ وقت آجاتا ہے تو وہ نہ گھڑی بھر کے لئے پیچھے ہو سکتے ہیں اور نہ آگے بڑھ سکتے ہیں'' (نحل/٦١)

﴿ولو یؤاخذ اللّٰہ الناس بما کسبوا ماترک علیٰ ظھرھا من دآبةٍ ولٰکن یؤخرھم الیٰٓ اجلٍ مسمیً فاذاجآء اجلھم فان اللّٰہ کان بعبادہٖ بصیرًا ﴾ ''اور اگر اللہ لوگوں کو ان کی حرکات کی پاداش میں اپنی گرفت میں لے لیتا تو وہ روئے زمین پر کسی چلنے پھرنے والے کو نہ چھوڑتا لیکن وہ ایک مقررہ وقت تک مہلت دیتا ہے چنانچہ جب ان کا مقررہ وقت آجائے گا تو اللہ اپنے بندوں پر خوب نگاہ رکھنے والا ہے'' (فاطر/٤٥)

ان آیات میں آیا ہے کہ خدا اگر چاہے کہ لوگوں کے ظلم کی بنیاد پر انکا مواخذہ کرے اور ان کی حرکتوں کو گرفت میں لے تو روئے زمین پر کوئی انسان نہ بچ سکے یعنی سارے لوگ ہلاک ہونگے۔

ان آیات کے مفہوم قرآنی کی کیفیت کو پیش کرنے میں مشکل پیش آتی ہے کیونکہ عام طور پر پوری قوم ظالم نہیں ہوتی، قوم میں انبیاء، آئمہؑ اور اوصیاء بھی شامل ہوتے ہیں تو کیا ہلاکت میں انبیاء، آئمہ اور مومنین شامل ہونگے اس وجہ سے بعض افراد نے ان آیات سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے عصمت انبیاء کا انکار کیا ہے۔

جب کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دو آیات دنیوی عذاب کی بات کر رہی ہیں نہ کہ اُخروی عذاب کی۔ یہ آیات امت نے ظلم و سرکشی کے ذریعہ سے اپنے لئے جس چیز کو آمادہ کیا ہے اس طبیعی نتیجہ کی بات کر رہی ہیں۔ تو یہ طبیعی نتیجہ اجتماع کے فقط ظالمین سے مختص نہیں ہوا بلکہ اس میں اس اجتماع میں زندگی گزارنے والے تمام شامل ہوں گے اگرچہ ان کی

شخصیات مختلف ہی کیوں نہ ہواوران کی رفتار وسلوک بھی ان سے مختلف ہو۔

جب خداوند عالم نے بنی اسرائیل کو ان کی سرکشی کی وجہ سے میدانوں میں سر گرداں کیا تو یہ سرگردانی بنی اسرائیل کے صرف ظالمین تک محدود نہیں رہی بلکہ حضرت موسیٰؑ بھی اس میں شامل ہوئے۔اس ظلم اورسرکشی کے لپیٹ میں سب سے زیادہ طاہر وپاکیزہ اورشجاع ترین مرد بھی آگئے یعنی موسیٰؑ شامل ہوئے کیونکہ وہ اسی امت کے ایک فرد تھے تواس امت کی ہلاکت کے موقع میں یہ بھی آگئے یہ لوگ اپنے ظلم کے نتیجہ میں چالیس سال تک سرگرداں رہے اوراس سرگردانی میں حضرت موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام بھی شامل ہوئے۔جب مسلمان عذاب اور بلا میں مبتلا ہوئے تو یزید بن معاویہ ان کا خلیفہ بنا ان کے جان ومال عزت وآبرواورعقائد پرحملہ آورہواجب یہ بلا آگئی تو یہ بلا فقط امت اسلامی کے ظالمین تک محدود نہ رہی بلکہ اسکی گرفت میں حضرت امام حسینؑ جو عادل ومعصوم ، پاک و پاکیزہ ہستی تھے وہ بھی اس کا شکار ہوئے اوراس بے دردی کے ساتھ اپنے اعوان وانصار کے ساتھ شہید کئے گئے۔

یہ سب قانون تاریخ کی منطق ہے کہ جب قانون تاریخ کے تحت کسی قوم پرعذاب نازل ہوتو یہ اس معاشرے کے صرف ظالمین تک محدود نہیں رہے گا بلکہ اسکی زد میں نیک وپاکیزہ لوگ بھی آئیں گے لہٰذا قرآن کریم نے ایک اورآیت میں فرمایا ہے:

﴿واتقوا فتنةً لاتصيبن الذين ظلموا منكم خآصةً وعلموآ ان الله شديدالعقاب﴾ ''اوراس فتنے سے بچو جس کی لپیٹ میں تم میں سے صرف ظلم کرنے والے ہی نہیں (سب) آئیں گے اور یہ جان لو کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے'' (انفال/۲۵)

لیکن ایک اورجگہ پر یوں فرماتے ہیں:

﴿ولاتزروازرة وزراخریٰ وان تدع مثقلة الیٰ حملهالايحمل منه شيء ولو كان ذاقربیٰ﴾ ''اورکوئی بوجھ اٹھانے والاکسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے

گا اوراگرکوئی بھاری بوجھ والا اپنا بوجھ اٹھانے کے لئے کسی کو پکارے گا تو اس سے کچھ بھی اٹھایا نہیں جائے گا خواہ وہ قرابت دار ہی کیوں نہ ہو'' (فاطر/۱۸)

پس اُخروی عذاب ہمیشہ اسی کے لئے ہے جس نے ناس غلط فعل کوانجام دیا ہے لیکن دنیاوی عذاب اس سے وسیع ہے یہ عذاب دوسرے افراد کو بھی اپنی لپیٹ میں لیتے ہیں۔پس یہ دوآیات قانون تاریخ کے بارے میں گفتگو کررہے تھے نہ کہ اس عذاب کی جوآخرت میں دی جاتی ہے جو قیامت کے دن ہے بلکہ قانون تاریخ کی بات کررہی ہے اس بارے میں گفتگو ہورہی ہے کہ امت کے کسب کا نتیجہ کیسے ممکن ہے،امت کی سعی اورتلاش کا نتیجہ کیسے ممکن ہے۔

﴿وان كادواليستفزونك من الارض ليخرجوك منهاواذاًلايلبثون خلٰفك الاقليلاً.سنة من قدارسلناقبلك من رسلناولاتجدلسنتناتحويلاً﴾

''اور یہ لوگ آپ کا قدم اس سرزمین سے اکھاڑنے کی کوشش میں رہے ہیں تاکہ آپ کو یہاں سے نکال دیں اوراگر یہ ایسا کریں گے تو آپ کے بعد زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہرسکیں گے۔یہ ہمارا دستور ہے جو ان تمام رسولوں کے ساتھ رہا ہے جنہیں ہم نے آپ سے پہلے بھیجا تھا اور آپ ہمارے دستورالعمل میں کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے'' (اسراء/۷۶/۷۷)

یہ آیت کریمہ بھی قانون تاریخ کے عمومی مفہوم کی تاکید کرتا ہے﴿و لاتجد لسنتنا تحويلا﴾ یعنی یہ ہمارا دستور ہے اورآپ سے پہلے آنے والے سارے انبیاء کے ساتھ بھی رہا ہے اور ہمیشہ کے لئے باقی رہے گا اوراس میں کوئی تبدیلی آنے والی نہیں ہے۔

اہل مکہ آپؐ کے قدم کواس سرزمین سے اکھاڑنے کی کوشش میں ہیں تاکہ آپؐ کو یہاں سے نکال دیں کیونکہ وہ لوگ آپؐ کو،آپؐ کی دعوت کواورآپؐ کی باتوں کو نہ روک سکے۔لہٰذا ان کے پاس ایک ہی راستہ باقی رہ گیا اوروہ آپؐ کو مکہ سے نکال دینا ہے اور یہاں پرقوانین

تاریخ میں سے ایک قانون ہے (انشاء اللہ اس کی شرح ہم بعد میں کریں گے جس کی طرف اس آیت کریمہ میں اشارہ ہوا ہے) وہ یہ ہے کہ جب ہر طرح کے تمام ممکنہ وسائل سے عاجز ہونے کے بعد وہ لوگ اس پر متفق ہوئے کہ نبی اکرمؐ کو اس شہر سے نکال دیں گے تو ﴿**فانھم لایلبثون الّاقلیلاً**﴾ "تم بھی زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکو گے" ﴿**انھم لایلبثون الاقلیلاً**﴾ سے یہ مراد نہیں ہے کہ اب ان پر عذاب آنے والا ہے کیونکہ اہل مکہ نے اس سورہ کے نزول کے بعد رسول اللہؐ کو مکہ سے نکال دیا ان کو ڈرایا دھمکایا۔

اور رسول خداؐ کو مکہ میں جب کوئی مادّی پناہ گاہ نہیں ملا تو آپؐ وہاں سے مدینہ کی طرف تشریف لے گئے اور اہل مکہ پر آسمان سے کوئی عذاب نہیں آیا۔

احتمال قوی ہے کہ اس تعبیر سے مراد یہ ہو کہ وہ لوگ ایک جنگجو اور دشمن کی جماعت کی شکل میں زندگی نہیں گزار سکیں گے جس طرح ابھی تھا اس طرح نہیں رہ سکتے سے یہ مراد ہے نہ یہ کہ وہ لوگ نہیں رہیں گے یا وہ بشر نہیں رہیں گے۔ اما ان کی یہ موقعیت اس کام کے نتیجہ میں ختم ہو جائے گی، ان کی یہ موقعیت ختم ہو کے رہے گی زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے کیونکہ یہ نبوت، جسے یہ لوگ محصور کرنے سے عاجز رہے اس میں یہ قوت آجائے گی کہ اس جماعت کو ہلا کر رکھ دیں گے اور یہ وہی ہے جو واقع ہوا چونکہ رسول اللہؐ جب مکہ سے چلے گئے تو وہ زیادہ دیر نہیں ٹہر سکے کیونکہ اس وقت معارضہ کی موقعیت ختم ہو گئی اور چند سال کے بعد ہی مکہ دارالاسلام کا جزء بن گیا۔

﴿**قد خلت من قبلکم سنن فسیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبة المکذبین**﴾ "تم سے پہلے مختلف روشیں گزر چکی ہیں پس تم روئے زمین پر چلو پھر اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا ہے" (آل عمران/۱۳۷)

یہ آیت قانون تاریخ کی تاکید کرتی ہے اور اس بات کی طرف متوجہ کرتی ہے کہ حوادث تاریخ کو معلوم کرنے کے لئے جستجو کریں تا کہ اس سے یہ قانون تاریخ کشف ہو جائے اور اس قانون سے عبرت حاصل کر سکیں۔

۲۔ حوادث تاریخ کے ذکر میں قانون کا بیان

یہ آیت بھی پیغمبرؐ کے دل کی تسلی کیلئے ہے کہ جس میں آپ کو سابقہ تجربات اور قوانین سے ربط دیا ہے آپ کو گذشتہ انبیاء کے تجربہ سے آگاہ کیا گیا ہے:

﴿**ولقد کذبت رسل من قبلک فصبروا علیٰ ما کذبوا واوذوا حتّٰی اتٰھم نصرنا ولا مبدل لکلمٰت اللّٰہ ولقد جآئک من نبای المرسلین**﴾ "اور بتحقیق آپ سے پہلے بھی بہت سے رسول جھٹلائے جاتے رہے اور تکذیب وایذاء پر صبر کرتے رہے ہیں یہاں تک کہ انہیں ہماری مدد پہنچ گئی اور اللہ کے کلمات تو کوئی بدل نہیں سکتا چنانچہ سابقہ پیغمبروں کی خبریں آپ تک پہنچ چکی ہیں" (انعام/۳۴)

یہ آیت اس کی وضاحت کرتا ہے کہ یہاں ایک قانون ہے جو آپؐ پر جاری ہوگا اور گذشتہ انبیاء پر بھی جاری ہوا ہے جو آپؐ سے پہلے اس تجربہ پر عمل کر چکے ہیں نصرت آئے گی لیکن اس نصرت کے لئے کچھ شرائط معین ہیں: صبر، استقامت اور دوسرے شرائط کو پورا کرنا یہ اس نصرت تک پہنچنے کا راستہ ہے لہٰذا فرمایا: ﴿**فصبروا علیٰ ما کذبوا...... لکلمٰت اللّٰہ**﴾ پس یہاں خدا کیلئے ایک کلمہ ہے تاریخ کے گذر جانے سے اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ یہ کلمہ کہ جس میں تبدیلی نہیں آتی وہ کامیابی اور ان قضایا اور شرائط اور صفات کے درمیان کا ربط ہے کہ جو مختلف آیات سے واضح ہوتی ہیں اور اجمالی طور پر یہاں بیان ہوا ہے پس یہاں تاریخ کا قانون ہے۔

﴿**واقسموا باللّٰہ جھد ایمانھم لئن جآء ھم نذیر لّیکوننّ اھدٰی من احدی الامم فلمّا جآء ھم نذیر مّازادھم الّانفورا. فھل ینظرون الّاسنت الاولین فلن تجد لسنت اللّٰہ تبدیلاً ولن تجد لسنت اللّٰہ تحویلاً**﴾ "اور یہ لوگ اللہ کی پکی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اگر ان کے پاس کوئی تنبیہ کرنے والا آتا تو وہ ہر قوم سے بڑھ کر ہدایت یافتہ ہو جاتے لیکن جب ایک متنبہ کرنے والا ان کے پاس آیا تو ان کی نفرت میں صرف اضافہ ہی ہوا۔ تو کیا یہ لوگ اس دستور کے منتظر ہیں جو پچھلی قوموں کے ساتھ

رہا؟ لہٰذا آپ اللہ کے دستور میں ہرگز کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے اور نہ آپ اللہ کے دستور میں کوئی تغیر پائیں گے'' (فاطر/۴۳،۴۴)

﴿ولو قاتلکم الذین کفروا لولّوا الادبار ثمّ لایجدون ولیًّا وّلانصیرًا .سنة اللّٰه التی قدخلت من قبل ولن تجدلسنة اللّٰه تبدیلا﴾ ''اور اگر کفار تم سے جنگ کرتے تو پیٹھ دکھا کر فرار کرتے پھر وہ نہ کوئی کارساز پاتے اور نہ مددگار۔ اللہ کے دستور کے مطابق جو پہلے سے رائج ہے اور آپ اللہ کے دستور میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے'' (فتح/۲۲،۲۳)

یہاں کچھ آیات ہیں جن میں قانون تاریخ کے کچھ نمونے بیان ہوئے ہیں:

﴿ان اللّٰه لایغیر مابقومٍ حتّٰی یغیروا ماباَنفسهم واذا ارادالله بقومٍ سوٓءً افلا مردله ومالهم من دونه من والٍ﴾ ''اللہ کسی قوم کا حال یقیناً اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلیں اور جب اللہ کسی قوم کو برے حال سے دوچار کرنے کا ارادہ کرلے تو اس کے ٹلنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی اور نہ ہی اللہ کے سوا ان کا کوئی مددگار ہوتا ہے'' (رعد/۱۱)

یہ آیت کریمہ قانون تاریخ کے نمونے میں سے ایک نمونہ پیش کرتی ہے: خدا کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدل لیں۔

انسان کی اندرونی روحی اور نفسی تصورات اس کی بنیاد ہے اور باہر کی اجتماعی حالت اسکی عمارت ہے۔ اس کی عمارت میں اس وقت تک تغیر نہیں آئے گی جب تک اس کی بنیاد یعنی اندر تغیر نہ آئے (اس کی شرح انشاءاللہ بعد میں آئے گی)

پس یہ آیت بنیاد اور اس کی عمارت کے درمیان ہونے والے اس خاص رابطہ کی بات کررہی ہے۔ انسان کے نفسی، روحی اور فکری وضع کا اس کے اجتماعی وضع کے ساتھ رابطہ کو بیان کررہا ہے، انسان کے داخل اور اس کے خارج کے درمیان تعلق کو بیان کررہا ہے، پس انسان کا خارج اس کے داخل میں چھپا ہے اس کے اندرونی حالت سے مربوط ہے جب قوم اپنی نفس کے اندر تبدیلی لائے گی تو اس کی باہر کی حالت میں تبدیلی آئے گی اس

کے تعلقات میں تبدیلی آئے گی اور اس کے بعض سے بعض کا جو رابطہ ہے اس میں تبدیلی آئے گی۔ پس یہ قانون تاریخ میں سے ایک قانون ہے کہ داخل وخارج بنیاد اور عمارت کے درمیان رابطہ ہے۔

﴿ذٰلک بان اللّٰه لم یک مغیرًا نعمةً انعمها علیٰ قومٍ حتّٰی یغیروا ماباَنفسهم﴾ ''ایسا اس لئے ہوا کہ اللہ جو نعمت کسی قوم کو عنایت فرماتا ہے اسوقت تک اسے نہیں بدلتا جب تک وہ خود اسے نہیں بدلتے'' (انفال/۵۳)

﴿ام حسبتم ان تدخلوا الجنة ولمایاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم مسّتهم الباسآء والضرآء وزلزلوا حتّٰی یقول الرسول والذین اٰمنوا معهٗ متٰی نصر اللّٰه الآان نصر اللّٰه قریب﴾ ''کیا تم خیال کرتے ہو کہ یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تمہیں وہ پیش نہیں آئیں جو تم سے پہلوں کو پیش آئی تھیں؟ انہیں سختیاں اور تکلیفیں پہنچیں اور وہ اس حد تک جھنجھوڑے گئے کہ رسول اور اس کے مومن ساتھی چیخ اٹھے کہ آخر اللہ کی نصرت کب آئے گی؟ دیکھو اللہ کی نصرت عنقریب آنے والی ہے'' (بقرہ/۲۱۴)

ان آیات میں خداوند متعال نے اس فکر کو رد کیا ہے جو یہ چاہتے ہیں کہ انھیں قانون تاریخ سے مستثنٰی قرار دیا جائے۔

کیا تم یہ امید رکھتے ہو کہ تمھیں قانون تاریخ سے مستثنٰی رکھا جائے اور جنت میں داخل کئے جاؤ گے اور تمھیں کامیابی بھی حاصل ہوجائے گی۔ حالانکہ ابھی تم نے وہ زندگی گزاری ہی نہیں جو گذشتہ اقوام نے گزاری اور انھیں نصرت ملی اور وہ جنت میں داخل ہوئے لیکن کس راستے سے، مصیبت اور سختیوں کے راستے سے یہاں تک کہ قرآن کریم کی تعبیر کے مطابق وہ لرزہ براندام ہوئے۔ یہ حالات سختیاں اور تکلیفیں یہاں تک لرزہ براندام ہوجاتے یہ سب درحقیقت امت کے امتحان کے لئے تھا امت کے ارادے کا، استقامت کا اور استحکام کا امتحان لیں تاکہ وہ لوگوں کے درمیان تدریجی طور پر قدرت حاصل کرسکیں۔

پس اس صورت میں خدا کی نصرت قریب ہے لیکن اس کیلئے ایک راستہ ہے اسی طرح قرآن یہ بھی بتانا چاہتا ہے: یہ نصرت بطور صُدفہ اتفاقی نہیں آتی، یہ آنکھ بند اور اندھیرے میں ہونے والا کام نہیں ہے۔ نصرت قریب ہے لیکن اسکے لئے اس کے راستے پر گامزن ہونے کی ضرورت ہے اور وہ راستہ قانون تاریخ کا جاننا ہے آپکو منطق تاریخ سمجھ میں آنی چاہیے تاکہ آپ نصرت خدائے سبحان کے قریب ہوسکیں۔

ممکن ہے کبھی دوا مریض کے قریب ہو لیکن اسے اسکا علم ہی نہ ہو یا اس دوا کے کتنے چمچے کھانے ہیں جو اس مرض کے جراثیم کو ختم کر سکیں۔ یا نہ جانتا ہو کہ انسان اس طرح دوا کو استعمال نہیں کرسکتا چاہے اس کے پاس ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح نصرت کیلئے قانون تاریخ سے آشنائی ضروری ہے۔ یہی قانون تاریخ انسان کو نصرت تک پہنچا سکتا ہے۔ پس یہ آیت اپنے مخاطبین کو اس بات سے منع کر رہا ہے کہ تم چاہتے ہو کہ تمہیں قانون تاریخ سے مستثنٰی رکھا جائے، ایسا نہیں ہوسکتا۔

﴿**وما ارسلنا فی قریۃٍ من نذیرٍ الاقال مترفوھآ انا بمآ ارسلتم بہٖ کافرون. وقالوا نحن اکثر اموالاً واولاداً ومانحن بمعذبین**﴾ ''اور ہم نے کسی بستی کی طرف کسی تنبیہ کرنے والے کو نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہاں کے مراعات یافتہ لوگ کہتے تھے: جو پیغام تم لے کر آئے ہو ہم اسے نہیں مانتے۔ اور کہتے تھے: ہم اموال اور اولاد میں بڑھ کر ہیں اور ہم پر عذاب نہیں ہوگا'' (سباء/۳۴/۳۵)

﴿**بل قالوا انّا وجدنا اٰبآءنا علٰی امۃٍ وانا علٰی اٰثٰرھم مھتدون. وکذٰلک ماارسلنا من قبلک فی قریۃٍ من نذیرٍ الاقال مترفوھآ انا وجدنآ اٰبآءنا علٰی امۃٍ وانا علٰی اٰثٰرھم مقتدون. قٰل اولو جئتکم باھدٰی مماوجدتم علیہ اٰبآءکم قالوآ انا بمآ ارسلتم بہٖ کٰفرون**﴾ ''بلکہ یہ کہتے ہیں: ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک رسم پر پایا اور ہم انہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ اور اسی طرح ہم نے آپ سے پہلے کسی بستی کی طرف کوئی تنبیہ کرنے والا نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہاں کے عیش پرستوں نے کہا: ہم نے

اپنے باپ دادا کو ایک رسم پر پایا اور ہم انہی کے نقش قدم کی پیروی کر رہے ہیں۔ کہا: خواہ میں اس سے بہتر ہدایت لے کر آؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟ وہ کہنے لگے: جو کچھ دے کر تم بھیجے گئے ہو ہم اسے نہیں مانتے'' (زخرف/۲۲،۲۳،۲۴)

یہ تاریخ میں نبوت اور امتوں اور معاشروں کے عیش پرستوں اور مسرفوں کے درمیان موجود رویہ کو بیان کر رہے ہیں یہ موقف اور رویہ قوانین تاریخ کے ایک قانون کی مثال ہے یہ ایک ایسا واقعہ نہیں جو تاریخ میں بطور اتفاق وجود میں آیا ہو کیونکہ اگر یہ بطور اتفاق وجود میں آیا ہوتا تو ہمیشہ ایک ہی صورت میں اسکی تکرار نہ ہوتی اور خداوند عالم یہ نہ فرماتے کہ ''ہم نے جب بھی کوئی نبی بھیجا تو مترفین نے اسے رد کیا یعنی انکا انبیاء سے رویہ ہمیشہ منفی ہی رہا۔ یہاں پر معاشرے میں انبیاء کے اجتماعی موقعیت کا ایک کردار ہے اور مترفین اور مسرفین کے اجتماعی موقعیت کا ایک رویہ ہے یہ دونوں رویہ اور موقعیت کے آپس میں تناقص اور تضاد ہیں۔ یہ رویہ درحقیقت نبوت کے اجتماعی موقعیت کے کردار اور مترفین و مسرفین کے اجتماعی موقعیت کے کردار سے مربوط ہے۔ اور یہ معاشرہ کے عمومی موضوعیت کی دید پر ہے جیسا کہ ہم معاشرہ میں نبوت کا کردار اور نبوت کے موقعیت اجتماعی میں بحث گفتگو کریں گے اس وقت واضح ہوگا کہ نبوت کے لئے طبیعی نقیض مترفین اور مسرفین کی موقعیت ہے لہٰذا یہ قانون تاریخ میں ایک قانون ہے۔

﴿**واذآ اردنآ ان نھلک قریۃً امرنا مترفیھا ففسقوا فیھا فحق علیھا القول فدمرنٰھا تدمیرًا. وکم اھلکنا من القرون من بعد نوحٍ وکفٰی بربک بذنوب عبادہٖ خبیرًا بصیرًا**﴾ ''اور ہم کسی بستی کو ہلاکت میں ڈالنا چاہتے ہیں تو اس کے عیش پرستوں کو حکم دیتے ہیں تو وہ اس بستی میں فسق و فجور کا ارتکاب کرتے ہیں تب اس بستی پر فیصلہ عذاب لازم ہوجاتا ہے پھر ہم اسے پوری طرح تباہ کر دیتے ہیں۔ اور نوح کے بعد کتنی نسلوں کو ہم نے ہلاکت میں ڈال دیا اور آپ کا رب ہی اپنے بندوں کے گناہوں پر آگاہی رکھنے اور نگاہ رکھنے کیلئے کافی ہے'' (اسراء/۱۶،۱۷)

یہ آیت بھی ایک خاص ارتباط کی بات کررہی ہے۔ یہ بتارہی ہے کہ ظلم پھیلنے اور ظلم غالب آنے کا امت کی ہلاکت کی طرف لے جانے میں خاص ارتباط ہے۔آیت اس بات کی بھی تاکید کرتی ہے کہ ان دونوں کے درمیان کا یہ ارتباط عمومی ہے اور تاریخ میں عام رہا ہے اور یہ قانون تاریخ کا ایک قانون ہے۔

﴿ولو انهم اقاموا التورٰة و الانجيل ومآ انزل اليهم من ربهم لا كلوا من فوقهم ومن تحت ارجلهم﴾''اوراگر یہ اہل کتاب توریت وانجیل اوران کے رب کی طرف سے ان پر نازل شدہ دیگر تعلیمات کو قائم رکھتے تو وہ اپنے اوپر کی (آسمانی برکات) اور نیچے کی (زمینی برکات) سے مالا مال ہوتے ان میں کچھ میانہ رو بھی ہیں لیکن ان میں اکثریت بدکردار لوگوں کی ہے ''(مائدہ/٦٦)

﴿ولو ان اهل القرىٰ اٰمنوا وتقوا لفتحنا عليهم بركٰتٍ من السمآء و الارض ولكن كذّبوا فاخذنٰهم بما كانوا يكسبون﴾''اوراگران بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے لیکن انہوں نے تکذیب کی تو ہم نے ان کے اعمال کے سبب انھیں گرفت میں لیا''(اعراف/٩٦)

﴿وان لو استقاموا علىٰ الطريقة لاسقينٰهم مآءً غدقاً﴾''اوراگر یہ لوگ سب ہدایت کے راستے پر ہوتے تو ہم انہیں وافر پانی سے سیراب کرتے''(جن/١٦)

یہ تین آیات بھی ایک خاص ارتباط کی گفتگو کررہی ہیں استقامت اوراحکام خدائے سبحان کے نفاذ اور خیرات اور پیداوار میں اضافہ ہونے کے درمیان گہرا ربط ہے۔ اگر آج کی زبان میں بات کریں تو تقسیم میں عدالت اور پیداوار میں فراوانی میں گہرا ربط ہے۔قرآن کریم تاکید کے ساتھ فرماتا ہے کہ وہ معاشرہ جہاں تقسیم میں عدالت غالب ہو، یہ تقسیم میں عدالت وہی ہے جسے قرآن نے ایک دفعہ یوں تعبیر کی ہے: ﴿لو استقاموا علىٰ الطريقة لاسقينٰهم مآءً غدقاً﴾اوردوسری دفعہ یوں بیان فرمایا﴿لو ان اهل القرىٰ آمنوا و اتقوا﴾اور تیسری جگہ پر یوں فرماتا ہے:﴿لو انهم

اقاموا التورٰة و الانجيل﴾تورات وانجیل قائم کرنے سے مراد یہ کہ شریعت آسمانی قائم کرے کیونکہ شریعت اسلامی تقسیم میں عدالت کے قیام کیلئے نازل ہوئی ہے تقسیم کے تعلقات میں عدالت کی بنیاد کو قائم کرنے والے کیلئے نازل ہوئی ہیں کہتے ہیں: اگر وہ لوگ تقسیم میں عدالت کے پابند ہوتے تو اس وقت پیداواری میں کمی نہ ہوتی اس لحاظ سے وہ فقر میں مبتلا نہ ہوتے، ثروت بڑھ جاتی، مال ودولت بڑھ جاتے خیرات اور برکات میں اضافہ ہوجاتا۔لیکن انہوں نے یہ خیال کیا کہ تقسیم میں عدالت انھیں فقر لائے گی، یہ خود تقسیم کا سبب بنے گی تو اس کے نتیجہ میں لوگ فقیر ہوں گے۔لیکن قانون تشریع اور آیات اس کے برعکس بتاتی ہیں آیات یہ تاکید کرتا ہے کہ شریعت آسمانی کا نفاذ اور تقسیم کے میدانوں میں احکام کا اجراء پیداوار میں ہمیشہ کیلئے اضافہ کا سبب ہے، ثروت میں زیادتی کا سبب ہے یہاں تک کہ آسمان وزمین سے لوگوں پر برکات کے دروازے کھل جائیں گے یہ بھی اس قانون تاریخ کا ایک قانون ہے۔

٣۔حوادث تاریخ میں غور وفکر کی دعوت

گذشتہ آیات کے علاوہ قرآن کریم میں آیات کا ایک سلسلہ اور بھی موجود ہے جن میں تاریخی واقعات میں استقراء نظر اور تدبر کرنے کی تاکید ہوئی ہے تاکہ ایک کلی نظریہ قائم ہو اور میدان تاریخ کے قوانین اور کائناتی قوانین معلوم ہوجائیں:

﴿افلم يسيروا فى الارض فينظروا كيف كان عاقبة الذين من قبلهم﴾''کیا یہ لوگ زمین میں چلتے پھرتے نہیں ہیں کہ وہ دیکھ لیتے ان سے پہلے والوں کا کیا انجام ہوا؟''(محمد/١٠)

﴿افلم يسيروا فى الارض فينظروا كيف كان عاقبة الذين من قبلهم﴾''تو کیا یہ لوگ روئے زمین میں چل پھر کر نہیں دیکھتے کہ ان سے پہلے والوں کا کیا انجام ہوا؟''(یوسف/١٠٩)

﴿فكاين من قريةٍ اهلكنٰها وهى ظالمة فهى خاوية علٰى عروشها وبئرٍ معطلةٍ

وقصرٍ مشیدٍ. افلم یسیروافی الارض فتکون لھم قلوب یعقلون بھآ اواٰذان یسمعون بھافانھالاتعمی الابصارولکن تعمی القلوب التی فی الصدور ﴾ ''غرض کتنی ہی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے تباہ و برباد کردیا کہ وہ ظالم تھیں تو اب وہ اپنی چھتوں کے بھل الٹی پڑی ہیں اور ان کے کنویں معطل پڑے ہیں اور ان کے مظبوط محل بھی مسمار ہوگئے ہیں۔ کیا ان لوگوں نے زمین میں سیر نہیں کی ہے کہ ان کے پاس ایسے دل ہوتے جو سمجھ سکتے اور ایسے کان ہوتے جو سن سکتے۔ اس لئے کہ درحقیقت آنکھیں اندھی نہیں ہوتی ہیں بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں کے اندر پائے جاتے ہیں'' (حج/۴۵،۴۶)

﴿وکم اھلکناقبلھم من قرنٍ ھم اشدمنھم بطشًافنقّبوافی البلادھل من مّحیصٍ. انّ ذٰلک لذکرٰی لمن کان لہ قلبٌ اوالقی السّمع وھوشھیدٌ ﴾ ''ہم نے ان سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو ہلاک کیا جو ان سے قوت میں کہیں زیادہ تھیں پس وہ شہر بہ شہر پھرے کیا کوئی جائے فرار ہے؟۔ اس میں ہر صاحب دل کیلئے یقیناً عبرت ہے جو کان لگا کر توجہ سے سنے اور حاضر ہو'' (ق/۳۶،۳۷)

قرآن میں قانون تاریخ کا انکشاف

تمام گذشتہ آیات جنکی ہم نے وضاحت کی ہے ان سے یہ مفہوم بھی ابھر کر سامنے آتا ہے کہ قرآن ہمیں تاکید کرتا ہے کہ میدانِ تاریخ کیلئے بھی قوانین ہیں اس کیلئے اصول و ضوابط ہیں جسطرح دنیا کے دیگر میدانوں کیلئے قوانین وضوابط ہیں۔ اس اصول کا انکشاف دراصل قرآن کی بڑی فتح ہے کیونکہ ہماری آگاہی کے مطابق قرآن ہی وہ پہلی کتاب ہے جس نے انسان کو اس قانون سے آگاہ کیا ہے اور اس مفہوم پر تاکید بھی کرتا ہے، اسے کشف بھی کرتا ہے اور اس پر اصرار بھی ہے اور اپنے پاس قانع کرنے اور تفہیم کے جتنے وسائل تھے ان سب کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔ قرآن نے حوادث تاریخ کو بطور صدفہ یا غیب یا تسلیم محض ہونے جیسے نظریات کو مسترد کیا ہے۔ گذشتہ زمانے میں عادی انسان ان حوادث کو اتفاق سمجھتے تھے یا قضا و قدر یا حکم خدا سمجھتے تھے۔ یا یہ کہتے کہ خدا ہم سے ناراض ہو گیا

ہے۔ قرآن نے ان تمام تصورات کو رد کیا ہے۔ اور عقل بشری کو اس طرف متوجہ کیا کہ تاریخ کیلئے بھی اصول وقوانین ہیں تاکہ انسان فاعل موثر کے طور پر زندگی گزارے اور اس کیلئے ان قوانین کا کشف ضروری بھی ہے۔ اور انسان سے کہا کہ تمھارے لیے ضروری ہے کہ ان قوانین سے آگاہی حاصل کرو تاکہ حوادث پر حاکم ہوسکو۔ اگر ایسا نہیں کروگے تو یہ قوانین تمھارے اوپر حاکم ہونگے۔ اور تم آنکھیں بند کئے ہوئے ہوگے۔ اپنی آنکھوں کو ان قوانین کے لئے کھولو تاکہ تم حاکم رہو ایسا نہ ہو کہ یہ قوانین تم پر حاکم ہوجائیں۔

اس میدان میں قرآن کی یہ فتح ایسی فتح ہے جس نے صدیوں بعد فکر بشری کو اس ضمن میں آمادہ کیا اور انسان نے قرآن نازل ہونے کے تقریبا آٹھ صدی بعد اس بارے میں سوچنا شروع کیا۔ الحمداللہ یہ خود مسلمانوں کے ہاتھوں سے شروع ہوئی اور ابن خلدون وہ پہلا شخص ہے جس نے اس حوالے سے کام شروع کیا اور قانون تاریخ کو کشف کیا۔ اور اسکے کم از کم چارسو سال بعد یورپ والے بیدار ہوئے جس دور کو آج کل کی اصطلاح میں صنعتی انقلاب کہتے ہیں۔ انہوں نے اس مفہوم کو عملی شکل دینے کی کوشش کی جسے مسلمانوں نے ضائع کیا تھا اور مسلمان جس مفہوم کی گہرائی تک نہ جاسکے۔ مغرب نے صنعتی انقلاب کے ابتداء میں جسے اٹھایا۔ چنانچہ تاریخ کے سمجھنے، قانون تاریخ سمجھنے کیلئے مختلف موضوعات میں ابحاث شروع ہوئیں۔ اسی بنیاد پر مثالی، مادی، متوسط اور دوسرے متعدد نظریات قائم ہوئے ہیں اور ہر ایک نے قانون تاریخ کے مفہوم کو اپنے نظر کے مطابق محدود کرنے کی کوشش کی ہے اور مادّی تاریخی (مارکسیزم) ان نظریات میں مشہور ہے اور اس کی گہرائی تک گیا ہے اور تاریخ میں اپنا بہت اثر چھوڑا ہے۔ پس درحقیقت بشر کی یہ تمام کوششیں قرآن کی اس تنبیہ کی استمرار میں اور قرآن کریم کی اپنی وہ بزرگی ہمیشہ کے لیے باقی رہے گی کہ پہلی دفعہ اس میدان میں اس فکر کو پیدا کیا اور معرفت بشری کے میدان میں اس حقیقت کو رکھا۔

روز چارشنبہ ۲۶ جمادالاول ۱۳۹۹ھ۔

درس پنجم

اعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم
وأفضل الصلوات علی سیدالأنبیاء والمرسلین وعلی الھداۃ المیامین من آلہ الطاھرین.

ہم نے گذشتہ پیش کردہ آیات کے ضمن میں قرآن میں قانون تاریخ کی فکر کو پیش کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ تاریخ کا بھی ایک قانون ہے۔اس گفتگو کی روشنی میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اب ہمارے لئے ممکن ہے کہ ان تین قسم کی آیات کے موازنہ اور تجزیہ وتحلیل کے بعد قانون تاریخ کیلئے مندرجہ ذیل حقائق کشف کریں:

۱۔اطراد

حقیقت اول: اطراد ہے یعنی سنت تاریخی ایک جاری وساری قانون ہے نہ کہ ہنگامی واتفاقیہ تعلقات۔ یہ رابطہ صُدفہ نصیب اور اتفاقیہ کی بنیاد پر قائم نہیں ہے بلکہ ایک معین طبیعی تعلقات کے تحت ہے اور یہ عام حالات میں جہاں طبعیت اور کائنات کے تمام قوانین کا جریان ہے وہاں بھی یہ تخلف ناپذیر ہے۔ درحقیقت قانون میں یہ اطراد کی طبعیت کا ہونا قانون تاریخ کے علمی ہونے پر تاکید کرتا ہے کیونکہ قانون علمی کا دوسرے تمام میدانوں سے جو فرق اور تمیز حاصل ہوتا ہے وہ اسی اطراد، تتابع (ایک کے پیچھے دوسرے کا آنا) اور تخلف ناپذیر ہونا ہے۔ یہاں سے ہے کہ قرآن کریم کا قانون تاریخ میں شیوع اور اطراد ہونے پر تاکید کرنے کے درمیان یہ ہدف رہا ہے کہ اس قانون کے علمی ہونے پر تاکید کریں اور ایک مسلمان انسان کے اندر تاریخی واقعات کے بارے میں شعور پیدا کریں اسے ایک بابصیرت بنائیں نہ کہ اتفاقی اور سب کے سامنے سر تسلیم خم ہونے

والا اور نہ ہی اسے عادی تصور کریں۔آیات ملاحظہ فرمائیں:

۱۔﴿**سنة اللّٰه فی الذین خلوا من قبل ولن تجدلسنة اللّٰه تبدیلاً**﴾ ''یہ خدائی سنت ان لوگوں کے بارے میں رہ چکی ہے جو گذر چکے ہیں اور خدائی سنت میں تبدیلی نہیں ہوسکتی'' (احزاب/۶۲)

۲۔﴿**سنة من قدارسلناقبلک من رسلنا ولا تجد لسنتنا تحویلا**﴾ ''یہ ہمارا دستور ہے جو ان تمام رسولوں کے ساتھ رہا ہے جنہیں ہم نے آپ سے پہلے بھیجا تھا اور آپ ہمارے دستور العمل میں کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے'' (اسراء/۷۷)

۳۔﴿**ولا مبدل لکلمٰت اللّٰه**﴾ ''اور اللہ کلمات تو کوئی بدل نہیں سکتا'' (انعام/۳۴)

یہ تین آیات صریح نص قرآنی ہیں ان آیات کا مفہوم یہ بتلاتا ہے کہ یہ قوانین بطور اطراد اور استمرار ہیں اور ان میں قانون تاریخ سے متعلق موضوعیت اور علمیت موجود ہے۔ ان آیات کریمہ کی نصوص اس سوچ کی نفی کرتی ہیں اگر کوئی یہ فکر کرے یا قوموں میں سے کوئی قوم یہ لالچ کرے کہ ان کو قانون تاریخ سے استثناء رکھا جائے تو ایسا نہیں ہوسکتا: ﴿**ام حسبتم ان تدخلوا الجنة ولمایاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم مسّتھم الباساء والضراء وزلزلوا حتیٰ یقول الرسول والذین اٰمنوا معة متیٰ نصر اللّٰه الآان نصر اللّٰه قریب**﴾ ''کیا تمھارا یہ خیال ہے کہ تم آسانی سے جنت میں داخل ہو جاؤ گے جب کہ ابھی تمھارے سامنے سابقہ امتوں کی مثال پیش نہیں آئی جنھیں فقر و فاقہ اور پریشانیوں نے گھیر لیا اور اتنے جھٹکے دیئے گئے کہ خود رسول اور ان کے ساتھیوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ آخر خدائی امداد کب آئے گی۔تو آگاہ ہو جاؤ کہ خدائی مدد بہت قریب ہے'' (بقرہ/۲۱۴) یہ آیت کریمہ ان لوگوں کی ذہنیت کی نفی کرتی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ قانون تاریخ میں استثناء ممکن ہے۔قرآنی روح ہمیں اس حقیقت پر تاکید کرتی ہے کہ یہاں کلیت و علمیت موجود ہے تا کہ انسان کی اس ذہنیت پر تربیت کرے اور اس کے اندر علمی فکر پیدا ہو

اور وہ اس دائرے میں رہتے ہوئے حوادث تاریخ کے ساتھ چل سکے۔

۲۔قانون تاریخ ربّانی ہے:۔

حقیقت دوم: دوسری حقیقت جس پر ان آیات کی نصوص نے تاکید کی ہے وہ قانون تاریخ کا ربانی ہونا ہے یعنی اس قانون تاریخ کی بازگشت خدائے متعال کی طرف ہے اور خدا سے متصل ہے جسے سنت اللہ یا کلمۃ اللہ کہا گیا ہے۔ یعنی تاریخ کے قوانین میں سے ہر قانون اللہ سبحانہ کا ایک کلمہ ہے اور یہ ربانی فیصلہ ہے۔ ان آیات کریمہ کا قانون تاریخ ربّانی ہونے اور اس کے ساتھ اس کے غیبی ہونے کو بیان کرنیکا ہدف یہ ہے کہ اس قانون کلی سے استفادہ کرتے وقت انسان کو خدا سے متصل کرے اور انسان کو یہ احساس دلائے کہ وہ کائنات کے مختلف میدانوں میں اس نظام کامل سے اور ان قوانین سے استفادہ کرتے وقت یہ نہ بھولے کہ ان میدانوں میں حاکم صرف خدا ہے اور اس سے دور نہ ہو کیونکہ ان قوانین کے درمیان خدا کی قدرت ہے اور یہ قانون خدا کے ارادے سے ہی چل رہے ہیں۔

قرآن کا وضع کردہ پہلو اور لاہوتی غیبی کا پہلو:۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ غیبی تصور اور رنگ جو قرآن نے تاریخ اور قانون تاریخ کو پہنایا ہے اس سے قرآن نے انسان کو تاریخ کے علمی پہلو کی تفسیر سے دور کیا ہے اور تاریخ کیلئے الٰہی تفسیر کے طرف متوجہ کیا ہے (یعنی جبر تاریخ) کہ جو لاہوتی فکر کی اکیڈمیوں کی پیش کردہ ہے یہ بہت سارے مسیحی، لاھوتی مفکرین کے ہاتھوں انجام پائی ہے کہ انھوں نے تاریخ کی الٰہی کی تفسیر کی تو پھر قرآنی یہ پہلو اس تفسیر الٰہی سے خلط ہوا ہے جس تفسیر الٰہی کی طرف مفکرین لاہوتی کرت اگستین وغیرہ نے توجہ دی ہے۔ پس کہا جاتا ہے: قانون تاریخ پر یہ غیبی شکل چھائی ہوئی ہے تو اس وقت یہ قانون تاریخ کا مسئلہ ایک غیبی اور عقیدہ کا مسئلہ بن جاتا ہے اور تاریخ کو ایک علمی موضوع ہونے سے دور کرتا ہے لیکن حقیقت یہ

ہے کہ یہاں قرآنی پہلو اور قرآن کا تاریخ کو عالم غیب سے ربط دینے اور عالم غیبی کا قانون تاریخ پر چھا جانے کا تاریخ کے الٰھی تفسیر جسے لاھوت نے بتایا ہے ان دونوں کے درمیان بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔ ان دونوں میں بنیادی فرق کا خلاصہ یہ ہے: کہ قانون تاریخ کے بارے میں لاہوتی نظریہ میں واقعہ اور حوادث کو صرف خدا سے مربوط کرتے ہیں اور اس کے دیگر حوادث سے رابطہ کو ختم کرتے ہیں۔ پس وہ خدا سے ربط ہونے کو بتاتے ہیں اور اس کو اس واقعہ کے دوسرے واقعات سے ربط کا بدل قرار دیتے ہیں۔خدا سے اس ربط کو ان تمام تعلقات اور ارتباطات کا بدیل بتاتے ہیں جو کہ قانون تاریخ میں بھرا ہوا ہے اور اس میدان قوانین کی جتنی مثالیں ہیں ان سے جدا کرتے ہیں جبکہ قرآن نے جو نظریہ دیا ہے اس میں واقعہ پر صرف غیبی رنگ ڈالنے پر ہی انحصار نہیں کیا ہے۔تا کہ حادثہ کو تاریخ کے سیاق وسباق سے باہر نکال کر اسے سیدھا آسمان سے مربوط کریں۔

قرآن یہ نہیں کہتا کہ واقعہ کا آسمان سے رابطہ ہونا اس کے قانون تاریخ کے ارتباطات تعلقات اور اسباب ومسببات سے رابطہ ہونے کے بدل میں ہے بلکہ قرآن کریم قانون تاریخ کو خدا سے ربط دیتا ہے سب سے اعلی اور ارفع قسم کے تعلقات اور ارتباطات کے ذریعے خدا سے ربط دیتا ہے۔ قرآن کریم سے اقرار کرتا ہے اور اس پر اس کا ایمان ہے کہ تاریخی حوادث کے درمیان روابط اور تعلقات پائے جاتے ہیں۔لیکن بات یہ ہے کہ تاریخی واقعات میں یہ روابط اور تعلقات حقیقت میں اللہ سبحانہ کی حکمت اور اس کے اچھے فیصلے اور قانون تاریخ ان تعلقات کا تکوینی بنا پر خلق کرنے کی وجہ سے ہے۔

جب ہم چاہیں گے کہ طبیعت سے ایک مثال کی مدد لے لیں تا کہ ان دونوں موقفوں کے درمیان فرق واضح ہو تو ہم یہ مثال پیش کریں گے۔

ایک انسان بارش کی تفسیر کرتا ہے جو طبیعی ہے۔ کہتا ہے کہ بارش ارادۂ خدا سے نازل ہوئی ہے اور اس وقت وہ اس ارادہ کو طبیعت کے ان اسباب وعلل کا بدل قرار دیتے ہیں جو بارش ہونے کا سبب بنے ہیں۔گویا بارش ایک حادثہ ہے اور اس کا کسی چیز سے کوئی

ربط یا نسبت نہیں ہے بلکہ ایک منفرد حادثہ ہے جو حوادث کی لہروں سے دور مستقیماً خدا سبحانہ سے مربوط ہے۔ اس قسم کی بات بارش کے تفسیر علمی سے متعارض ہے لیکن کوئی یہ بتائے کہ بارش کیلئے اس کے کچھ اسباب و روابط ہیں۔ اور یہ پانی کے اس طبیعی چکر سے مربوط ہے مثلاً پانی جب بخارات میں تبدیل ہوتا ہے تو گیس بنتی ہے اور یہ گیس اوپر اٹھتی ہے جا کر بادل بنتی ہے اور جب درجہ حرارت گر جاتا ہے تو یہ بادل مائع بن کر بارش میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ یہاں پانی اور بارش میں چند اسباب و مسببات کا تسلسل ہے۔ مگر یہ محکم تسلسل اسباب، طبیعت میں مخلوط یہ تعلقات خدا کی حکمت تدبیر اور بہتر نگہداری کی تعبیر ہے۔ ایسی بات بارش کے علمی اور موضوعی تفسیر سے متعارض اور متصادم نہیں کیونکہ ہم نے اس قانون کو خدا سے مربوط کیا ہے اور ہم نے اس حادثہ کو دیگر اثر انداز ہونے والے عوامل سے جدا کر کے خدا سے ربط نہیں دیا ہے اور نہ ہی ہم نے اس کے اور اس کے اسباب و علل کے درمیان موجود رابطہ کو ختم کیا ہے۔

پس قرآن جب قانون تاریخ پر رنگ الٰہی اور صبغۃ اللہ لگاتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ تاریخ میں صرف الٰہی تفسیر کا پہلو ہو بلکہ قرآن یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ یہ قانون تاریخ قدرت خدا سے خارج نہیں ہے بلکہ یہ قدرت خدا کا تحقق اور تجسم ہے۔ پس اسی دنیا میں خدا کے کلمات، خدا کے قانون، حکمت اور مشیت ہیں تا کہ انسان ہمیشہ خدا سے مربوط رہے اور علم و ایمان کو محکم طریقے سے جوڑے رکھے۔ پس انسان جس وقت اس قانون کو علمی نظر سے دیکھتا ہے تو اسی وقت ایمانی نظر سے بھی دیکھتا ہے۔

قرآن کریم نے قانون تاریخ کو کلیت دینے اور اس کا صدفہ سے عدم تعلق بنانے کیلئے بہت زیادہ اہتمام کیا ہے۔ لہٰذا خود وہ غیبی عملیات کہ جو قانون تاریخ کے بہت سے حالات میں پائے جاتے ہیں اور وہ غیبی امداد کہ جس کا میں ذکر ہوا ہے قرآن کریم اس امداد کو بھی قانون تاریخ سے مشروط گردانتا ہے۔ یہ قانون تاریخ سے مربوط ہے اس سے جدا نہیں۔ غلط بات ہوگی اگر ہم یہ بتا دیں کہ قرآن کا یہ پیغام تاریخ کی غیب کی بنیاد پر تفسیر

ہے (یعنی تفسیر لاہوتی) بلکہ قرآن کا یہ پیغام تاریخ کی تفسیر ہے منطق، عقل اور علم کی بنیاد پر حتیٰ کہ وہ الٰہی امداد جس کو نص قرآنی بیان کر رہا ہے وہ قانون تاریخ سے مربوط ہے۔

گذشتہ بیان میں ہم نے مدد اور کامیابی کے قانون تاریخ کے بارے میں اس آیت کو پڑھا:
﴿**ام حسبتم ان تدخلوا الجنة ولما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم مسّتھم الباساۤء والضرآء وزلزلوا حتّٰی یقول الرسول والذین اٰمنوا معة متٰی نصر اللّٰه الآان نصر اللّٰه قریب**﴾ ”کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ بہشت میں پہنچ جاؤ گے حالانکہ ابھی تک تمھیں اگلے زمانہ والوں کی سی حالت نہیں پیش آئی کہ انہیں طرح طرح کی تکلیفوں (فاقہ نہ محتاجی) اور بیماری نے گھیر لیا تھا اور زلزلے میں اسقدر جھنجوڑے گئے کہ آخر پیغمبر اور ایمان والے جوان کے ساتھ تھے کہنے لگے کہ خدا کی مدد کب آئے گی۔ دیکھو خدا کی مدد یقیناً بہت قریب ہے“ (بقرہ/۲۱۴)

آئیں اب ہم ان آیات کو پڑھیں جن میں امداد غیبی کی بات ہوئی ہے تا کہ یہ معلوم کر سکیں کہ یہ آیات جن میں امداد غیبی کی بات ہوئی ہے وہ خود ان قوانین سے کیسے ربط رکھتی ہیں:
﴿**اذتقول للمؤمنین الن یکفیکم ان یمدکم ربکم بثلٰثةِ اٰلافٍ من الملٰٓئکة منزلین. بلٰی ان تصبروا وتتقوا ویاتوکم من فورھم ھٰذا یمددکم ربکم بخمسة اٰلافٍ من الملٰٓئکة مسومین. وماجعله اللّٰه الابشرٰی لکم ولتطمئن قلوبکم به وماالنصر الامن عنداللّٰه العزیز الحکیم**﴾ ”جب آپ مومنین سے کہہ رہے تھے: کیا تمہارے لئے کافی نہیں ہے کہ تمہارے پروردگار نے تین ہزار فرشتے نازل فرما کر تمہاری مدد کی؟۔ ہاں اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو دشمن جب بھی تم پر اچانک حملہ کر دے تمہارا رب اسی وقت پانچ ہزار نشان زدہ فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔ اور یہ بات اللہ نے صرف تمہاری خوشی اور اطمینان قلب کے لئے کی ہے اور فتح و نصرت صرف اللہ ہی کی جانب سے ہے جو بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے“ (آل عمران/۱۲۴ تا ۱۲۶)

یہاں الٰہی اور غیبی امداد ہے لیکن قانون تاریخ سے مشروط ہے اس جملہ کے ساتھ: "بلیٰ ان تصبروا وتتقوا" یعنی نصرت الٰہی مسلمانوں کو اس وقت ملی جب انہوں نے صبر کی اور تقویٰ اختیار کیا۔ یہاں پر قانون تاریخ کے شرائط کو اجمالاً بیان کیا ہے کہ جو دوسری آیات میں تفصیلاً بیان ہوئے تھے یہ امداد غیبی بھی قانون تاریخ سے مربوط ہے:

﴿اذتستغیثون ربّکم فاستجاب لکم انّی ممدّکم بالفٍ مّن الملٰئکة مردفین. وماجعله اللّٰه الابشریٰ ولتطمئنّ به قلوبکم وماالنّصر الّامن عنداللّٰه انّ اللّٰه عزیزٌ حکیمٌ﴾ "(یاد کرو) جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمہاری سن لی اور فرمایا: میں یکے بعد دیگرے آنے والے ایک ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کروں گا۔ اور اس مدد کو اللہ نے بس تمہارے لئے بشارت اور اطمینان قلب کا باعث بنایا اور (یہ باور کرایا کہ) نصرت تو صرف اللہ کی جانب سے ہے بے شک اللہ بڑا غالب آنے والا، حکمت والا ہے" (انفال/۹،۱۰)

پس یہ واضح ہے کہ الٰہی رنگ پر تفسیر موضوعی (قانون تاریخ) کا بدیل نہیں بلکہ یہ الٰہی رنگ تفسیر موضوعی کو خدا سے مربوط کرنے کیلئے ہے تا کہ انسان مسلمان کی تربیت میں اسلام کا پہلو علم وایمان میں وحدانیت اپنے کمال کو پہنچے۔

پس رنگ الٰہی کی تفسیر اس تفسیر موضوعی وعلمی کا متبادل نہیں بلکہ اس سے مربوط ہے یعنی کوشش کی گئی ہے کہ علم وایمان میں وحدانیت دکھائی جائے تا کہ مرد مسلمان کی تربیت ہو سکے۔

۳۔انسان کا مختار ہونا اور اس کا قانون تاریخ میں کردار: ۔

تیسری حقیقت: جس کی گذشتہ آیات کے میں تاکید ہوئی ہے وہ یہ کہ انسان کا اختیار وارادہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ قرآن نے قانون تاریخ پیش کرتے وقت بہت اہتمام کے ساتھ انسان کے ارادہ واختیار کو بھی ایک حقیقت کے طور پر پیش کیا ہے۔ انشاء اللہ دو ابحاث کے بعد پڑھیں گے کہ قانون تاریخ میں بحث وگفتگو کے دوران ایک وہم

پیدا ہوئی ہے اس وہم کا خلاصہ یہ ہے کہ بہت سے مفکرین کے نزدیک اس بحث میں جان ڈالی ہے کہ انسان کی آزادی واختیار اور قانون تاریخ کے درمیان ایک تضاد وتعارض پایا جاتا ہے یعنی یا ہم یہ بتائیں کہ تاریخ کیلئے قوانین اور طریقے ہیں تو اس بات سے ہم انسان سے اس کے ارادہ ،اختیار اور آزادی سلب کر دیں گے، یا ہم یہ قبول کریں کہ انسان آزاد خود مختار اور صاحب ارادہ ہے تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ ہم تاریخ کے قوانین اور طریقوں کو ملغیٰ اور باطل کریں اور یہ کہیں کہ یہ میدان (تاریخ) قانون سے خالی ہے جبکہ کائنات کے دوسرے میدانوں میں قوانین ہیں۔

یہ وہ تعارض اور تضاد کا دھم ہے کہ جو قانون تاریخ اور انسان کے مختار اور آزاد ہونے کے فکر کے درمیان پایا جاتا ہے۔ لہٰذا قرآن کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ اس تضاد کو رفع کرے اور خود اس کا حل بتائے لہٰذا خداوند عالم نے اس موضوع پر تاکید کی ہے کہ واقعات و حوادث کے تسلسل میں محور ومرکز ارادہ انسانی ہے۔ ہم انشاء اللہ دو دروس کے بعد قانون تاریخ اور ارادۂ انسانی میں وحدت وہم آہنگی کے فنی طریقہ کو پیش کریں گے اور جن صحیفوں کے درمیان ممکن ہے قانون تاریخ ذکر ہوا ان صحیفوں کی جستجو کریں گے اور اس سخن میں بھی بتایا جائے گا کہ کس طرح قرآن ان دونوں کو متحد کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ اِن سب کے بارے میں ہم دو دروس کے بعد بحث کریں گے لیکن ابھی ان آیات کریمہ کو ملاحظہ کرنے پر اکتفاء کریں گے:

۱۔**﴿ان اللّٰه لایغیر مابقومٍ حتیٰ یغیروا مابانفسهم﴾** "بے شک خدا کسی قوم کے حالات کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے کو تبدیل نہ کرے" (رعد/۱۱)

۲۔**﴿وان لو استقاموا علیٰ الطریقة لاسقینٰهم مآئً غدقاً﴾** "اور اگر یہ لوگ سب ہدایت کے راستے پر ہوتے تو ہم انہیں وافر پانی سے سیراب کرتے" (جن/۱۶)

۳۔**﴿وتلک القریٰ اهلکنٰهم لماظلموا وجعلنا لمهلکهم موعدًا﴾** "اور آپ کا پروردگار بڑا بخشنے والا، رحمت کا مالک ہے اگر وہ ان کے حرکات پر انہیں

گرفت میں لینا چاہتا تو انہیں جلد ہی عذاب دے دیتا لیکن ان کے وعدے کا وقت مقرر ہے'' (کہف/ ۵۹)

دیکھیں کہ قانون تاریخ ہوا میں چلنے والی نہیں ہے بلکہ یہ انسان کے ہاتھ میں ہے جیسا کہ فرمایا کہ خداوند کریم کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے یا یہ کہا کہ یہ لوگ اگر ہمارے بتائے ہوئے راستے پر عمل کرتے تو ہم انہیں ایک فرواں پانی سے سیراب کرتے۔ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ یہاں انسان کا ایک کردار موجود ہے جو اس کے ارادہ، اختیار وعزم کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ کردار کبھی قانون تاریخ کے تعلقات کے ضمن میں عیاں ہوتا ہے اور کبھی قانون تاریخ کے مناسب جزئیات سے ظاہر ہوتا ہے اور کبھی مناسب معلول سے ظاہر ہوتا ہے۔ پس انسانی ارادہ کو قانون تاریخ میں ایک بلند مقام حاصل ہے اور اس میں انسانی پہلو موجود ہے۔ چونکہ تاریخ انسانی کردار سے خالی نہیں ہے اور نہ ہی اس میں انسان کا ارادہ، آزادی اور اختیار معطل ہے بلکہ ان واقعات میں انسان کی مسئولیت کی زیادہ سے زیادہ تاکید کی گئی ہے۔

میدان تاریخ میدان قوانین:۔

اب جب ہم نے قرآنی رو سے قانون تاریخ کے تین خصوصیات بیان کئے ہیں ہمیں اس سوال کا سامنا ہے: قانون تاریخ کا میدان کونسا ہے؟

ابھی تک ہم یہ بات کر رہے تھے کہ قانون تاریخ کا ایک میدان ہے لیکن یہ کونسا میدان ہے یہ نہیں بتایا آیا تاریخ کا میدان اپنے طول میں قانون تاریخ کا میدان ہے، میدان تاریخ کا ایک حصہ ہے یعنی قانون تاریخ کے لئے اس اعتبار سے کہ یہ ایک قسم کے اصول کے قوانین ہے اس کا میدان دوسرے قوانین کے میدانوں سے مختلف ہے جیسے فیزکس، بیالوجی، فلکیات اور علم الاعضاء کے قوانین کے میدان یہ میدان کہ جو ایک قسم کے اصول کے قوانین کے لئے ہے دوسروں سے مختلف ہے کیا یہ میدان (قانون تاریخ) پورے میدان تاریخ پر محیط ہیں؟ یا یہ میدان تاریخ کے صرف ایک حصہ میں ہے؟

لیکن اس سے پہلے ضروری ہے ہم یہ سمجھیں کہ میدان تاریخ سے ہماری کیا مراد ہے؟ میدان تاریخ سے مراد یہ ہے کہ تاریخ میں جو حوادث پیش آتے ہیں اور مورخین اور اصحاب تاریخ جو واقعات اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں یہی میدان تاریخ ہے۔ مؤرخین سے مراد وہ گروہ ہیں جو حوادث اور واقعات کو اپنی کتابوں میں ثبت وضبط کرتے ہیں اور وہ میدان جس میں یہ حوادث جمع ہوئے ہیں کہ جن کو مؤرخوں نے اہمیت دی ہے اور اپنی کتابوں میں لکھا ہے یہی میدان تاریخ ہے لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تمام حوادث اور واقعات جنہیں مؤرخین نے تاریخ سے ربط دیا ہے اور اپنی تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے آیا ان سب پر قانون تاریخ کا حکم نافذ ہوگا۔ وہ قانون تاریخ کہ جس کے اپنے اصول وضوابط ہیں جو کائنات اور طبیعت کے دوسرے قوانین سے مختلف ہیں یا ایسا نہیں بلکہ ان حوادث وواقعات میں سے کچھ پر قانون تاریخ کا حکم اطلاق ہوگا؟

اصل حقیقت یہ ہے کہ قانون تاریخ، تاریخ کے معین حوادث و واقعات پر ہی اطلاق ہوتا ہے اور بہت سے حوادث پر قانون تاریخ اطلاق نہیں ہوتا بلکہ ان پر دیگر قوانین مثلا فزیکی، علم الاعضاء کے قوانین یا زندگی کے دوسرے قوانین یا کائنات کے مختلف میدانوں کے قوانین میں سے کوئی قانون اطلاق ہوتا ہیں۔

مثال کے طور پر حضرت ابو طالبؑ نے اور ام المومنین حضرت خدیجہؑ نے ایک معین سال میں وفات پائی۔ یہ دونوں واقعات تاریخی ہیں اور اہمیت کے حامل ہیں اور ماہرین تاریخ انھیں ضبط تحریر میں لائے ہیں، یہ ایک ایسا واقعہ ہے کہ جس کے تاریخ میں مختلف پہلو ہیں اور ان سے تاریخ میں بہت سارے اثرات مرتب ہوئے ہیں لیکن یہ قانون تاریخ نہیں بلکہ اس پر قانون اعضاء وجوارح اطلاق ہوتا ہے۔ قانون بیالوجی میں آتا ہے کہ جس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ حضرت ابو طالبؑ اور حضرت خدیجہؑ نے اس معین وقت میں وفات پائی ہے لیکن ۔ یہ واقعہ مؤرخین کے اصطلاح میں شامل ہے۔ لیکن جو چیز اس واقعہ پر حکم فرما ہے وہ قانون علم الاعضاء ہے۔ حضرت ابوطالبؑ اور حضرت خدیجہؑ کے جسم کے

اعتبار سے ،اس پر قانون بیالوجی حکم فرما ہوگا جس میں فرض کیا جائے گا کہ ان پر مرض لاحق ہوا تھا یا بڑھاپا غالب آیا تھا تو یہ دو قانون اپنے معین شرائط اور حالات کے ضمن میں اس پر حکم فرما ہونگے۔

دوسری مثال، خلیفہ عثمان بن عفان کی حیات، طول عمر ایک تاریخی واقعہ ہے۔ انکی عمر تقریبا ۸۰ سال تھی۔ طبیعی بات ہے کہ اس تاریخی واقعہ کیلئے تاریخ اسلام میں بہت سے اثرات ہیں اگر یہ خلیفہ انقلاب سے پہلے اپنی طبعی موت سے یعنی علم الاعضاء کے قوانین کے مطابق وفات پاتے تو ممکن تھا کہ تاریخ کا رخ بدل جاتا یعنی تاریخ میں بہت سا حصہ جو رونما ہوا ہے وہ نہ ہوتا۔ مثلاً امیر المومنینؑ بغیر کسی شورش و اختلاف کے خلیفہ بن جاتے لیکن علم الاعضاء کے تحت عثمان بن عفان کے جسم میں یہ اقتضاء تھی کہ مسلمانوں کے اس انقلاب کے نتیجہ میں انقلابیوں کے ہاتھوں قتل ہونے تک باقی رہے۔ یہ تاریخی حادثہ ہے یعنی مورخین کی توجہ کا مرکز بنا ہے اور اس میں تاریخی پہلو بھی ہے۔ اس قسم کے واقعات نے تاریخ میں حوادث زمانہ کو دگرگوں کرنے میں منفی اور مثبت کردار ادا کیا ہے۔ لیکن اس پر قوانین تاریخا طلاق نہیں ہوتے بلکہ قانون حیات و قانون بیالوجیا طلاق ہوتے ہیں۔ قانون حیات نے حضرت عثمان کو ۸۰ سال کی طبعی عمر گزارنے کا موقع دیا لیکن اس کے دوران انہوں نے جو کردار اور اجتماع میں جو تصرفات کیے ان پر قانون تاریخ اطلاق ہوتا ہے لیکن طول عمر ایک الگ مسئلہ ہے جس پر قانون تاریخ نہیں بلکہ قانون بیالوجی علم الاعضاء یا قانون فیزکس اطلاق ہوتے ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ قانون تاریخ تمام میدان تاریخ میں اطلاق نہیں ہوتا جیسے طبری نے جو کچھ لکھا ہے ان سب پر قانون تاریخ اطلاق نہیں ہے بلکہ اس کے کچھ حصہ پر قانون تاریخ اطلاق ہوتا ہے اس پر ہم انشاء اللہ بعد میں گفتگو کریں گے۔

روز سہ شنبہ ۳ جمادالثانی ۱۳۹۹ھ۔

درس ششم

اعوذ باللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

وأفضل الصلوات علی سیدالخلق محمدوعلی الهداة المیامین من آله الطاهرين.

ظواہر تاریخ کی خصوصیات

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا کہ میدان تاریخ مورخین کے اہتمام اور ان کے ہاں اہمیت کا حامل ہے۔ قوانین تاریخ تمام میدان تاریخ میں نافذ نہیں ہوتے چونکہ میدان تاریخ کائناتی، طبیعی، فیزکی، بیالوجی اور علم الاعضاء کے ظواہر پر مشتمل ہوتا ہے ان ظواہر پر عام طور پر خود ان کے قوانین حکم فرما ہوتے ہیں۔ ان ظواہر میں سے بعض تاریخی نگاہ سے اہمیت کے حامل ہوتے ہیں مؤرخین کے نظر میں حوادث اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان مظاہر کیلئے ایک خاص مدت ہے اور یہ حوادث تاریخ کے لہروں پر ہے لیکن اس کے باوجود ان پر قانون تاریخ کا حکم نافذ نہیں ہوتا بلکہ ان پر اپنا خاص حکم نافذ ہوتا ہے۔ قانون تاریخ میدان تاریخ کے ایک معین حصہ پر نافذ ہوتا ہے اور میدان تاریخ کا وہ حصہ جہاں قانون تاریخ نافذ ہوتا ہے وہ ایک خاص ظواہر پر مشتمل ہوتا ہے جو کائناتی اور طبیعی باقی ظواہر سے ایک خاص قسم کا امتیاز رکھتا ہے اور اسی قسم کے امتیاز کی وجہ سے خاص قوانین کا مستحق ہے جو کائنات کے باقی میدانوں کے قوانین سے ایک خاص قسم کا امتیاز رکھتا ہے

حوادث کا ہدف سے ربط:

وہ حوادث جو قوانین تاریخ میں داخل ہیں ان کے ایک عمومی امتیاز ہے اور وہ یہ ہے کہ ان حوادث میں جدید رابطہ پایا جاتا ہے جو کائناتی طبیعی اور بشری دوسرے حوادث

میں پایانہیں جاتا، تمام طبیعی اور کائناتی حوادث سبب سے ایک قسم کا ربط رکھتے ہیں، مسبب ہوتے ہیں کسی سبب کا، نتیجہ ہوتے ہیں کسی مقدمات کا، یہ رابطہ تمام کائناتی اور طبیعی حوادث میں پائے جاتے ہیں پانی کا اُبلنا ایک طبیعی حادثہ ہے کہ جو مخصوص حالت سے مربوط ہے، معین درجہ حرارت سے مربوط ہے اس پانی کا آگ سے نزدیک ہونے سے مربوط ہے یہ ارتباط مسبب اور سبب کا ارتباط ہے۔ یہاں پر یہ رابطہ مسبب سے سبب کا رابطہ ہے، ماضی سے حال کا رابطہ ہے، قطعی حالات سے رابطہ ہے۔

لیکن یہاں پر میدان تاریخ میں کچھ حوادث ایسے بھی ہیں کہ جن میں ایک اور قسم کا رابطہ پایا جاتا ہے اور وہ حوادث کا ہدف سے رابطہ ہے۔ سرگرمی کا غایت سے رابطہ ہے یا فلاسفہ کے زبان میں علت غائی ہے جو کہ علت فاعلی سے مختلف ہے۔ یہ رابطہ ایک جدید اور ممتاز رابطہ ہے۔ حرارت سے پانی کا اُبلنا سبب سے رابطہ کی وجہ سے ہے۔ اپنے ماضی سے رابطہ ہے۔ لیکن غایت اور ہدف سے رابطہ نہیں ہوگا جب تک وہ ایک فعل انسانی میں بدل نہ جائے، بشری کوشش نہ بنے۔ جبکہ انسانی باہدف عمل نہ تنہا سبب سے اور نہ تنہا ماضی سے بلکہ یہ غایت سے مربوط ہے جو اس عمل کے انجام کے وقت موجود نہیں ہوتا ہے اور اس غایت کے وجود کا وہ انتظار کر رہا ہوتا ہے۔ یہاں فعل کا تعلق ماضی سے نہیں بلکہ مستقبل سے ہے۔ غایت عمل کی نسبت میں ہمیشہ مستقبل میں ہوتا ہے جبکہ سبب اس فعل کی نسبت ماضی سے مربوط ہوتا ہے۔

پس وہ رابطہ کہ جس سے عمل تاریخی کی پہچان ہوتی ہے وہ عمل کہ جس پر قانون تاریخ کا حکم نافذ ہوگا وہ ہدف والا کام ہے، وہ عمل ہے جو علت غائی سے مربوط ہو۔ اس میں کوئی فرق نہیں کہ وہ ہدف صالح ہو یا طالح، پاک ہو یا ناپاک بہرحال یہ ہدف والا عمل ہے۔ یہ تاریخی سرگرمی ہوگا۔ اسی بنیاد پر یہ قانون تاریخ میں شامل ہوگا اور یہ غایات کہ جن سے یہ باہدف عمل مربوط ہے یہ غایات چونکہ عمل کی نسبت استقبالی ہے لہٰذا اپنے وجود ذہنی کے ضمن میں بغیر کسی شک کے عامل پر مؤثر ہوتے ہیں۔ چونکہ یہ غایات اپنے وجود خارجی

اور وجود واقعی میں مستقبل کی طرف ہوتے ہیں یہ ایسی موجود نہیں ہے جس کا وجود حقیقی ہو بلکہ اپنے وجود ذہنی کے ضمن میں فاعل پر مؤثر ہوتا ہے۔

پس مستقبل یا ہدف کہ جو تاریخی سرگرمی کیلئے غایت کی تشکیل ہے یہی ہدف اس سرگرمی کو حرکت دینے میں مؤثر ہے اور یہی اس عمل کو وجود ذہنی سے وجود خارجی میں لانے کا کردار ادا کرتی ہے۔ یہ عمل فکر سے نکلا ہے۔ وہ فکر جو اس مقصد کیلئے ذہن کے اندر موجود تھی لیکن وہ خاص شرائط وصفات کے اندر اسے وجود میں لانے میں مؤثر ہے۔ پس یہ ہدف اس سرگرمی کو ایجاد کرنے میں مؤثر ہے۔ لہٰذا ہم نے میدان تاریخ میں تاریخی عمل کیلئے ایک خاص یہ امتیاز حاصل کی یہ وہ امتیاز ہے جو دیگر حوادث کے مختلف میدانوں میں نہیں ہوتے۔ یہ امتیاز فعل کی ایک غایت اور سرگرمی کا ہدف سے تعلق رکھنے سے پیدا ہوتی ہے اور فلاسفہ اسے علت غائی کا ظہور کہتے ہیں۔ یہ فعل ہمیشہ مستقبل سے وابستہ ہوتا ہے۔ مستقبل ہی اس فعل کو وجود ذہنی سے نکالنے کا محرک بنتا ہے۔ اسی نے ہی فاعل کو غایت کی نشاندہی کی ہے۔

یہاں سے واضح ہوا کہ حقیقت میں قانون تاریخ کی نوعیت اور اس کا دائرہ کار جہاں یہ نافذ ہوتا ہے یہی عمل ہے میدان تاریخ میں قانون تاریخ کا حصہ ہے۔ یہی جزء ہے کہ جس میں عمل غایت کی طرف جاتا ہے حوادث طبیعی میں جو روابط موجود ہیں ان کی نسبت اس عمل میں ایک اضافی رابطہ ہے اور یہ رابطہ غایت، ہدف سے رابطہ ہے، علت غائی سے رابطہ ہے۔

فعل کا اجتماع سے تعلق

ضروری ہے کہ ہم یہاں یہ بھی جان لیں کہ ہر غایت اور ہدف والا عمل تاریخی نہیں ہوسکتا، قانون تاریخ میں داخل نہیں ہوسکتا۔ مثلاً مرنا، مریض ہونا، حادثہ ہونا وغیرہ ایک عمل ہیں لیکن غایت نہیں رکھتے اگرچہ یہ عمل تاریخی بھی ہیں۔ وہ عمل جس پر قانون تاریخ نافذ ہوتا ہے اس میں تین پہلو کا ہونا ضروری ہے تاکہ یہ عمل تاریخی ہوجائے یا اس پر قانون تاریخ نافذ ہوسکے۔ اول پہلو فاعل ہے (یعنی سبب) اور دوسرا پہلو غایت (ہدف) ہے۔ ان کے علاوہ ایک تیسرا پہلو ہونا چاہئے تاکہ اسے قانون تاریخ

کے اندر لائے۔ وہ یہ ہے کہ یہ عمل اپنے دائرہ سے تجاوز کر کے یعنی عامل سے نکل کر اجتماع تک جائے اس عمل میں ایک موج ہو جو فاعل سے تجاوز کرے اور اس کا دائرہ اجتماع بن جائے کہ جس اجتماع کا یہ فاعل ایک جزء ہے۔

ان امواج اور لہروں کے مختلف درجات ہیں جن میں سے بعض محدود ہوتے ہیں اور بعض طویل۔ لیکن کوئی عمل اس وقت تک تاریخی عمل نہیں بنتا جب تک وہ فرد کے حدود سے تجاوز نہ کرے مثلا بھوک کی صورت میں وہ فرد کھانا کھاتا ہے، پیاس کی صورت میں پانی پیتا ہے، تھکاوٹ کی صورت میں آرام کرتا ہے اگرچہ عام طور پر یہ اعمال باہدف بھی ہیں غایات تک پہنچنا چاہتی ہیں لیکن ایسے اعمال ہیں جن کی موجیں عامل سے تجاوز نہیں کرتیں۔ لیکن اس کے برعکس ایک عمل ہے جسے یہ انسان اجتماع کی سرگرمی کیلئے بجالاتا ہے اجتماع کے افراد کے باہمی تعلقات بڑھانے کے لئے انجام دیتا ہے مثلاً ایک تاجر کا عمل تجارت، ایک فوجی کا جنگی عمل، ایک سیاستدان کا سیاسی عمل یا ایک مفکر کا فکری بنیاد پر کام کرنا۔ ان تمام اعمال کی ایک موج ہے جو عامل سے تجاوز کرتی ہے۔ یہ موج اجتماع سے اپنے لئے زمینہ فراہم کرتی ہے۔ یہاں ہم فلاسفہ کی ایک اصطلاح سے مدد لیں گے: فلاسفہ کی اصطلاح میں سے ہم ارسطو کے قول کو لیں گے جس میں علت فاعلی، غائی اور علت مادی کے درمیان فرق بیان ہوا ہے ہم اپنی اس فکر کی توضیح کیلئے ان اصطلاحوں سے مدد لیں گے۔: اجتماع اس عمل کیلئے علت مادی ہے، اس عمل کیلئے زمینہ ہموار کرتی ہے ایسے حالات میں یہ عمل (کام) تاریخی عمل ہوگا اور اجتماع کا عمل کہنے کا مستحق ہوگا یہ اجتماع کا عمل ہے اگرچہ اس عمل کو انجام دینے والا پورے اجتماع میں کبھی ایک فرد سے زیادہ نہیں ہوسکتا یا یہ عمل ایک کمیٹی یا ایک گروہ کا ہو لیکن بنیاد وہی ہے کہ موج کے اعتبار سے عمل اجتماعی ہوتا ہے۔

پس واضح ہوا کہ عمل تاریخ پر قانون تاریخ اطلاق ہونے کیلئے فعل کا ہدف اور غایت سے تعلق ہونے کے ساتھ ساتھ فعل کا فردی حدود سے متجاوز ہونا بھی ضروری ہے۔ وہ فعل موج رکھتا ہو اور یہ موج اجتماع سے علت مادی حاصل کرتی چنانچہ ہو اس صورت میں یہ عمل اجتماعی ہوگا۔

اجتماعی اور فردی عمل میں فرق:۔

قرآن کریم نے فردی اور اجتماعی عمل میں ایک فرق بیان کیا ہے۔ ہم اس کا جائزہ آیات کریمہ سے لیں گے۔ قرآن کریم جس میں غائب کے اعداد وشمار جمع ہونے کا ذکر کرتے ہیں تو کبھی ذکر ملتا ہے کہ فردی کتاب ہے، کبھی ذکر ملتا ہے کہ امت کی کتاب ہے یعنی یہ ایک کتاب ہے جس میں فرد کے اعمال کے اعداد وشمار موجود ہیں اور ایک کتاب ہے جس میں امت کے اعمال کے اعداد وشمار کو بھی بیان کیا ہے۔ اور یہ بہت دقیق فرق ہے عمل فرد (کہ جو فرد سے منسوب ہو) اور عمل امت (یعنی وہ عمل جس میں تین پہلو بتایا جاتا ہو) کے درمیان، وہ عمل جس کے تین بُعد ہوں تو وہ دونوں کتابوں (فرد اور اجتماع) میں داخل ہوگی دو بُعد کے اعتبار سے کتاب فرد میں داخل ہوگی اور اس کا حساب فرد سے ہوگا اور تیسرے پہلو کے اعتبار سے کتاب امت میں داخل ہوگا اور امت کے سامنے لایا جائے گا اور امت سے اس بنیاد پر حساب ہوگا۔ خدا سبحانہ تعالیٰ کا قول ملاحظہ ہو:

﴿وترىٰ كل امةٍ جاثيةً كل امةٍ تدعىٰ الىٰ كتٰبها اليوم تجزون ما كنتم تعملون. هٰذا كتٰبنا ينطق عليكم بالحقّ انا كنا نستنسخُ ما كنتم تعملون﴾ "اور آپ ہر امت کو گھٹنوں کے بل گرا ہوا دیکھیں گے اور ہر ایک امت اپنے نامہ اعمال کی طرف بلائی جائے گی۔ آج تمھیں ان اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔ یہ ہماری کتاب ہے جو حق کے ساتھ بولتی ہے اور ہم اس میں تمہارے اعمال کو برابر لکھوا رہتے تھے" (جاثیہ/ ۲۸، ۲۹)

یہاں قرآن نے کتاب امت کا ذکر کیا ہے اُمت جو رب کے حضور غمزدہ کھڑی

ہے اسے اس کی کتاب پیش کی جائے گی، اسے اپنے سرگرمیوں کا کاپی دیا جائے گا ان کی زندگی اس کے سامنے لایا جائے گا جو اجتماعی طور پر گزرے ہیں اس کتاب کا محتوی تین پہلو والے باہدف عمل پر مشتمل ہوگا اور یہ کتاب ایسا ہوگا ﴿ **انا کنا نستنسخ ما کنتم تعملون** ﴾ یہ کتاب کتاب تاریخ طبری نہیں ایسی کاپی نہیں جس میں طبیعت کے واقعات لکھے ہوئے ہوں بیالوجی، فیزک لکھے ہوئے ہوں بلکہ یہ کتاب وہ ہوگی جس میں ایک امت کے لحاظ سے جو کچھ انجام دیا ہے وہ سب کچھ لکھے ہوئے ہوں گے امت کے حوالہ سے جو کچھ انجام دیا ہو لکھا ہوگا یعنی وہ عمل باہدف جس کے چند رخ ہوں اور ایک جہت کی بنا پر امت سے منسوب ہے تو امت کو اس کتاب کی طرف بلایا جائے گا یہ وہ عمل ہے جسے اس کتاب میں لکھا ہوا ہے۔ جب کہ دوسری آیات کریمہ میں ہم دیکھتے ہیں:

﴿**و کل انسان الزمناہ طائرہ فی عنقہٖ و نخرج لہ یوم القیامۃ کتابًا یلقاہ منشورًا. اقرا کتابک کفٰی بنفسک الیوم علیک حسیبًا**﴾ ''اور ہم نے ہر انسان کا نامہ اعمال اس کے گلے میں لٹکا رکھا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کے لیے ایک کتاب پیش کریں گے جسے وہ کھلا ہوا پائے گا۔ پڑھ اپنا نامہ اعمال! آج اپنے حساب کے لئے تو خود ہی کافی ہے'' (اسراء/۱۳،۱۴)

یہاں موقف بدل گیا ہے ہر انسان کی ایک کتاب ہے جس میں نہ کسی بڑے عمل کو چھوڑا ہے اور نہ چھوٹے کو سب اس میں موجود ہیں، حسنات، سیئات، ترقی تنزلی گویا اس کتاب میں ہر چیز کا حساب موجود ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو اس عالم کی طرف سے لکھی گئی ہے جس کے علم سے آسمان اور زمین کا ایک ذرّہ بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ ہر انسان یہ خیال کرتا ہے کہ وہ اپنے نقطہ ضعف کو چھپائے، گناہ وخطا کو چھپائے، اپنے ہمسائے، امت، اولاد حتی اپنے نفس سے چھپائے مثلاً یہ خیال کرے کہ میں نے غلطی نہیں کی اور اسطرح اپنے نفس کو دھوکہ دے لیکن یہ کتاب حق ہے جس میں ہر چیز کا ذکر آئے گا خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی۔ اس دن کہا جائے گا یہ وہ اعمال ہیں جو تم انجام دیتے تھے لہٰذا اس کتاب میں بیان کردہ اصول و

قوانین کے تحت خود اپنا حساب کرو۔ کسی بھی انسان کیلئے یہ ممکن نہیں ہوگا کہ اس دن کسی چیز کو چھپائے۔

یہ کتاب کتاب فرد ہے لیکن وہ کتاب کتابِ اُمت تھی جسکا ہم نے ذکر کیا کہ سب اپنے رب کے حضور کھڑے غمزدہ ہونگے اور یہاں ہر فرد کی کتاب کا ذکر ہے قرآن کریم نے کتاب فرد اور کتاب امت کے درمیان تمیز قائم کی ہے دوسرے الفاظ میں ہم نے بتادیا کہ تاریخی عمل اسے کہتے ہیں جو کتاب امت کی صورت میں موجود ہو۔ وہ عمل جس کی تین بنیادیں ہوں اور آیات بھی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ نہ صرف ایک کتاب فرد ہے اور ایک کتاب امت ہے بلکہ ایک فرد کا احضار ہے اور ایک امت کا احضار۔ قیامت کے دن خدا کے سامنے دو حضور ہونگے۔ فردی احضار میں ایک ایک کر کے حاضر ہونگے۔ نہ کوئی ناصر ہوگا نہ کوئی مددگار، کسی چیز سے مدد نہیں لے سکتے سوائے عمل صالح، قلب سلیم، ایمان باللہ، کتب آسمانی، ملائکہ اور اس کے رسول کے۔ اسے احضار فردی کہا جاتا ہے۔

خدا سبحان نے فرمایا ہے:

﴿**ان کل من فی السماوات والارض الّا اٰتی الرحمٰن عبدًا. لقد احصٰھم وعدھم عدًا. وکلھم اٰتیہ یوم القیٰمۃ فردًا**﴾ ''جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اس رحمٰن کے حضور صرف بندے کی حیثیت سے پیش ہوگا۔ بہ تحقیق اس نے ان سب کا احاطہ کر رکھا ہے اور انھیں گن کر شمار کر رکھا ہے۔ اور قیامت کے دن ہر ایک کو اس کے سامنے تنہا پیش ہونا ہے'' (مریم/۹۳تا۹۵)

یہ تھا احضار فردی کا ذکر جس میں فرد کو بطور فردی خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے لیکن اس فرد کیلئے ایک اور حضور بھی ہے وہ حضور اجتماعی ہے یعنی ایک امت کے عنوان سے خدا کے حضور حاضر ہونا ہے چنانچہ یہ دو کتابوں کے ساتھ ساتھ دو حضور بھی ہے جیسا کہ بیان ہوا: ﴿**تریٰ کل امۃ جاثیہ، کل امۃ نز عٰی الی کتابھا**﴾ یہ امت کا حضور ہے وہ چیز جو ان آیات کے سیاق وسباق سے سمجھ آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ دوسرا احضار ان کی تعلقات

کو اپنے صحیح جگہ پر رکھ کر ہوگا۔ امت کے درمیان تعلقات کبھی حق کی بنیاد پر نہیں ہوئے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان ہے وہ گرچہ کمزور تھا یہ امت کے اس تعلق کے ساتھ امت کے ساتھ حاضر ہوگا چنانچہ خدا نے اس دن کو یوم تغابن کہا ہے کیسے؟ یہ تغابن اجتماعی کے ذریعہ ہوگا جب فرد امت کے ضمن میں حاضر ہوگا تو جو شخص اپنی موقعیت کے حوالہ سے اجتماع سے مغبون میں ہوں تو وہ جس قدر امت میں مغبون رہا ہو اسی مقدار میں حق لے لے گا۔ اس دن وہ اپنا حق لے لے گا جس دن حق کے علاوہ کوئی بات نہیں ہوگی۔ وہاں صرف حق کا بول بالا ہوگا سنیں خدا کا فرمان:

﴿یوم یجمعکم لیوم الجمع ذٰلک یوم التغابن ومن یؤمن بااللّٰہ ویعمل صالحًا یکفر عنہ سیاتہٖ ویدخلہ جنٰتٍ تجری من تحتھا الانھٰر خٰلدین فیھآ ابدًا﴾

''وہ قیامت کے دن تم سب کو جمع کرے گا اور وہی ہار جیت کا دن ہوگا اور جو اللہ پر ایمان رکھے گا اور نیک اعمال کرے گا خدا اس کی برائیوں کو دور کردے گا اور اسے ان باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ ان ہی میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے'' (تغابن/ ۹)

یہاں دو قسم کے کاپیاں ہیں ایک کاپی عمل فرد کے لئے ہے جس کی دو بنیادیں ہیں اور دوسری کاپی عمل امت کے لئے ہے جس کی تین بنیادیں ہیں ایک بعُد فاعل ہے جسے ارسطو نے علت فاعلی کہا ہے دوسرا بُعد ہدف ہے جسے ارسطو نے علت غائی کہا ہے تیسرا بُعد وہ طبیعت ہے جسے علت مادی کہا ہے یہ تین بُعد والے عمل ہیں جو قانون تاریخ کا موضوع ہیں۔ یہی عمل اجتماع ہے۔

مجتمع فرد کے مقابل میں کوئی دوسرا وجود نہیں:

لیکن اس عمل کے بارے میں یہ خیال نہ کیا جائے جو ہیگل اور بعض دوسرے مغربی فلاسفہ نے کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اجتماع ایک بڑا وسیع موجود ہے اور ایک وجود واحد ہے اسکے بھی اعضاء ہیں۔ ہر فرد اس بڑے وجود میں ایک خلیے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہیگل اور بعض یورپی فلاسفہ نے ایسا ہی سوچا ہے انہوں نے عمل اجتماع کو ایسا ہی تصور کیا ہے۔

انہوں نے سوچا عمل اجتماع اور عمل فرد میں امتیاز رکھا جائے۔ لہٰذا وہ لوگ کہتے ہیں: ہمارے پاس اعضاء والا ایک بڑا وجود ہے درحقیقت اسی وجود واحد کے ذیل میں تمام افراد ہیں۔ اس کے اندر تمام افراد مندرج ہیں۔ ہر انسان اس بڑے (اجتماع) میں ایک خلیہ کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ وجود انہی افراد کے ذریعے واقع کی طرف دیکھتا ہے۔ انہی افراد کے توسط سے یہ اجتماع اپنا ظہور پیدا کرتی ہے تو جتنا افراد کی قابلیت اور ایجادات ہوگی وہی اجتماع کا ہوگا اور یہ وجود (اجتماع) انہی تمام افراد میں سے ایک کے ذریعے ظہور پذیر کرے گی۔ یہی وجود ہیگلی ہے۔

یہ تھا اجتماع کے بارے میں ہیگل اور دوسرے مغربی فلاسفہ کا تصور جنہوں نے اسے اپنایا ہے لیکن یہ تصور صحیح نہیں اور نہ ہی ہمیں اسکی ضرورت ہے بلکہ ہم اس تصّور میں اس حد تک غرق ہو جائیں کہ ہم ان افراد سے اس افسانوی وجود کو نکالیں کیونکہ ہمارے پاس افراد سے ہٹ کر کوئی شۓ نہیں ہے زید، بکر اور خالد...... ہے اور ان کے پیچھے یہ وجود چھپا ہوا نہیں ہے البتہ ہیگل کے ساتھ فلسفی زاوئے سے گفتگو کرنا چاہئے کہ اجتماع کا کوئی وجود ہے یا نہیں۔ اگر وہ گفتگو شروع کریں گے تو ہم اپنے اصل موضوع سے نکل جائیں گے۔ لہٰذا ہم اس بحث کو کسی اور جگہ کے لئے چھوڑتے ہیں کیونکہ جب تک ہیگل کے پورے نظریات پر گفتگو نہ کی جائے اس موضوع پر بات نہیں ہوسکتی لیکن اس تصور میں جو چیز ہم جاننا چاہتے ہیں اس ہم اپنے اصلی موقف کو سمجھنا چاہتے ہیں یہ تصور صحیح نہیں ہے ہمیں عمل فرد اور عمل مجتمع میں فرق ڈالنے کے لئے ایسی کہانی بنانے کی ضرورت نہیں۔ فرد اور اجتماع کے درمیان فرق وہی ہے جسے ہم نے تیسرے بُعد میں بیان کیا ہے۔ عمل فرد کے دو بُعد ہیں اور اگر تیسرا بُعد شامل ہوا تو یہ عمل اجتماعی ہوگا۔ درحقیقت اجتماع اس عمل کے لئے زمین کی حیثیت رکھتا ہے۔ ارسطو کی اصطلاح کے مطابق اجتماع اس عمل کا علت مادّی ہے۔ اس صورت میں یہ عمل کتاب امت میں شامل ہوگا۔ اس امت کے عمل میں جو اپنے رب کے حضور سر بزانو ہے۔ یہ ہے فردی اور اجتماعی عمل کے درمیان فرق۔

ہم اپنی گفتگو کا خلاصہ اسطرح پیش کرتے ہیں کہ قانون تاریخ کا موضوع وہ باہدف عمل ہے جو درحقیقت علت مادی کی صورت اختیار کرتا ہے۔ جتنا امت کے عمل میں وسعت یا تنگی ہوگی اسی تناسب سے اسے علت مادی میسر ہوگی اور یہی وہ قانون تاریخ کا موضوع ہے۔

روز چارشنبہ ۴ جمادالثانی ۱۳۹۹ھ۔

درس ھفتم

اعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم وأفضل الصلوات علی سیدالخلق محمدوعلی الھداۃ المیامین من آلہ الطاھرین.

اب وقت آ گیا ہے کہ ہم قرآنی رُو سے قانون تاریخ کے بارے میں مختلف زاویوں سے آگاہ ہوجائیں۔

قرآن کریم سے قانون تاریخ کی تعبیر کیسے ممکن ہے؟ وہ کونسی شکل وصورت ہے جوقرآن نے قانون تاریخ کے بارے میں اپنائی ہے۔قرآن کریم نے قانون تاریخ کے بارے میں تین شکلیں پیش کیں ہیں۔ان میں سے ہرایک پر بحث وگفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔ان کا آپس میں موازنہ کرنے کی ضرورت ہےاورایک دوسرے میں فرق کوظاہر کرنے کی ضرورت ہے۔

ا۔پہلی شکل ''قضیہ شرطیہ'':۔

اس شکل میں قانون تاریخ شرطیہ شکل میں بیان ہوا ہےیعنی وہ واقعات یا حوادث جو تاریخ میں موجود ہیں وہ علیحدہ پیش آئے ہیں لیکن انکا آپس میں ربط موجود ہےاور یہ ربط شرط اور جزاء کی صورت میں ہےیعنی جب بھی شرط وجود میں آئی تو جزاء حتمی ہے یہ شکل ہمیں بہت سے دوسرے میدانوں جیسےقوانین طبعیات اورتکوینیات میں بھی نظر آئے گی۔

بطور مثال ہم قانون طبیعت میں سے ایک ایسے قانون پر گفتگو کرتے ہیں جوشرط کی صورت میں بیان ہوا ہے جیسے پانی کے ابلنے کیلئے ۱۰۰ درجہ سینٹی گریڈ حرارت کی ضرورت ہےیعنی پانی اس شرط پر گرم ہوگا۔ یہ قانون طبیعی ہے جوشرط کی صورت میں موجود ہےاوراس قانون میں یہ تاکید ہے کہ جب بھی یہ شرائط پوری ہونگی جزاء حاصل ہوگی۔ یہ قانون ایک شرط کی صورت میں ہے۔

لیکن یہ قانون طبیعی نہیں یہ قانون شرط کے تحقق یا عدم تحقق کو نہیں بتاتا۔ یہ قانون طبیعی یہ نہیں بتاتا کہ پانی پر حرارت عارض ہوگا یا نہیں ہوگا؟ یہ بھی نہیں بتاتا کہ کیا یہ پانی اس قانون کے ضمن میں اس مطلوب درجہ تک پہنچے گا یا نہیں پہنچے گا؟ شرط وجود میں آئے گی یا وجود میں نہیں آئے گی یہ بیان نہیں ہوگا یہ شرط کے واقع ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتا۔

بس یہ بتاتا ہے کہ جزاء اپنے شرط سے جدا نہیں ہوتا۔ جب شرط موجود ہو جزاء بھی موجود ہوتا ہے۔ پس پانی کا اُبلنا شرط سے مربوط ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو یہ قانون یعنی قضیہ شرطیہ بیان کر رہا ہے۔ ایسے قوانین نے انسانی زندگی میں بہت خدمات انجام دی ہیں اور ان قوانین کی ہی وجہ سے انسان نے انسانیت کی خدمت کی ہے اوران قوانین نے انسان کو آگاہ و بیدار بنایا ہے کیونکہ انسان کو جب بھی جزاء کی ضرورت ہوگی وہ اس قانون پر عمل پیرا ہوتا ہے اوراس قانون کے شرائط کو فراہم کرتا ہے اور جب جزاء اس کی مصلحت میں ہوئی تو شرائط کو پورا کرے گا اور اگر جزاء اس کے مصلحت اور آرامش سے تعارض ہوتو وہ اسے محال قرار دیتے ہوئے اس کے شرائط کو پورا ہونے سے روکے گا۔ جب بھی پانی کا ابلنا اسے مقصود ہوگا وہ تمام شرائط کو پورا کرے گا اور جب اس کا اُبلنا اس کا مقصود نہ ہوتو ان شرائط کو پورا ہونے نہیں دے گا۔

پس یہ قانون شرطیہ انسانی زندگی میں قابل عمل قانون ہے۔ یہاں سے ہم پر حکمت خدا نمایاں ہوتی ہے کہ قدرت نے کائنات میں کتنے دقیق قانون پیدا کیے ہیں اور کسطرح انکو ایک دوسرے سے ربط دیا ہے اور کائنات کی شکل ایک نظام ہمہ گیر کی شکل میں موجود ہے اور یہ قانون انسان کو اسکی ضرورت کی چیزوں سے آگاہ کرتا ہے اوران وسائل سے آگاہ کرتا ہے جو اس کے لئے ضروری ہیں، جو اسکی زندگی کی حاجات کو پورا کرنے، اسے مشکلات پر قابو پانے میں معاون ہیں۔ کیونکہ اگر پانی کا ابلنا بطور صُدفہ یا اتفاقیہ ہوتا تو کسی بھی صورت میں اس سے استفادہ ممکن نہیں ہوتا۔ تو انسان ان شرائط کو پیدا نہ کرسکتا اور اپنی

زندگی میں جب بھی اس کی حاجت ہوتی سے پیدا نہ کرسکتا اور جب بھی اس کا نہ ہونا مقصود ہوتا اس حالت کو بھی پیدا نہ کرسکتا۔ انسان کو یہ قدرت اس وقت مل سکتی ہے اور یہ کام انسان اسی صورت میں انجام دے سکتا ہے جب کائنات پر یہ قانون شرطیہ اطلاق ہوں۔ ایسی صورت میں انسان ایک آگاہ عالَم میں زندگی گزارے گا اوران قوانین کی روشنی میں بہت خدمات انجام دے سکتا ہے۔

یہی شکل جو آپ نے قانون طبعی میں ملاحظہ فرمائی یہ آپکو قانون تاریخ میں بھی ملے گی جسے قرآن کریم نے پیش کیا ہے۔ قرآن کریم میں ایسے بہت سے قوانین تاریخ بیان ہوئے ہیں جو قضیہ شرطیہ کی صورت میں موجود ہیں کہ جو دو اجتماعی واقعوں کو آپس میں ربط دیتا ہے یا دو تاریخی واقعوں میں ربط دیتا ہے پس یہ پہلے واقعے کے بارے میں نہیں بتاتا کہ کب یہ پایا جائے گا اور کب نہیں ہوگا لیکن دوسرے واقعہ کے بارے میں بتاتا ہے کہ جب بھی پہلا واقعہ موجود ہو دوسرا ضرور موجود ہوگا ہم نے پہلے قرآن میں قانون تاریخ کے ضمن میں کچھ آیات کریمہ آپ کی خدمت میں پیش کیں جو قانون تاریخ کے بارے میں گفتگو کرتی ہیں۔ ان جملہ آیات میں سے بعض میں قانون تاریخ کو ایک قضیہ شرطیہ کی صورت میں پیش کیا گیا ہے ہم ان کو یہاں ذکر کرتے ہیں مثلاً فرمایا: ﴿**ان اللّٰہ لایغیّر مابقوم حتّٰی یغیّروا مابانفسھم**﴾ ''خدا اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اندر سے اپنی حالت نہ بدلے'' (رعد/۱۱) یہ قرآن کا قانون تاریخ ہے کہ جس کے بارے کچھ باتیں بیان ہوئیں اور انشاء اللہ تفصیلی بحث بعد میں عرض کریں گے۔ یہاں ایک قانون تاریخ بیان ہوا ہے لیکن شرط کی صورت میں چونکہ اس مفاد قرآن کا برگشت یہ ہے کہ۔ یہاں دو تغیرات کے درمیان گہرا ربط ہے ایک انسان کا داخلی تغیر ہے اور دوسرا بیرونی تغیر ہے ان دونوں میں یہ ربط ایک شرط کی صورت میں بیان ہوا ہے یعنی جب بھی قوم میں داخلی طور پر تغیر آئے اسکا حتمی نتیجہ ہے کہ بیرونی تغیر بھی آئے گا لہٰذا یہ ایک قضیہ شرطیہ ہوا۔ اسی طرح سورۂ جن میں ہے: ﴿**وان لو استقاموا علیٰ الطریقۃ لاسقینٰھم ماءً غدقاً**﴾ ''اور اگر یہ لوگ سب

ہدایت کے راستے پر ہوتے تو ہم انہیں وافر پانی سے سیراب کرتے (جن/۱۶)۔کہ اگر یہ لوگ اسی راہ پر ثابت قدم رہتے تو ہم انہیں وافر پانی سے سیراب کرتے ہم نے پہلے بتایا: یہ آیت کریمہ قانون تاریخ میں سے ایک قانون کے بارے میں بتارہی ہے۔اس قانون کو بتارہی ہے کہ پیداوار میں اضافہ تقسیم میں عدالت سے مربوط ہے۔یہ ایک قانون شرطیہ کے طور پر بیان ہوا ہے کہ جب بھی تقسیم میں عدالت قائم ہوگی پیداوار میں اضافہ ہوگا۔

﴿**واذآاردنآان نهلک قریةً امرنامترفیهاففسقوافیهافحق علیهاالقول فدمرنٰهاتدمیرًا**﴾ ''اور جب بھی ہم کسی بستی کو ہلاکت میں ڈالنا چاہتے ہیں تو اس کے عیش پرستوں کو حکم دیتے ہیں تو وہ اس بستی میں فسق وفجور کا ارتکاب کرتے ہیں۔ تب اس بستی پر فیصلہ عذاب لازم ہو جاتا ہے پھر ہم اسے پوری طرح تباہ کردیتے ہیں'' (اسراء/۱۶)

یہاں بھی قانون تاریخ قضیہ شرطیہ کے طور پر بیان ہوا ہے کہ دوکلموں کا آپس میں ربط دیا ہے کہ جب بھی فاسق اور عیش پرست حاکم بنے گا معاشرہ خود بخود تباہ ہو جائے گا یہاں فاسق کے حاکم بننے اور معاشرے کے تباہ ہونے میں ربط ہے اور یہ قانون تاریخی بھی قضیہ شرطیہ کی صورت میں بیان ہوا ہے۔ یہاں یہ نہیں بیان ہوا کہ یہ شرط کب وجود میں آئے گی بلکہ یہ بیان ہوا ہے کہ جب بھی یہ شرائط پوری ہونگی تو یہ نتیجہ حتمی ہے۔ یہ تھی وہ پہلی شکل جو قرآن کریم نے قانون تاریخ کے بارے میں بیان کی ہے۔

۲۔''فعلیت ناگزیر ہے''

قانون تاریخ کی دوسری شکل: یہ قضیہ فعلی حتمی اور محقق ہونے والا ہے۔اسکی مثال اورشواہد بھی ہمیں طبعیات اور کائنات کے قوانین میں ملیں گے مثلاً ماہر فلکیات جب ستاروں کی گردش کی روشنی میں یہ حکم دیتا ہے کہ فلاں مہینے کی فلاں تاریخ کو سورج گرہن یا چاند گرہن ہوگا تو یہ ایک قانون علمی ہے اور ایک علمی قضیہ ہے لیکن یہ ایک حتمی وجود میں آنے والا قضیہ ہے اور یہ قضیہ شرطیہ نہیں۔ کسی انسان میں یہ قدرت نہیں کہ اسکی شرائط کوروک

کر اس کے اپنے معین زمان اور مکان سے اس کا رخ موڑ دیے کیونکہ یہ قضیہ شرطیہ کی طرح بیان نہیں ہوا ہے بلکہ قضیہ فعلیہ وجودیہ کے طور پر بیان ہوا ہے۔ سورج گرھن ہوگا، چاند گرھن ہوگا، یہ ایک قضیہ فعلیہ ہے کہ جو آنے والے زمان کی انتظار میں ہے اور کسی بھی صورت میں اس حادثہ کے وقوع کی خبر دیتا ہے۔

اسی طرح محکمہ موسمیات والے کہتے ہیں کہ فلاں جگہوں پر بارش ہوگی۔ یہ بھی قضیہ فعلی ہے۔ یہاں پر لغت، شرائط میں بات نہیں ہورہی بلکہ معین مکان اور معین زمان کے لحاظ سے حتمی اور محقق ہونے کی لغت میں بات ہورہی ہے یہی قانون تاریخ کی دوسری صورت ہے اس صورت کی قرآن سے مثالیں ہم انشاءاللہ بعد میں پیش کریں گے۔

یہاں سے مغربی مفکرین کے اذہان میں یہ شک پیدا ہوا ہے کہ انسان کے آزاد ہونے اور اس قانون تاریخ میں تضاد ہے۔ یہ غلط فکر پیدا ہوئی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ قانون تاریخ کی فکر انسان کے مختار اور آزاد ہونے کے فکر کی ساتھ جمع نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ یہی قانون تاریخ ہے جو انسان کا راستہ اور زندگی کو منظّم کرتے ہیں تو اس وقت انسان کے ارادہ کی کیا حیثیت باقی رہ جاتی ہے۔

یہی بات تو بہت سے مفکرین کو اس نتیجہ پر لے گئی ہے کہ کائنات یا قانون تاریخ کے بارے میں انسان کا کردار منفی ہے۔قانون تاریخ ہے اور انسان مجبور محض ہے۔انہوں نے قانون تاریخ کو تسلیم کر کے انسانی ارادہ کو ختم کیا ہے کیونکہ یہ قانون تاریخ کو رد نہیں کر سکے لہٰذا کہتے ہیں: انسان کا کردار منفی ہے اور اس کیلئے مثبت کردار نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں انسان بعینہ ایک پٹرول انجن کی طرح ہے جو مخصوص شرائط کے تحت چلتا ہے۔اس فکر کے بارے میں تفصیلاً بحث بعد میں کریں گے۔

اس فکر کے مقابل ایک اور فکر سامنے آئی ہے اس فکر نے ان دونوں کے درمیان ربط پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان خود مختار ہے اور ساتھ ہی قوانین تاریخ کے سامنے خاضع ہے۔انہوں نے کہا ہم انسانی ارادے کو رد نہیں کر سکتے لیکن ہم یہ کہہ سکتے ہیں: انسان

کا اختیار خود تاریخی واقعہ ہے اس وقت وہ اپنے کردار میں قانون کا خاضع ہوگا یہ بھی انسان کے اختیار کا ردّ کرنا ہے لیکن پیچیدہ اور رمزی صورت میں۔

اسکے علاوہ ایک تیسرا گروہ بھی ہے انہوں نے ارادے کو بچانے کیلئے قانون تاریخ انکار کیا ہے بعض مغربی مفکرین نے کہا ہے کہ خود مختاری کو تسلیم کرنے کیلئے ضروری ہے کہ کائنات کے میدانوں میں سے میدان تاریخ کے قانون سے دستبردار ہو جائے اور ہم یہ کہہ سکیں کہ میدان تاریخ میں کوئی حتمی قانون نہیں ہے تاکہ انسان کا اختیار اور ارادہ بچ سکے۔

یہ تمام موقف خطاء پر مبنی ہیں کیونکہ یہ ایک غلط فکر اور وہم پر قائم ہیں انکا وہم یہ ہے کہ قانون تاریخ اور انسان کی خود مختاری کو جمع کرنے میں تناقص ہے۔ان کے اس وہم کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے قانون تاریخ کو صرف دوسری شکل میں ہی منحصر کیا ہے یعنی انھوں نے اپنی نظر کو قانون تاریخ کے قضیہ فعلی وجودی اور حتمی لغت پر منحصر کیا ہے اگر ہم قانون تاریخ کو صرف اسی صورت میں منحصر کریں تو انکا اعتراض وارد ہوگا لیکن ہم اس وہم کو باطل ثابت کر سکتے ہیں کیسے؟ اس لیے کہ ہم قانون تاریخ کی پہلی صورت بھی رکھتے ہیں جو کہ قضیہ شرطیہ کی صورت میں بیان ہوئی ہے۔اور قضیہ شرطیہ میں جو چیز سب سے زیادہ شرط ہے وہ انسان کا ارادہ اور اختیار ہے یعنی قضیہ شرطیہ میں انسانی ارادے کو محور و مرکزیت حاصل ہے۔یہی قضیہ شرطیہ کی شرط ہے۔پس قضیہ شرطیہ جو ہم نے آیات قرآنی کے تحت پیش کیں کیا ان میں شرط اور جزء کے درمیان ربط کی بات ہوتی تھی لیکن خود شرط کیا ہے؟ شرط سے مراد انسان کا فعل اور اس کا ارادہ ہے ﴿**ان اللّٰہ لایغیر مابقوم حتٰی یغیروا مابانفسھم**﴾ (رعد/۱۱) یہاں پر تغیر کو انسانوں سے نسبت دیا ہے پس یہ تغیر ان کے کام، ایجادات اور ارادہ ہیں۔

قانون تاریخ جب بھی شرطیہ زبان میں پیش ہو اور جب بھی قضیہ شرطیہ میں انسان کے ایجادات اور اختیار موضوع شرط قرار پائے ایسی حالت میں یہ قانون اختیار انسان کے ساتھ سازگار ہوگا بلکہ اس وقت قانون تاریخ اختیار انسان کو اور زیادہ

قدرت عطا کرتا ہے اور اسے اپنے موقف میں تصرف کرنے کے اختیار اور قدرت کو بڑھاتا ہے اور اسے زیادہ امکانات عطا کرتا ہے اُبالنے کے قانون طبیعت انسان کی قدرت میں اضافہ کرتا ہے کیونکہ انسان اُبلنے کی شرائط اور حالات کو جاننے کے بعد اُبلنے پر حکم کرنے کی استطاعت رکھتا ہے (یعنی شرائط فراہم کر کے اُبالے یا شرائط کو روک کر نہ اُبالے)۔قضیہ شرطیہ والا قانون تاریخ بھی اسی طرح ہے۔یہ درحقیقت ارادہ انسان کے خلاف نہیں ہے اور نہ ہی یہ انسان کے اختیار کا نقیض ہے بلکہ یہ اختیار انسان کی تاکید کیلئے اور انسان کیلئے اختیار کے نتائج فراہم کرتا ہے تاکہ وہ ان نتائج میں سے جسے چاہے ہاتھ میں لیلے تاکہ وہ اس نتیجہ یا اس نتیجہ تک پہنچنے کے راستہ کو پہچان سکے۔اس وقت وہ روشنی اور روشن کتاب کے ساتھ چلیں گے۔یہ تھی قانون تاریخ کی دوسری شکل۔

۳۔قانون کی ساخت طبیعی شکل میں:۔

یہ قانون تاریخ کی تیسری شکل ہے۔یہ وہ صورت ہے جسے قرآن نے بہت ہی زیادہ اہمیت دی ہے یہ قانون تاریخ وہ قانون ہے جو حرکت تاریخ میں طبیعی صورت میں بنا گیا ہے نہ کہ حتمی اور معین قانون کی صورت میں؟ رجحان اور قانون میں فرق ہے ان دونوں کے فرق کو پیش کرنے کیلئے ضروری ہے کہ ہم ایک عادی قانون جس سے ہم مانوس ہیں اسے پیش کریں۔

قانون علمی جسے ہم عام طور پر تصور کرتے ہیں: یہ وہ قانون ہے جسے بشر چیلنج نہیں کرسکتا کیونکہ یہ تکوینی اور طبیعی قوانین میں سے ایک قانون ہے۔انسان کیلئے ممکن نہیں کہ اس قانون کو چیلنج کر سکے یا اس قانون کو ہی ختم کر یے یا اپنے آپ کو اس کے دائرے سے آزاد کرے۔ایک انسان کیلئے ممکن ہے کہ وہ نماز نہ پڑھے چونکہ وجوب نماز ایک حکم تشریعی ہے نہ کہ ایک حکم تکوینی۔ممکن ہے وہ شراب پیئے کیونکہ حرمت شرب خمر تشریعی ہے تکوینی نہیں لیکن اس انسان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ تکوینی موضوعی قانون کو چیلنج کرے۔اسکے لئے ممکن نہیں کہ وہ جس درجہ حرارت پر پانی گرم ہوتا ہے یا جوا سکے لئے معین ہے اس درجہ پر پہنچنے

کے بعد پانی کو ابلنے نہ دے۔ اسکے لئے ممکن نہیں کہ وہ یہ چیلنج کرے کہ میں پانی کو ابلنے نہیں دوں گا یا کچھ لمحے اس وقت میں کمی کرے کیونکہ یہ قانون ایک حتمی قانون ہے اس میں قطعیت ہے اور قطعیت چیلنج قبول نہیں کرتا یہ ہے قوانین کے بارے میں ہمارا عام تصور جو ایک حد تک صحیح ہے لیکن ضروری نہیں کہ تمام قانون طبیعی اور موضوعی ایسے ہوں جنھیں چیلنج نہ کیا جاسکتا ہو یا ان کا مقابلہ نہ کیا جاسکتا ہو۔ بلکہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ حرکت تاریخ اور انسانی راستے میں ایسے رجحانات ہیں جن میں نرمی اور ملایمت پائی جاتی ہے یعنی وہ چیلنج کو قبول کرتے ہیں لیکن مختصر مدت کیلئے۔ مثلاً آپ کیلئے ممکن نہیں کہ پانی کو ۱۰۰ درجہ سینٹی گریڈ تک پہنچنے کے بعد گرم نہ ہونے دیں آپ اسے مکمل طور پر معطل نہیں کر سکتے لیکن کچھ رجحانات ایسے ہیں جو نرم وملائم ہیں وہ کچھ عرصہ کیلئے چیلنج کو قبول کرتے ہیں لیکن اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ یہ رجحانات حرکت تاریخ میں موضوع واقعی نہ ہوں نہیں یہ رجحانات ہیں لیکن مختصر سی چیلنج قبول کر لیتے ہیں یہاں سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ قانون کے مختلف رجحانات ہیں ایک رجحان جسے چیلنج کیا جا سکتا ہے اس میں چیلنج کرنے والا نابود نہیں ہوتا لیکن ایک رخ وہ ہے جس میں تھوڑے عرصہ کیلئے چیلنج کر سکتے ہیں لیکن قانون تاریخ کے ہاتھوں خود چیلنج کرنے والا نابود ہوجاتا ہے۔ یہ حرکت تاریخ میں موجود وہ طبیعی رجحانات ہیں۔

اس فکر کو آپ کے اذہان سے قریب کرنے کیلئے ممکن ہے ہم یہ کہیں کہ انسان کی تخلیق وترکیب میں کچھ رجحانات ہیں وہ موضوعی رجحان ہیں نہ کہ تشریعی۔ بطور مثال ہر معاشرے میں مرد وعورت کے تعلقات کو قائم کرنے کے لئے کسی نہ کسی صورت میں قانون نکاح موجود ہے چاہے وہ شریعت سے ہٹ کر ہو۔ یہ رجحان تشریعی اور اعتباری نہیں ہے بلکہ یہ ایک طبیعی و موضوعی رجحان ہے جسکا انسان کی حرکت تکوین میں دخل ہے۔ ہمارے لئے ممکن نہیں کہ ہم یہ بتائیں کہ جو مرد وعورت کے تعلقات ہیں اسکا تعلق صرف قانون تشریعی سے ہے اور یہ ایک حکم شرعی ہے ایسا ممکن نہیں بلکہ یہ رجحان طبیعت انسان اور ترکیب انسان میں داخل ہے اور یہ مرد وعورت کے درمیان تعلقات کا رجحان ہے اور اسی رابطہ سے نوع بشر کا ادامہ ممکن ہے

جو اجتماع میں نکاح کے اشکال میں سے کسی بھی شکل میں ہے۔

یہ ایک قانون ہے لیکن ایک حتمی قانون کے طور پر نہیں بلکہ قانون رجحان کے طور پر ۔کیوں؟ کیونکہ اس قانون کو کچھ دیر کیلئے معطل کیا جاسکتا ہے اسے چیلنج کر سکتے ہیں۔ چنانچہ قوم لوطؑ نے کچھ عرصہ کیلئے اس قانون کو چیلنج کیا اور عورتوں کے پاس نہیں گئے لیکن ان کیلئے کسی بھی صورت میں ممکن نہیں تھا کہ وہ پانی ابلنے کے قانون کو چیلنج کریں لیکن انہوں نے مرد عورت کے تعلقات کے قانون کو چیلنج کیا لیکن اس چیلنج کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصہ کے بعد اس قانون نے خود انھیں نابود کر دیا جس معاشرے میں اس قانون کو چیلنج کیا انھوں نے اپنے آپ کے فنا کو لازمی قرار دیا ہے۔ انہوں نے مختلف انحرافات کے ذریعے اس قانون کو رد کرنے کی کوشش کی لیکن ان انحرافات کے نتیجے میں خود نابود ہوگئے۔

یہاں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک رجحان موضوعی ہے جو تھوڑے عرصہ کیلئے چیلنج کو قبول کرتا ہے لیکن مستقل طور پر نہیں کیونکہ یہ قانون خود چیلنج کرنے والے کو نابود کر دے گا۔

یہ جو مرد وعورت کے درمیان تعلقات کا قانون ہے یہ طبیعی نما قانون ہے یہ ایسا رجحان نہیں جسے شریعت نے قرار دیا ہو۔ بلکہ یہ ایسا رجحان ہے جسے مرد وعورت کی طبیعت میں رکھا گیا ہے لیکن اس رجحان کو چیلنج کر سکتا ہے کچھ مدت کیلئے معطل کر سکتا ہے ممکن ہے کوئی ایسا قانون وضع کرے جس میں مرد سے کہا جائے کہ وہ گھر میں رہے، گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کرے اور عورتوں کو یہ حکم دے کہ وہ باہر نکلیں اور جتنے بھی مشقت وزحمت کے کام ہیں انھیں انجام دیں۔ ممکن ہے آپ ایسا کوئی قانون اسمبلی کے توسط سے جعل کریں اور وہ قانون جو مرد وعورت کے اندر موجود ہے اسے چیلنج کریں لیکن یہ چیلنج دیرپا نہیں ہوگا اور زیادہ عرصہ نہیں چلے گا کیونکہ قانون تاریخ جلد ہی اس کا جواب دے گا کیونکہ ہمیں اس جعلی قانون سے خسارہ ہوگا اور جو قابلیت مرد وعورت میں خداوند کریم نے رکھی ہے اس سے محروم ہونگے وہ منجمد ہوگی مثلاً خدا نے بچوں کی تربیت کی جو قابلیت عورت کو دی ہے وہ منجمد ہوگی اور اسی طرح مرد کو جو مشقّت، صبر اور استقامت کی قوت دی ہے اس سے بھی محرومی ہوگی۔ ممکن ہے آپ

ایسے قانون بنائیں اوراس پر عمارت کھڑی کریں لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد یہ عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔ اس چیلنج میں استمرار اور دوام نہیں ہوگا۔اس طرح کے تمام رجحانات درحقیقت ایک قوانین تاریخ اورحرکت انسانی کے قوانین میں ہیں لیکن ایسا قانون ہے جو کچھ مدت کیلئے چیلنج کوقبول کرتا ہے بعدہ قانون اس چیلنج کا جواب دے دیتا ہے یہ قانون تاریخ کا ایک رخ ہے جوحرکت انسانی پر حاکم ہے لیکن یہ قانون نرم وملائم ہے اور مختصر عرصہ کیلئے چیلنج کوقبول کرتا ہے لیکن جلد ہی خود چیلنج کرنے والے کوختم کر دیتا ہے۔

دین اس شکل کا روشن مصداق ہے:۔

قوانین کی اس تیسری شکل کے بارے میں قرآن نے جومصداق پیش کی ہے ان میں سب سے زیادہ اہم دین کی ہے۔قرآن کی نظر میں دین خودقوانین تاریخ میں سے ایک قانون ہے اورقوانین تاریخ میں سے ایک موضوعی قانون ہے۔دین صرف تشریعی نہیں ہے بلکہ دین قوانین تاریخ میں سے ایک قانون ہے۔لہٰذا دین کو دوشکلوں میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک تشریعی صورت میں جسے علم اصول میں ارادہ تشریعی کہتے ہیں یعنی خدا نے چاہا ہے کہ آپ شریعت کی ان باتوں پرعمل کریں۔دین کوتشریعی صورت میں پیش کرنے کی مثال سورۂ شوریٰ آیت ۱۳ میں موجود ہے:﴿**شرع لکم مّن الدّین ماوصّٰی بہٖ نوحاًوّالّذی اوحینا الیک وماوصّینا بہٖ ابراھیم وموسٰی وعیسٰی ان اقیموا الدّین ولاتتفرّقوا فیہ کبرعلی المشرکین ماتدعوھم الیہ اللّٰہ یجتبی الیہ من یّشآء ویھدی الیہ من یّنیب**﴾ ’’اس نے تمہارے لئے دین کا وہی دستور معین کیا جس کا اس نے نوح کوحکم دیا تھااور جس کی ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم اورموسیٰ اورعیسیٰ کوحکم دیا تھا کہ اس دین کوقائم رکھنااوراس میں تفرقہ نہ ڈالنا مشرکین کو یہ بات ناگوارگزری جس کی طرف آپ انھیں دعوت دیتے ہیں اللہ جسے چاہتا ہے اپنا برگزیدہ بنالیتا ہے اور جواس کی طرف رجوع کرتا ہے اسی کواپنی طرف راستہ دکھاتا ہے‘‘

یہاں دین کوایک تشریعی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔خدا کا ایک فیصلہ سنایا گیا

ہے لیکن دوسری شکل میں اس دین کوقوانین تاریخ میں سے ایک قانون کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا قانون ہے جسے انسان کی فطرت اورعناصر ترکیبی میں رکھا گیا ہے۔یعنی یہ انسان کی طبیعت میں ایک عنصر کے طور پر موجود ہے:﴿**فاقم وجھک للدّین حنیفاًفطرت اللّٰہ الّتی فطرالنّاس علیھالاتبدیل لخلق اللّٰہ ذٰلک الدّین القیم ولٰکن اکثرالنّاس لایعلمون**﴾ ’’پس (اے نبی) یکسوہوکراپنا رخ دین (خدا) کی طرف مرکوز رکھیں۔اللہ کی اس فطرت کی طرف جس پراس نے سب انسانوں کو پیدا کیا ہے‘اللہ کی تخلیق میں تبدیلی نہیں آتی یہی محکم دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے (روم:۳۰)‘‘ اس آیت میں دین کوصرف تشریعی طور پر پیش نہیں کیا گیا۔صرف اوپر سے آنے والے حکم کے طور پر پیش نہیں کیا گیا ہے بلکہ دین کو یہاں انسانی فطرت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ وہی فطرت ہے جس پرانسان کوخلق کیا گیا ہے اورخلق اللہ میں کوئی تبدیلی نہیں لاسکتا۔ یہاں یہ کلام ایک کلام خبری ہے نہ کہ تشریعی یا انشائی۔ یہاں خداوند متعال فرماتے ہیں کہ خلق خدا میں تبدیلی نہیں ہوسکتی جسطرح آپ انسان کے جسم سے اس کے ایک عنصر کونہیں نکال سکتے جیسے جسم سے نمکیات یا شوگر یا اسکی خواہشات کونہیں نکال سکتے اسی طرح انسان کے اندر سے دین کوبھی نہیں نکال سکتے۔ دین ایک ایسی چیز نہیں جوتاریخ میں کسی تمدن سے ملا ہوکہ جب آپ کی مرضی ہوا سے اپنالیں اور جب مرضی نہ ہوتو اسے مسترد کردیں اوراس سے بے نیازی کا مظاہرہ کریں۔اگرایسا ہوتا کہ آپ جب چاہیں اسے اپنائیں اور جب چاہیں اسے چھوڑ دیں تو پھر یہ فطرت اللہ نہیں ہوسکتی جس فطرت پرلوگوں کی خلقت ہوئی ہے اور نہ ہی خلق اللہ سے ہوگا جس میں کوئی تبدیلی نہیں بلکہ اس وقت یہ دین تاریخ بشریت میں تمدن اوراپنی ترقیات سے کسب کی ہوئی کوئی چیز ہوگی۔ قرآن ہمیں یہ بتاتا ہے کہ دین ان معقولات جیسا نہیں ہے کہ انسان جب چاہے اسے چھوڑ دے اور جب چاہے اسے اپنالے۔بلکہ دین خلق اللہ ہے﴿**فطرت اللّٰہ الّتی فطرالنّاس علیھالاتبدیل لخلق اللّٰہ**﴾ یہاں اس آیت میں جوکلمہ’’لا‘‘ آیا ہے یہ کلمہ’’

لا'' ناھیہ نہیں ہے بلکہ ''لا'' نافیہ ہے۔ یہ نہیں کہتا کہ دین میں تبدیلی نہ کرو بلکہ کہتا ہے کہ جب تک انسان، انسان ہے دین اس سے جدا نہیں ہوسکتا۔ پس دین اس انسان کیلئے ایک قانون ہے۔ یہ قانون ہے لیکن ایک فولادی قانون جیسا نہیں ہے یا اس قانون جیسا نہیں ہے جو پانی ابلنے کے لئے بیان ہوا ہے بلکہ یہ ایسا قانون ہے جو تھوڑی دیر کیلئے چیلنج قبول کرلیتا ہے جسطرح آپ نے ملاحظہ کیا کہ مرد و عورت کے تعلقات میں آپ مختصر عرصہ کیلئے بندش کر سکتے ہیں جس طرح اس قانون کو جنسی خواہشات پر قابو پا کر چیلنج کرسکتا ہے اسی طرح اس قانون کو تھوڑی مدت کے لئے الحاد اور کفر کے ذریعہ سے بھی چیلنج کیا جاسکتا ہے یعنی مرد مرد کے ساتھ اور عورت عورت کے ساتھ تعلقات قائم کر کے اسے کچھ عرصہ کیلئے معطل کریں اور اس بڑی حقیقت سے چشم پوشی کریں۔ ممکن ہے کہ وہ کچھ دیر کیلئے آنکھ بند کر لے اور سورج کو نہ دیکھے اور سورج کے وجود کا انکار کرے لیکن یہ چیلنج تھوڑے عرصہ کیلئے ممکن ہے اور بعد میں اسے اس کی سزا بھگتنا پڑے گا۔ یہ وہ سزا نہیں جو شریعت کی مخالفت کرنے والوں کو خدا کے حکم سے ملائکہ قیامت کے دن دیں گے۔ یہ وہ سزا نہیں جسے قانون کے خلاف کرنے پر پولیس کے ہاتھوں ملتی ہے کہ چھڑی اس کے سر پر مارتا ہے بلکہ یہاں سزا سے مراد وہ ہے جو قانون تاریخ کے توسط سے ملے گا قانون تاریخ از خود اس عذاب کو اس امت پر نازل کرے گا جو خلقِ خدا میں تبدیلی لانا چاہتا ہے کیونکہ خلق خدا میں تبدیلی نہیں ہے اسکی شاھد قرآن کریم کی سورہ حج کی آیت ۴۷ ہے: ﴿**ویستعجلونک بالعذاب ولن یّخلف اللّٰہ وعدہ وانّ یومًا عندربّک کالف سنۃٍ مّمّا تعدّون**﴾ ''اور یہ لوگ آپ سے عذاب جلدی طلب کررہے ہیں اور اللہ اپنے وعدے کے خلاف ہرگز نہیں کرتا اور آپ کے پروردگار کے ہاں کا ایک دن تمہارے شمار کے مطابق یقیناً ہزار برس کی طرح ہے'' ہم یہ کہتے ہیں قانون تاریخ کی اس تیسری شکل کو جو چیلنج کرتا ہے اسے خود یہیں قانون سزا دے دیتا ہے جلد ہی اس پر قانون تاریخی کے ذریعے عذاب نازل ہوگا۔ یہاں کلمہ سرعت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس سے مراد سرعت تاریخی ہے نہ کہ وہ سرعت جو ہم

روزمرہ زبان میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ آیت ہمیں اسی سرعت کے بارے میں بتاتی ہے، یہ آیت کریمہ ہمیں اس عذاب اجتماعی کے بارے میں بتا رہی ہے جو گذشتہ ظالم معاشروں پر نازل ہوا ہے اس کے بعد خداوند عالم فرماتا ہے یعنی پیغمبرؐ سے بھی لوگوں نے عذاب میں جلدی کا مطالبہ کیا اور آپ سے کہتے تھے تم جس عذاب کا ذکر کرتے ہو وہ کب آئے گا ابھی وہ عذاب ہم پر کیوں نازل نہیں ہوتا۔ ہم تم پر ایمان تو نہیں لاتے، ہم تمہیں تحدید کرتے ہیں، ہمارے کان تمہارے قرآن کیلئے بہرے ہیں یعنی تمہارے قرآن کو ہم نہیں سنتے کیوں ہم پر یہ عذاب نازل نہیں ہو رہا ہے۔ یہاں قرآن نے جس سرعت کا ذکر کیا ہے وہ عادی سرعت سے مختلف ہے۔ سرعت تاریخی کی بات ہو رہی ہے۔ یہاں خداوند عالم فرماتے ہیں: ﴿**و یستعجلونک بالعذاب ولن یّخلف اللّٰہ وعدہ**﴾ کہ یہ آپ سے عذاب کے نازل ہونے میں جلدی کے خواہاں ہیں یہ عذاب ضرور ہوگا کیونکہ یہ ایک سنت تاریخی ہے اور سنت تاریخی ایک ثابت چیز ہے لیکن ﴿**وانّ یومًا عندربّک کالف سنۃٍ مّمّا تعدّون**﴾ قانون تاریخ میں ایک دن یعنی خدا کا ایک دن کیونکہ قوانین تاریخ کلمات اللہ ہیں جیسا کہ ہم نے پہلے پڑھا۔ کلمات اللہ قانون تاریخ ہے پس کلمات خدا، قوانین خدا میں ایک دن کی مختصر سی مہلت ہے وہ ایک ہزار سال ہے۔ اسی طرح دوسری آیت میں خداوند عالم نے ایک دین کو پچاس ہزار سال کے برابر قرار دیا ہے۔ لیکن یہاں ایام سے مراد قیامت کا دن ہے نہ کہ دنیا کے دن یہی ان دو آیتوں کا وجہ جمع ہے:

﴿**تعرج الملٰئکۃ والروح الیہ فی یومٍ کان مقدارہ خمسین الف سنۃٍ. فاصبر صبرًا جمیلاً. انھم یرونہ بعیدًا. ونرٰہ قریبًا. یوم تکون السمآء کالمھل**﴾ ''جس کی طرف فرشتے اور روح الامین بلند ہوتے ہیں اس ایک دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔ لہٰذا آپ صبر سے کام لیں۔ یہ لوگ اسے دور سمجھ رہے ہیں۔ اور ہم اسے قریب ہی دیکھ رہے ہیں۔ جس دن آسمان پگھلے ہوئے تانبے کی مانند ہو جائے گا'' (معارج/۴ تا ۸)

یہ آیات قیامت کے بارے میں بتارہی ہیں۔اس دن کے بارے میں ہے جس دن آسمان پگھل جائے گا پس قیامت کا دن ہمارے دن کے مقابلے میں پچاس ہزار سال کا ہوگا۔لیکن اس آیت میں قوانین تاریخ کے مطابق اجتماعی عذاب آنے کے معین دن کی بات ہورہی ہے کہ وہاں پر فرماتا ہے تمہارے رب کے نزدیک ایک دن تمہارے ہزار سال کے برابر ہے۔پس قوانین تاریخ کی تیسری صورت ہے، یہی صورت ہے جسے تاریخ کے مسیر اور حرکت انسان اور ترکیب انسان میں موضوعی رجحانات بتایا جاتا ہے۔جن میں مختصر مدت کیلئے چیلنج ممکن تھا،لیکن قوانین تاریخ میں زیادہ مدت کیلئے چیلنج نہیں کرسکتے۔لیکن یہ بات ہے یہاں پر کم مدت اور زیادہ مدت ہمارے حساب کے مطابق نہیں ہے۔ہماری عادی زندگی کے ایک یا دو دن کی طرح نہیں ہے کیونکہ کلمات اللہ میں ایک دن اور قوانین تاریخ میں ایک دن ہمارے حساب کے مطابق ایک ہزار سال کے برابر ہے۔تو یہ تھی قانون تاریخ کی تیسری شکل جس میں دین بنیادی مثال ہے۔

اب ہمیں یہ جاننے کیلئے کہ دین کیسے قوانین تاریخ میں سے ایک قانون ہے، قانون تاریخ میں دین کا کیا کردار ہے؟ قانون تاریخ میں دین کو کیا مقام حاصل ہے؟ دین کیوں قوانین تاریخ میں سے ایک قانون بن گیا۔دین فقط تشریعی نہیں ہے بلکہ ایک قانون بھی ہے۔دین ایک سادہ شریعت نہیں ہے بلکہ یہ ایک قانون اور انسانی زندگی کی بنیادی ضرورت ہے۔دین کی حالت مرد وعورت کے درمیان قانون زوجیت کی حالت کی طرح ہے، یہ ایک قانون موضوعی ہے، کیوں ایسا ہوا؟ کب ایسا ہوا؟ اور قوانین تاریخ میں قانون تاریخی کی طرح دین کا کیا کردار ہے؟ ان سب کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ ہم اجتماع کو اٹھائیں اجتماع کے عناصر کو قرآن کریم کی روشنی میں تجزیہ وتحلیل کریں تاکہ ہم اس بات کی تہہ تک پہنچ جائیں کہ دین قوانین تاریخ میں سے ایک قانون ہے؟ ہم کیسے اجتماع کے عناصر کا تجزیہ وتحلیل کریں؟ ہم اجتماع کے عناصر کو اس آیت کی روشنی میں تحلیل کریں:

﴿واذقال ربک للملٓئکة انی جاعل فی الارض خلیفةً قالو آاتجعل فیھامن

یفسد فیھا ویسفک دمآء ونحن نسبح بحمدک ونقدس لک قال انیٓ اعلم مالاتعلمون﴾ "اے رسول! اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے ملائکہ سے کہا کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں اور انہوں نے کہا کہ اسے بنائے گا جو زمین میں فساد برپا کرے اور خونریزی کرے جبکہ ہم تیری تسبیح اور تقدیس کرتے ہیں تو ارشاد ہوا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو (بقرہ:۳۰)"۔

یہ آیت ہمیں اجتماعی تحلیل تابناک، دقیق اور عمیق عناصر کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ہم ان عناصر پر بحث کریں گے اور انکے درمیان موازنہ قائم کریں گے تاکہ آخر میں ہم یہ جان جائیں کہ دین قانون تاریخ کا جز ہے اور یہ تنہا ایک حکم شریعت نہیں ہے کہ جو جب چاہے اسکی اطاعت کرے اور جب چاہے اسکی نافرمانی کرے۔

روز سہ شنبہ ۱۰ جمادالاول ۱۳۹۹ھ۔

درس ہشتم

اعوذباللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وافضل الصلوات علی سیدالخلق محمدوعلی الھداۃ المیامین من آلہ الطاھرین.

قرآن میں عناصراجتماعی:۔

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا کہ قرآن کریم میں دین کوایک سادہ اورشرعی حکم کے طور پر پیش نہیں کیا گیا بلکہ اسے تاریخ اورحیات کےقوانین میں سے ایک قانون اورتخلیق الٰہی کی بنیادی اساس کےطور پرپیش کیا گیا ہے جس میں کسی قسم کی تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے۔لیکن یہ قانون تیسری شکل کا قانون ہے جومختصرعرصہ کیلئے چیلنج کوقبول کرتا ہےلیکن بعد میں خود قانون تاریخ چیلنج کرنے والے کوسزا دیتا ہے۔ اورآیت کریمہ کہ جس میں صریحاً دین کوقوانین تاریخ میں سے ایک قانون بتایاہے اسی آیت میں اس خاصیت کی طرف بھی اشارہ ہواہے:

﴿فاقم وجھک للدین حنیفاًفطرت اللہ التی فطرالناس علیھالاتبدیل لخلق اللہ ذٰلک الدین القیم ولکن اکثرالناس لایعلمون ﴾''آپ اپنے رخ کودین کی طرف رکھیں اورباطل سے کنارہ کش رہیں کہ یہ دین وہ فطرت الٰہی ہےجس سےاس نے انسانوں کوپیدا کیاہےاورخلقت الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی ہے یقیناًیہی سیدھااورمستحکم دین ہےمگرلوگوں کی اکثریت اس بات سے بالکل بےخبر ہیں''(روم/۳۰)اس آیت میں آخری جملہ اس کی طرف اشارہ ہے کہ یہ قانون تیسری شکل میں ہے یعنی اس قانون کے بارے میں بعض لوگوں کومنفی رویہ اپنانے کی گنجائش موجود ہے وہ اس قانون کونظرانداز کرسکتے ہیں

لیکن یہ نظرانداز کرنامختصرمدت کیلئے ہےزیادہ عرصہ کیلئےنہیں ہوسکتا۔

عرض ہواکہ قوانین تاریخ میں سےاس قانون قرآنی کی توضیح کیلئےہمیں اجتماع کی عناصرترکیبی کا تجزیہ اورتحلیل کرنے کی ضرورت ہے،قرآن کریم کےنقطہ نظرسےاجتماع کے عناصرترکیبی کیا ہیں؟مرکب اجتماعی کے بنیادی عناصر اورضروریات کیاہیں؟ان عناصراوربنیادی ضروریات کے درمیان کیسے ترکیب ہوگی؟کس دائرہ میں ہوگا؟اورکس قوانین کےتحت ہونگے؟

ان سب کا جواب ہم قرآن کریم کی اس آیت سے حاصل کرسکتے ہیں جس میں انسان اول کی خلقت کاذکرہواہے:**﴿واذقال ربک للملٰٓئکۃ انی جاعل فی الارض خلیفۃً قالوااتجعل فیھامن یّفسد فیھاویسفک دمآء ونحن نسبح بحمدک ونقدس لک قال انی اعلم مالاتعلمون ﴾**''اےرسول!اس وقت کویادکروجب تمہارے پروردگارنے ملائکہ سے کہاکہ میں زمین میں اپناخلیفہ بنانے والاہوں اورانھوں نے کہاکہ اسے بنائے گاجوزمین میں فساد برپاکرے گااورخونریزی کرے گاجبکہ ہم تیری تسبیح اورتقدیس کرتے ہیں توارشادہواکہ میں وہ جانتاہوں جوتم نہیں جانتے ہو'' (بقرہ/۳۰)جب ہم اس آیت کریمہ میں غوروغوض کیلئے اس میں وارد ہوتے ہیں تو ہمیں ملتا ہے کہ خداوندسبحانہ نے ملائکہ کوخبردی کہ وہ اس زمین پرایک معاشرہ قائم کرنے والا ہےایک معاشرہ ایجادکرنے والا ہےلیکن اس اجتماع کےعناصرکیا ہونگے جسے ہم قرآنی عبارت سے خلاصۃً لے سکتے ہوں کہ جواس عظیم حقیقت کے بارے میں گفتگوکریں؟یہاں تین عناصرملتے ہیں جسےہم قرآنی عبارت سےخلاصۃً اخذکرتے ہیں:

۱۔انسان ہے۔

۲۔زمین ہے یاعام طبیعت ہے:**﴿انی جاعل فی الارض خلیفۃً ﴾**پس یہاں پرزمین اورعام طبیعت اورانسان ہے کہ جسے خداوندسبحان نے اس زمین پرقراردیا ہے۔

۳۔تعلقات اور معنوی ارتباط ہے۔

جو انسان کا زمین سے یا طبیعت سے اور دوسری طرف سے اس کا اپنے جیسے انسانوں سے ارتباط ہے۔اس معنوی ارتباط کو قرآن کریم نے استخلاف کہا ہے۔یہی اجتماع اور معاشرہ کے عناصر ہیں: انسان ،طبیعت اور معنوی ارتباط جو ایک طرف سے انسان اور طبیعت کے درمیان ہے اور درسری صورت میں انسان کا اپنے جیسے انسان سے۔اور یہ وہی ارتباط ہے جسے قرآن کریم نے استخلاف کہا ہے۔

جب ہم انسانی اجتماعات کو ملاحظہ کرتے ہیں تو پہلے اور دوسرے عنصر میں سب کو مشترک پاتے ہیں یعنی ہمیں کوئی ایسا معاشرہ نہیں ملے گا جس میں انسان دوسرے انسان کے ساتھ زندگی نہ گزارتا ہو یا کوئی ایسا اجتماع نہیں ملے گا جہاں زمین اور طبیعت نہ ہو جس میں انسان اپنا اجتماعی کردار ادا نہ کر رہا ہو لہٰذا تمام بشری اور تاریخی اجتماع میں یہ دو عناصر متفق ہیں۔

لیکن تیسرا عنصر وہ تعلقات یا روابط ہیں جیسا کہ بیان ہوا کہ ہر معاشرہ میں کوئی ربط و ارتباط پایا جاتا ہے لیکن ہر معاشرہ ان تعلقات اور ارتباط کے طبیعت کے لحاظ سے مختلف ہیں یا ان تعلقات کی کیفیت کے لحاظ سے مختلف ہے۔ پس ان عناصر مجتمع میں یہی تیسرا عنصر لچکدار اور متحرک ہے۔اس معنوی ارتباط کو سارے اجتماعات اور معاشرے اپناتے ہیں کہ جس میں ایک طرف سے انسان کا انسان سے رابطہ ہے اور دوسری طرف سے انسان اور طبیعت کے درمیان یہ رابطہ پایا جاتا ہے ۔اجتماعات اور معاشروں میں اس ارتباط کو اپنانے کے طور وطریقہ میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

تعلقات اور انکی نوعیت و کیفیت

یہ تعلقات جو کہ تیسرا عنصر ہے یہ وہ عنصر ہے جس میں اجتماعات کو ترکیب دینے کے لحاظ سے لچک اور متحرک ہوتا ہے۔اس عنصر کے دو بنیادی نمونے ہیں۔

ایک صیغہ رباعیہ یعنی چار رُخ ہیں اور دوسرا صیغہ ثلاثیہ یعنی تین رُخ ہیں۔صیغہ

رباعیہ یعنی چار رخ وہ صیغہ ہے جس کی وجہ سے طبیعت انسان اور انسان کا انسان کے ساتھ رابطہ قائم ہوتا ہے یہ تین رخ ہیں پس رابطہ جب ایک اور صیغہ کو اپنایا کہ جو ان تینوں اطراف کو آپس میں ارتباط دیتا ہے اور وہ تین اطراف یہ ہیں: طبیعت ،انسان ،انسان کا اپنے جیسے انسان سے رابطہ لیکن اس رابطہ میں چوتھے فریق کو بھی تسلیم کرنے کے بعد یہ صیغہ رباعیہ بنتا ہے۔یہ چوتھا رُخ ان تین اطراف میں ربط قائم کرتا ہے اور یہ تینوں اطراف خود اس چوتھے عنصر کی ضرورت اور اہمیت کو حتمی گردانتے ہیں۔اجتماعی ارتباط کیلئے یہ چوتھا رخ ہے لیکن یہ چوتھا رُخ اس اجتماعی عنصر کے اندر نہیں ہے بلکہ یہ ان عناصر کے دائرے سے باہر ہے۔بے شک وہ اس اجتماع سے باہر ہے لیکن یہ ان عناصر کی اساس اور بنیاد ہے اجتماعی ارتباط کا یہ صیغۂ رباعی کہ جس کے چار رخ ہیں قرآن کریم نے استخلاف کے نام سے پیش کیا ہے۔

استخلاف قرآن کریم کے نقطہ ونظر سے اجتماعی رابطہ ہے۔ جب ہم استخلاف کا تجزیہ وتحلیل کرتے ہیں تو ہمیں یہ چہار رخ میں نظر آتے ہیں۔ کیونکہ استخلاف میں ایک مستخلِف کا ہونا ضروری ہے۔ پس ضروری ہے استخلاف میں یہ تین پائے جائیں : مستخلِف ،دوسرا مستخلَف اور تیسرا مستخلف علیہ۔ پس یہاں انسان اور اس جیسا انسان ، اور طبیعت کے علاوہ طبیعت اور تکوین میں چوتھا رخ بھی نظر آتا ہے۔ ایک وہ استخلاف کا رابطہ ہے اور یہ رابطہ مستخلِف ہے کیونکہ بغیر مستخلِف کے کوئی استخلاف پایا نہیں جاتا۔ پس مستخلِف خدا ہے، مستخلَف انسان یا کُلّ انسانیت ہے، مستخلف علیہ زمین اور جو کچھ اس پر اور اس میں ہے وہ ہیں.

پس صیغہ استخلاف کے ضمن میں اجتماعی تعلق کے چار رُخ ہیں۔ یہ صیغۂ رباعیہ زندگی اور کائنات کے بارے میں ایک خاص نقطہ نظر رکھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کائنات کا کوئی مالک نہیں ،کوئی معبود نہیں سوائے خداوند سبحانہ کے۔ انسان کا اس زمین پر کردار استخلاف اور استیمان کا کردار ہوگا وہ جو بھی تعلق اس زمین یا اپنے جیسے انسان سے قائم کرے گا۔ وہ مالک یا مملوک کا نہیں ہوگا بلکہ اس چہار گوشہ کے تحت اسکا کردار امین کا ہوگا۔

ہر وہ تعلق جو وہ زمین اور انسان سے قائم کرے گا وہ اسی حقیقت اور روح کے تحت ہوگا۔یعنی انسان کے پاس امانت ہے خواہ کوئی انسان کتنی ہی طاقت وقدرت کا حامل کیوں نہ ہو اسکے تعلقات اسی استخلاف کے تحت ہونگے یعنی یہ تعلقات فرض اور ذمہ داری سے متعلق ہیں نہ کہ آقایت اور الوہیت جیسے۔

عناصر اجتماعی کی یہ چار رخ والی شکل جسے قرآن کریم نے استخلاف کا نام دیا ہے اسکا کائنات اور زندگی کے ساتھ ایک خاص ربط ہے۔لیکن اس کے مقابل میں اجتماعی رابطہ کیلئے تین رُخ والا ایک صیغہ پاتے ہیں۔ یہ وہ صیغہ ہے جو انسان کا انسان سے اور طبیعت سے ربط دیتا ہے لیکن اس میں تین اطراف کا چوتھے طرف سے رابطہ منقطع ہے، یہاں اجتماعی ارتباط چوتھے رُخ کی ترکیب سے خالی ہے یعنی خدا سے رابطہ نہیں ہے اسی وجہ سے اس ترکیب اور اس صیغہ میں ہر جزء کی نظر دوسرے جزء کے نظر سے مختلف ہے۔اور یہاں سے ہی اقسام و انواع ملکیت، سیادت و آقایت نمودار ہوتی ہیں۔اور مختلف شکلوں میں انسان کا انسان پر آقایت آئی جسے تاریخ نے اس وقت پیش کیا ہے جب انسان نے اس چوتھے رکن کو عناصر اجتماعی سے نکالا یا معطل رکھا اور یہ فرض کرنے لگا کہ انسان ہی نقطہ آغاز ہے تو یہاں اس تین رخ والی شکل نے مختلف قسم کی ملکیت اور سربراہی قائم کی۔

اگر ہم ان دو شکلوں یعنی چہار رخ اور تین رخ والی میں دقت سے موازنہ کریں تو اس تین رخ والی شکل پر چوتھے رکن کا اضافہ ایک عددی اضافہ نہیں ہے یہ صرف ایک رُخ کا باقی اطراف کی طرف اضافہ نہیں ہوگا بلکہ یہ اضافہ اجتماعی تعلقات کی بنیاد پر ایک نئی نوعیت کا تغیر پیدا کرے گا اور خود اس ثلاثی ترکیب میں بھی تغیر آئیگا یہ صرف تین میں ایک اور کا اضافہ کرنا نہیں ہے بلکہ یہ ایک واحد جو ان تین میں اضافہ ہوتا ہے یہ ان تین کی روح کو ایک نیا مفہوم دیتا ہے۔اس چہار اطراف والے تعلقات میں بنیادی تغیر لائے گا جیسا کہ ہم نے دیکھا۔کیونکہ اس صورت میں انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ اس استخلاف میں صرف شریک ہیں۔جتنی بھی دولت وثروت انکے ہاتھوں میں ہے وہ امانت قرار پائے گی۔

اس صورت میں طبیعت اپنی تمام حیثیت (اس کے اندر جتنا مال و دولت ہے اور اس کے اوپر جتنے ذوی العقول اور غیر ذوی العقول ہیں سب) صرف ایک امانت ہیں تو اس کے واجبات کی رعایت کریں اور حقوق کو ادا کریں۔

تو اس وقت ہمارے پاس تعلقات اجتماعی کے لئے دو شکلیں موجود ہیں ایک چہار گوشہ اور دوسرا تین گوشہ۔اور قرآن کریم نے اس چہار رخ والی شکل کی تصدیق کی ہے جیسا کہ آیت کریمہ میں ہم نے دیکھا استخلاف اجتماعی تعلقات کیلئے چار گوشہ والا صیغہ ہے لیکن قرآن کریم نہ صرف اس صیغہ رباعی کی تصدیق کرتا ہے بلکہ اس کو قوانین تاریخ میں سے ایک قانون جانتا ہے جیسا کہ آپ نے پہلے والی آیت میں دیکھا کہ کس طرح دین کو قوانین تاریخ میں سے ایک قانون گردانا ہے اسی طرح اس چار رخ والی شکل معتبر سمجھا ہے یہی زندگی میں دین کی شکل ہے رابطہ کے چار رُخ والے اس صیغہ کو قوانین تاریخ میں سے ایک قانون قرار دیا ہے۔کیسے؟

استخلاف قوانین تاریخ میں سے ایک قانون:۔

یہ جو چار رخ والی شکل قرآن نے پیش کی ہے اسکی دو صورتیں ہیں۔ایک دفعہ یہ پیش ہوا ہے اس اعتبار سے کہ اس کا فاعل رب ہے یعنی اس کے عطاء کرنے میں خداوند سبحان کا کردار ہے اور یہی ہے جسے ہم اس آیت میں پڑھتے ہیں: ﴿**انی جاعل فی الارض خلیفہ**﴾ یہ وہ چار رُخ والا ارتباط ہے جو اس نص قرآن میں عرض ہوا ہے۔ اس اعتبار سے کہ اس عطاء خدا کی طرف سے ہے انسان کیلئے رب العالمین کی طرف سے مثبت اور اعزازی کردار پیش ہوا ہے:

﴿**انا عرضنا الامانة علی السمٰوٰت والارض والجبال فابین ان تحملنها واشفقن منها وحملها الانسان انه کان ظلوماً جهولاً**﴾ ’’بیشک ہم نے امانت کو آسمان، زمین اور پہاڑ سب کے سامنے پیش کیا اور سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور خوف ظاہر کیا بس انسان اس بوجھ کو اٹھالیا کہ انسان اپنے حق میں ظالم اور نادان

ہے‘‘(احزاب/۷۲)

اس امانت کو قبول کرنے سے مراد خلافت کو قبول کرنا ہے یعنی خلافت الٰہی کو قبول کرنا ہے خلافت یہی امانت کا وجہ فاعلی اورعطائی ہے ،امانت اورخلافت سے مراد وہی استخلاف ہے استئمان اور بوجھ اٹھانا ہے جو کہ صیغہ رباعی ہے ۔ یہ صیغہ رباعی کو ایک دفعہ ہم اس کا فاعل کے ساتھ ربط ہونے کے زاویہ سے ملاحظہ کرتے ہیں اور فاعل سے مراد خداسبحان ہے جو اس قول میں ذکر ہوا ہے ﴿**انی جاعل فی الارض خلیفه**﴾ اور دوسری دفعہ ہم اسے قبول کرنے کے زاویے سے دیکھتے ہیں جیسا کہ فلاسفہ کہتے ہیں ۔ اورانسان کا اس خلافت کو قبول کرنے امانت کو اٹھانے میں کردار کے زاویہ سے ملاحظہ کرتے ہیں اس کا ذکر اس قول خداوند سبحان میں ہوا ہے: ﴿**انا عرضنا الامانة علی السمٰوٰت والارض والجبال**﴾ کہ جب یہ امانت انسان کے سامنے پیش کی گئی تو اس نے اسے قبول کیا اور اسے تحمل کیا۔اسے آپ امانت کہیں یا خلافت البتہ یہ چاررخ والی شکل ہے۔ یہ امانت جو خدا نے انسان کے سامنے پیش کی اسے بطور تکلیف شرعی پیش نہیں کیا (یعنی انسان سے یہ نہیں کہا اس کو اٹھائیں تو آپ کی مرضی ہے اوراگر نہ اٹھائیں تب بھی آپ کی مرضی ہے ۔ازمترجم)اورنہ ہی طلب کی صورت میں پیش ہوا ہے ۔انسان کیلئے پیش ہونے سے مراد یہ نہیں کہ تکلیف اورطلب کی صورت میں پیش ہوا ہے اورقبول امانت سے مراد یہ نہیں ہے کہ اس خلافت کو امتثال اوراطاعت کی شکل میں قبول کیا ہو۔ایسا پیش ہونا اورایسا قبول کرنا مقصود نہیں ہے۔ایسا نہ ہونے کیلئے قرینہ یہ ہے کہ اس امانت کو پہاڑوں اورآسمان وزمین کے سامنے پیش کیا گیا یقیناً ایسی تکلیف انھیں پیش نہیں کی جاتی ۔ یہاں سے ہم سمجھتے ہیں کہ یہ پیش کرنا تکوینی ہے نہ کہ تشریعی ۔ یہاں پیش کرنے سے مراد عطیہ ربانی ہے جو ایک قبول کرنے کی صلاحیت رکھنے والی جگہ کیلئے ہے جو اس تکلیف سے طبیعت ،فطرت ،تاریخ اورکائناتی ترکیب میں مطابقت اورہم آہنگی رکھتی ہو یقیناً پہاڑ اس کو اٹھانے کی صلاحیت نہیں رکھتے زمین وآسمان اس مربع روابط اجتماعی سے علائم اورمناسبت

نہیں رکھتے۔

یہ انسان وہ واحد موجود جو اپنی ترکیب اورساخت کے حوالہ سے اورفطرت اللہ (کہ جسے ہم نے پہلی آیت میں پڑھا) کے حوالہ سے اس اجتماعی رابطہ (کہ جس کے چار گوشے ہیں) سے علائم اورمناسب ہے امانت اورخلیفہ بن گیا ہے۔

پس یہاں پیش کرنا بھی تکوینی ہے اوراسکا قبول کرنا بھی تکوینی ہے ۔یہی ہے قانون تاریخ کا معنی یعنی یہ چارُرخ والا اجتماعی رابطہ انسان کے تکوین اورانسان کے تاریخی اورطبیعی راستہ میں داخل ہے۔

استخلاف تیسری شکل میں قانون ہے:۔

ہم نے ملاحظہ کیا کہ اس آیت کریمہ میں اس قانون تاریخی کی شناخت کی طرف بھی اشارہ ہوا ہے کہ یہ قانون ہے تیسری شکل میں یعنی اس قانون کو چیلنج کیا جاسکتا ہے یعنی یہ قانون عصیان ونافرمانی کو قبول کرتا ہے یہ ان قوانین میں سے نہیں جو کسی صورت یا ایک لمحہ کیلئے بھی چیلنج کو قبول نہ کرتا ہو، یہ ایک قانون ہے، ایک فطرت ہے لیکن یہ قانون اورفطرت چیلنج قبول کرلیتا ہے ،قرآن کریم نے اس کو قوانین تاریخ میں سے ایک قانون ہونے کی وضاحت کرنے کے بعد اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہے فرمایا ہے : ﴿**وحملها الانسان انه کان ظلوماً جهولاً**﴾ یہ آخری جملہ ﴿**انه کان ظلوماً جهولاً**﴾ جو آیا ہے یہ اس قانون کی کیفیت کے بارے میں تاکید ہے۔ یہ قانون بالجملہ قوانین تاریخ میں سے ایک قانون ہے لیکن چیلنج قبول کرلیتا ہے۔ یہ قانون اس کو قبول کرلیتا ہے کہ انسان اس بارے میں منفی موقف اختیار کریں یہ تعبیر اس تعبیر کی طرح ہے جو پہلی آیت میں ذکر ہوئی تھی: ﴿**ولکن اکثرالناس لایعلمون**﴾ اب ہم پہلی آیت سے یہ خلاصہ کے طور پر بیان کرسکتے ہیں کہ دین زندگی اورتاریخ کے قوانین میں سے ایک قانون ہے اوراس آیت سے یہ خلاصہ کرسکتے ہیں کہ زندگی کیلئے دین کی شکل (کہ اس حیاۃ سے مراد چارُرخ والا اجتماعی رابطہ ہے)اجتماعی رابطہ کہ جس کے چارُرخ ہیں کہ جسے قرآن نے

خلافت، امانت اور استخلاف نام دیا ہے مفہوم قرآن کریم کے تحت یہ اجتماعی تعلق کا کردار بھی قوانین تاریخ کے ایک قانون کی طرح ہے۔

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پہلی اور دوسری آیت دونوں اپنے مفاد میں آپس میں مطابقت رکھتی ہیں کیونکہ پہلی آیت میں فرمایا ہے: ﴿**فاقم وجھک......الدّین القیم**﴾ یہاں دین کو قیم سے موصوف کیا گیا ہے اور یہ دین کے فطری ہونے پر تاکید ہے اور جو انسان کی خلقت ترکیب اور تاریخی رُخ میں داخل ہے۔ وہی دین قیم ہے یعنی یہ دین کا نگہبان ومحافظ ہے۔ اس آیت کا خلاصہ دین کا قیوم ونگہبان ہونا ہے۔ یہ دین میں قیومیت اس آیت میں وہی چار رُخ والے اجتماعی تعلق کا مجمل ہے جو کہ دو آیتوں میں ذکر ہوا: ﴿**انی جاعل فی الارض خلیفه**﴾ اور آیہ: ﴿**اناعرضناالامانة علی السماوات والارض**﴾ پس اس وقت دین حیات اور تاریخ کا قانون ہے جو اپنی جگہ قیم ہے اور دین قیمّ وہی چار رُخ والی اجتماعی تعلق ہے جس میں اللہ چوتھے رُخ کے حساب سے داخل ہے تا کہ اس تعلق کی بنیاد میں تغیر لائیں نہ کہ صرف عددی اضافہ ہو۔

یہ تھے وہ قرآنی مفاہیم کہ ان آیات سے ہم نے قانون تاریخ کو خلاصہ پیش کیا لیکن کیسے؟ ہم چاہتے ہیں کہ اس قانون کو بہتر اور وسیع انداز میں جان لیں ایک قانون ہونے کے ناطے تاریخ کا کیا کردار ہے، دین کا کیا کردار ہے، محافظ اور نگہبان دین کا کردار، خلافت اور امانت کا کردار، چارُخی اجتماعی تعلق کا کیا کردار ہے، چوتھے رُخ کا کیا کردار ہے، چوتھے رُخ کا قوانین تاریخ کی طرح ایک قانون ہونے کی حیثیت سے کیا کردار ہے، یہ چوتھا رُخ قوانین تاریخ کی طرح کا قانون کیسے ہے اور یہ کیسے قوانین تاریخ کی طرح قانون ہوگیا اور انسان کو میدان تاریخ کے راستہ پر رکھنے کے لئے کیسے یہ بنیادی ضروریات میں سے ہیں؟

ان کو جاننے کے لئے اجتماعی تعلق کے دو ثابت رکن کو جاننا ہوگا۔ اجتماعی تعلق میں دو رکن ہیں۔ پہلا انسان اور اس جیسا انسان ہے اور دوسرا طبیعت کائنات اور زمین ہے۔

یہ دو رکن تین رُخ والے میں بھی ہیں اور چار رخ والے میں بھی ہیں اسی وجہ سے ہم نے انھیں اجتماعی تعلق میں ثابت رکن نام رکھا ہے۔ ہمیں جدید رکن کو سمجھنے اور اجتماعی تعلق کی ترکیب میں اللہ سبحانہ کے کردار کو سمجھنے کیلئے ہمیں پہلے ان دو ارکان کو سمجھنا ہوگا۔

قرآنی نقطہ نظر سے تاریخ کی کارکردگی میں انسان کا کیا کردار ہے، قرآن کے نقطہ نظر اور قرآن سے فہم ربانی کے زاویہ سے تاریخ اور قانون حیات میں انسان کا کیا کردار ہے؟ انسان کا اجتماعی تعلقات میں کیا کردار ہے؟ اور طبیعت کا ان تعلقات کے بارے میں کیا کردار ہے؟

ان دو کرداروں کی تشخیص اور ان کے موقف معین ہونے کے بعد اس جدید رُخ کا کردار واضح ہوگا۔ چوتھے رُخ کا کردار کہ جس سے صیغہ رباعی صیغہ ثلاثی سے ممتاز ہوتا ہے اور یہ واضح ہوگا کہ یہ چوتھا رُخ قانون تاریخ اور خود انسان کی خلقت کے حوالہ سے ایک ضروری عنصر ہے۔ ضروری ہے کہ یہ رُخ دوسرے اطراف کے ساتھ درج ہو۔ تا کہ اجتماعی تعلق کے چار رُخ ہو جائیں۔

اس وقت قانون تاریخ سمجھنے کیلئے ہمیں قرآنی نقطہ نظر سے تاریخ کی کارکردگی میں انسان اور طبیعت کے کردار کے بارے میں گفتگو کرنا چاہئے یہ انشاءاللہ ہم آگے چل کر بیان کرتے ہیں۔

روز چارشنبہ ۱۱ جمادالثانی ۱۳۹۹ھ۔

درس نہم

اعوذباللّٰہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم
الحمدللّٰہ رب العالمین وصلی اللّٰہ علی محمدوعلی المیامین
من آلہ الطاھرین

تاریخی گردش میں انسان کا کردار:۔

عرض ہوا: تاریخ کی گردش اورانسان کی اجتماعی مسیر میں دین کے کردار کا حقیقی ابعاد کشف کرنا صیغہ میں موجوددوثابت رکن کو سمجھنے پر موقف ہے ۔ وہ دو رکن انسان اور طبیعت ہیں ۔ہم پہلے قرآنی نقطہ ٔ نظر سے تاریخی گردش میں انسانی کردار کو واضح کریں گے۔

انسان ہی حرکت تاریخ کی بنیاد ہے:۔

سابقہ دروس کی روشنی میں یہ بات واضح ہوئی ہے کہ انسان یا اسکی داخلی کیفیات ہی حرکت تاریخ کی بنیاد ہیں اور ہم نے یہ بھی ذکر کیا کہ حرکت تاریخ دوسری حرکات سے مختلف ہے ۔حرکت تاریخ ایک حرکت غائی ہے۔تنہا حرکت ہی نہیں یعنی صرف اپنے سبب سے جڑی ہوئی نہیں ہے فقط ماضی سے جڑی ہوئی نہیں ہے، بلکہ حرکت تاریخ اپنی غایت سے بھی جڑی ہے، کیونکہ حرکت تاریخ علت غائی رکھتی ہے۔حرکت تاریخ کا ایک ہدف ہے جو مستقبل کی طرف دیکھتا ہے۔لہٰذا مستقبل ہی اسکا محرک ہے۔تاریخ کی ہر قسم کی سرگرمی اس مستقبل سے وابستہ ہے۔ مستقبل ابھی ناپید ہے لیکن وجود ذہنی کے درمیان سے کہ جہاں مستقبل نقش بستہ ہے حرکت دیتا ہے۔

پس وجود ذہنی ہی حرکت تاریخ کا محرک اورسبب ہے اورحرکت تاریخ اسی وجود

ذہنی کے گرد حرکت کرتی ہے ۔ یہ وجود ذہنی انسان کے فکر سے ہے اور یہ فکر اسکے ہدف کے تصور سے پیدا ہوئی ہے اور دوسری طرف سے وجود ذہنی طاقت اورارادہ کا مجسم ہے وہ ارادہ جو اس انسان کو اس ہدف کی طرف حرکت دلاتا رہا ہے اور اسکے اندر سرگرمی پیدا کررہا ہے اس وقت یہ وجود ذہنی جو کہ مجسم ہے مستقبل کا محرک ہے۔کبھی فکر سے تعبیر ہوتا ہے کبھی ارادہ سے تعبیر ہوتا ہے اور فکراورارادہ کے مل جانے سے اجتماعی میدان میں مستقبل کا فاعل اورتاریخی سرگرمی میں اس کا محرک بن جاتا ہے۔

انسان کی داخلی کیفیات ہی اجتماعی تغیر کی بنیاد ہیں: یہ دونوں حقیقت یعنی فکر و ارادہ انسان کا داخلی تصور ہیں اور انسان کے اندر یہ داخلی تصوران دو بنیادی رکن کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔یعنی فکروارادہ انسان کی وہ داخلی کیفیات ہیں جو یہ اہداف وغایات بناتا ہے فکر وارادہ مل کر یہ اہداف تشکیل پاتے ہیں۔

یہاں سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ انسان کا داخلی کیفیات ہی حرکت تاریخ کی بنیاد ہے اس اجتماع میں موجود نظام ہے۔افکار،تعلقات اور تفاصیل سمیت ان سب کی بنیاد انسان کی داخلی کیفیات ہیں۔اس اوپر کی عمارت کا انسان کے داخلی کیفیات کی بنیاد سے رابطہ ہے۔اس عمارت کی ترقی اور تغیر اس بنیاد کی تغیراورترقی کی تابع ہے۔جب بنیاد میں تغیر آئے تو عمارت کے اوپر کے حصہ پر بھی تغیر آئے گی اور جب بنیاد ثابت ہو تو عمارت کا اوپر کا حصہ بھی ثابت رہے گا۔

پس انسان کے داخلی محتوی (وہ چیزیں جو انسان کو گھیرے ہوئے ہیں)اوراجتماع کے تاریخی اورفوقانی عمارت میں ارتباط ہے، یہ تابع اور متبوع کا رابطہ ہے،سبب اورمسبب کا رابطہ ہے،(یعنی تابع اپنے متبوع اورمسبب کا اپنے سبب سے رابطہ ہے)۔یہ تعلق قانون تاریخ کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جس کے بارے میں بحث خداوند کی اس قول میں بیان ہوئی ہے:﴿**ان اللّٰہ لایغیر مابقومٍ حتّٰی یغیروامابانفسھم واذآاراداللّٰہ بقومٍ سوٓءً افلامردلہ ومالھم من دونہٖ من والٍ**﴾’’اللہ کسی قوم کا حال یقیناً اس

وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلے اور جب اللہ کسی قوم کو برے حال سے دوچار کرنے کا ارادہ کرلے تو اس کے ٹلنے کی کوئی صورت نہیں ہوتی اور نہ ہی اللہ کے سوا ان کا کوئی مددگار رہتا ہے" (رعد/۱۱) جو مفہوم ہم نے پیش کیا ہے یہ آیت اسکی روشن اور واضح دلیل ہے اوپر کی عمارت میں تغیر لانے حرکت تاریخ کا بنیاد انسان کا داخل ہے یہ آیت کریمہ دو تغیر کو بیان کرتی ہے ایک قوم کا تغیر جو ان الفاظ میں ہے: ﴿ان اللّٰہ لایغیر مابقومٍ﴾ خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنی حالت کو نہ بدلے، یعنی قوم کے حالات بدلنا، اوضاع بدلنا قوم کی ظاہری عمارت میں تبدیلی، ظواہر قوم میں تبدیلی ان سب میں تبدیلی نہیں آسکتی جب تک خود ان کے اندر تبدیلی نہ آئے۔

لہٰذا جو تغیر بنیاد ہے وہ قوم کے اندر کا تغیر ہے قوم کے اجتماعی اور بیرونی تغیر کا دارومدار اسکے داخلی تغیر پر ہے۔ اجتماعی، تاریخی اور نوعی تغیر اس داخلی تغیر پر موقوف ہے۔ اب یہ کہنا صحیح ہوگا: ﴿مابانفس﴾ سے مراد قوم کے اندر کا تغیر ہے یعنی ایسا تغیر آئے کہ قوم کا داخلی محتویٰ ایک قوم ، ایک امت ہو اور اس مبارک درخت کی طرح ہو جائے کہ جو ہر وقت پھل دیتا رہے ایسا تغیر آئے وگرنہ قوم کے تغیر کیلئے ایک نفر، دو نفر یا تین نفر کا تغیر کوئی مشکل کام نہیں ہے (یعنی اگر صرف ان کی وجہ سے قوم میں تغیر آتی تو سب قوموں میں آنا چاہئے تھا)۔ اما! قوم کا تغیر جو افراد کے تغیر کے تابع ہے وہ قوم کا قوم کی شکل میں تغیر ہے ، ایک امت کی صورت میں تغیر آئے، مبارک درخت کی صورت میں کہ جو ہر وقت پھل دیتا رہے، پس امت کا داخلی اور نفسی محتویٰ امت کی طرح ہی ہے نہ کہ اس فرد کا تغیر، یہ بنیادی طور پر معتبر ہے اور حرکت تاریخی میں عمارت کے فوقانی (بالائی) تغیر کے لئے ضروری ہے لیکن امت کا تغیر خود امت ہی کی شکل میں ہونا چاہئے۔

داخلی تغیر اور اجتماعی تغیر میں ارتباط:۔

اسلام اور قرآن ان دونوں عمل پر یقین رکھتے ہیں۔ ان دونوں کا ساتھ ساتھ ہونا ضروری ہے۔ یعنی ایک ایسا عمل ہے جو انسان کے اندر کو بھی بتاتا ہے اور اس کے باہر کو بھی۔ یعنی انسان کی داخلی ساخت یا نفس کی تعمیر، فکر و ارادہ کی تعمیر کے ساتھ انسان باہر کی بنیاد کا بھی خیال رکھے۔ جب داخل کی تعمیر ہو جائے تو باہر کی تعمیر کرے۔ یہ ممکن نہیں کہ باہر کی تعمیر کو اندرونی تعمیر سے جدا کریں اور اگر ایسا کریں گے تو یہ عمارت ایک متزلزل عمارت ہوگی جو ہر وقت خطرہ میں رہے گی۔ لہٰذا اسلام نے داخلی ساخت کے عمل کو اگر وہ تمام شرائط کے ساتھ وقوع پذیر ہو تو جہاد اکبر کہا ہے اور باہر کے عمل کو جو صحیح طریقہ سے انجام پائے جہاد اصغر کہا ہے اور جہاد اصغر کو جہاد اکبر سے جوڑا ہے اور کہا ہے کہ اگر جہاد اصغر جہاد اکبر سے جدا ہو تو جہاد اصغر کی حقیقت یا مقصد ختم ہو جائے گا۔ میدان تاریخ اور اجتماع میں جو حقیقی تغیر لانا چاہتا ہے اس میں وہ قدرت نہیں ہوگی۔

لہٰذا ان دونوں کو ساتھ ساتھ چلنا چاہیے اور اگر انھیں جدا کیا تو انکی حقیقت ختم ہو جائے گی۔ اسلام نے اس پہلے عمل کو جو داخل میں ہے جہاد اکبر کہا ہے اس چیز کی تاکید سے بیان کے لئے ہے کہ یہ باہر کی عمارت کی اساس اور یہ بنیاد ہے اور اس حقیقت کی وضاحت کیلئے کہ انسان کا داخلی محتویٰ ہی بنیاد ہے۔ لہٰذا اسے جہاد اکبر کہا گیا ہے اور اگر جہاد اصغر جہاد اکبر سے خالی رہا تو اس وقت یہ نیک اور صالح عمل تغیر نہیں لا سکے گا۔

قرآن کریم فوقانی کی تعمیر کو داخلی تعمیر سے جدا رکھنے کی صورت حال پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿ومن الناس من یعجبک قولہ فی الحیٰوۃ الدنیا ویشھد اللّٰہ علیٰ مافی قلبہٖ وھو الد الخصام. واذا تولیٰ سعیٰ فی الارض لیفسد فیھا ویھلک الحرث والنسل واللّٰہ لایحب الفساد﴾ "انسانوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کی باتیں زندگانی دنیا میں بھلی لگتی ہیں اور وہ اپنے دل کی باتوں پر خدا کو گواہ بناتے ہیں حالانکہ وہ

بدترین دشمن ہیں۔اور جب آپ کے پاس سے منہ پھیرتے ہیں تو زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کھیتوں اور نسلوں کو برباد کرتے ہیں جبکہ خدا فساد کو پسند نہیں کرتا ہے'' (بقرہ/۲۰۴ تا ۲۰۵)

اس آیت میں فرماتے ہیں کہ تغیر کے اس عمل کو اگر انسان کے اندر نفوذ نہیں کیا، اسکی روح کے اندر داخل نہیں ہوا اور اپنے آپ کو اگر صالح نہ کیا تو ممکن نہیں کہ اس سے اچھے کلمات نکلیں، اچھے کلمات اس وقت اجتماع کے عمارت میں صالح تحوّل اور تغییر لا سکتے ہیں جب یہ کلمات اس قلب سے نکلیں جس نے ان کلمات کے مفاہیم سے اپنے دل کی محافظت اور نگہبانی کی ہو وگرنہ کلمات صرف پوچ الفاظ ہوں گے اور ان کی کوئی حقیقت اور محتوی نہیں ہوسکتا۔ پس یہ قلب ہے جو کلمات کو اپنا اصلی معنی ومفہوم بخشتا ہے نعروں کے حدود کو معین کرتا ہے اور اوپر کی عمارت کے عمل کے اہداف اور مسیر کو معین کرتا ہے۔

مُثُل اعلیٰ بناءِ انسان کا مبداء حرکت ہے

یہاں تک ہم پر واضح ہوا کہ تاریخ کے تغیر میں بنیادِ انسان کی داخلی کیفیات ہیں۔انسان کی یہ داخلی کیفیات اس کی بنیاد بنتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خود انسان کی اس داخلی کیفیت کی بنیاد کیا ہے؟ اس کا آغاز کہاں سے ہوا؟ انسان کی داخلی کیفیت کا محور و مرکز کیا ہے؟

انسان کی ان داخلی کیفیات کی بنیاد اور انکا محور و مرکز مثل اعلیٰ (اعلیٰ اقدار) ہیں۔
ہم نے جانا کہ انسان کی داخلی کیفیت غایات کو وجود بخشتی ہے کہ ان غایات کو اپنے وجود ذہنی (کہ جس میں ارادہ اور فکر مخلوط ہے) سے وجود بخشتا ہے۔ یہ غایات کہ جو تاریخ کو حرکت دیتی ہے اسے مُثُل اعلیٰ ہی تعین کرتا ہے۔ کیونکہ تمام غایات انسان کی فردی زندگی میں خود اس کی اور گروہ کی اپنی اجتماعی زندگی کے مُثُل اعلیٰ کی طرف نقطہ ونظر کے تناسب سے ہیں۔ یہ غایات حرکت تاریخ کی محرک ہیں لیکن خود انسان کی داخلی کیفیت کا اپنے سے بہت گہری بنیاد کا نتیجہ ہے۔ یہ انسان کی وہ اعلیٰ اقدار ہیں جن کے گرد یہ غایات گھومتی ہیں اور

اسی کی طرف تمام اہداف کی برگشت ہوتی ہے۔لہٰذا جس معاشرے کی اعلیٰ اقدار صالح، اعلیٰ وارفع اور وسیع ہونگی۔اسی تناسب سے اسکی غایات بھی ارفع واعلیٰ اور وسیع ہونگی اسی طرح جس معاشرے میں مُثُل اعلیٰ کا محور پست اور محدود ہوگا تو اس سے نکلنے والی غایات بھی پست اور محدود ہونگی۔

یہاں سے واضح ہوا کہ مُثُل اعلیٰ ہی انسانی معاشرے کی داخلی کیفیات کا نکتہ آغاز ہے۔کائنات اور زندگی کے بارے میں جو عام نقطہ ونظر ہے مُثُل اعلیٰ حقیقت میں اسی سے مربوط ہے۔ اور کائنات اور حیات سے متعلق نقطہ نظر سے بشر کی ہر جماعت کا مُثُل اعلیٰ معین ہوتا ہے اور اسی ہی کی روشنی میں ان کا مثل اعلیٰ بنتا ہے اور طاقت روحیہ کے ذریعے کہ جس کا اس مُثُل اعلیٰ سے مناسبت ہو اور اس جماعت کے کائنات اور زندگی کی طرف نقطہ ونظر کی مناسبت سے ہو تو مُثُل اعلیٰ کی طرف حرکت کا ارادہ محقق ہوتا ہے اور اس مُثُل کے راستہ پر چلنے کا ارادہ کرتا ہے۔

پس مُثُل اعلیٰ حقیقت میں کائناتی تصور سے مجسم ہوتا ہے اور طاقت روحیہ کے ذریعے سے مجسم ہوتا ہے کہ یہ طاقت روحیہ انسان کو اس مُثُل اعلیٰ کی راستے پر لے جاتا ہے۔ ہر وہ انسانی گروہ جس نے مُثُل اعلیٰ کا انتخاب کیا گویا اس نے اپنے نقطۂ نظر اور اپنے راستہ اور اس راستہ کی صعوبتوں کا انتخاب کیا ہے۔
چنانچہ معلوم ہوا کہ حرکت تاریخی حرکت غائی ہونے کی وجہ سے کائنات میں موجود دیگر حرکتوں سے الگ اور جدا ہوا اور بتایا کہ تاریخی حرکت باہدف ہونے کی وجہ سے دوسروں سے ممتاز ہوا۔اسی طرح تاریخی حرکتوں کا اپنے درمیان تمایز اور امتیاز ان کے اعلیٰ اقداروں سے بھی ہوتا ہے کیونکہ ہر تاریخی حرکت کیلئے ایک مُثُل اعلیٰ ہے اور یہی مُثُل اعلیٰ ہے جو ان حرکتوں کے غایات اور اہداف کا تعین کرتا ہیں اور یہی اہداف اور غایات انسان کو اسی مُثُل اعلیٰ کے راستہ پر چلانے کے ساتھ اس کو سرگرمی اور حرکت میں رکھتے ہیں۔
قرآن کریم اور دینی تعبیر کی روشنی میں ان مثل اعلیٰ کے لئے مختلف عبارات

استعمال ہوئی ہیں۔کبھی اسے ’’الالہ‘‘ کہا ہے اس اعتبار سے کہ مثل اعلیٰ انسان کا رہبر حاکم مطاع (جس کی اطاعت کی جاتی ہے)اور موجّہ (جس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں) ہے اورقرآن کریم نے ان صفات کو’’الالہ‘‘ کیلئے بتایاہے ۔لہٰذاجوبھی مثل اعلیٰ ہو اسے’’الہٰ‘‘ سے تعبیر کیا گیا ہے چونکہ یہی مثل اعلیٰ ہے جو کہ حرکت تاریخی کو چلاتے ہیں حتی کہ خداوندسبحان کے قول میں ذکر ہوا ہے:

﴿ارء یت من اتخذالٰھه ھوٰہ افانت تکون علیه و کیلًا﴾’’کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہشات ہی کواپناخدا بنالیا ہے کیا آپ اس کی بھی ذمہ داری لینے کے لئے تیار ہیں‘‘ (فرقان/۴۳)۔یہاں پر حتی ’’ھویٰ‘‘ سے تعبیر ہوا ہے کیونکہ جب انسان کی خواہشات اپنی طغیانی میں سعود کرتے ہوئے اوپر جاتی ہیں تو وہ انسان کی مُثل اعلیٰ بنتی ہے یہی اس فرد کی یااس فرد کی آخری مقصد ہے لہٰذا مثل اعلیٰ قرآنی اور دینی اصطلاح کے تحت یہی ’’الہٰ‘‘ کیونکہ حقیقت میں یہی اس کی معبود ہے یہی اس کا حاکم اور یہی اس کا نھی کرنے والا ہے یہی اسکا محرک ہے پس مثل اعلیٰ دین اوراجتماعی مفہوم میں وہی ’’اِلہٰ‘‘ ہے۔

مُثل اعلیٰ کی اقسام (اعلیٰ اقدار)

وہ اعلیٰ اقدار جسے انسانیت نے اپنایا ہے وہ تین قسم کی ہیں

ا۔پست اقدار

یہ وہ مثل اعلیٰ ہیں جن کا تصور ذہن سے باہر موجود حقائق سے لیا گیا ہے۔اسے انسان نے اپنے گردونواح سے اخذ کیا ہے۔یعنی وہ وجود ذہنی جس نے مستقبل کو بنایا ہے وہ اس موجود خارجی سے اوپراور آگے نہیں بڑھ سکتا بلکہ اس نے اپنی اقدار کو انھیں محدود موجودات سے وابستہ کیا ہے۔اسی کے قیوداورشیؤون سے وابستہ کہا ہے۔

جب ان اقدار کو معاشرے سے اس کی حدودوقیوداورحالات کے ساتھ لیاجاتا ہے تو اس میں تکرار ہی تکرار ہوگا دوسرے الفاظ میں یوں بتادوں کہ اس موجود حاضر کومنجمد کیا ہے اور مستقبل پر حمل کیا ہے مستقبل کی طرف آنکھیں کھولنے کے بجائے موجود حاضر پراکتفا کیا ہے یہ درحقیقت اس واقع خارج کومنجمد کرتا ہے اور درحقیقت اس وجود خارجی کوحالت نسبی اور محدودیت سے مطلق میں بدل لیا ہے کیونکہ انسان نے اسے اپناہدف اور مثل اعلیٰ قرار دیا ہے۔جب یہ اس واقع موجود کومحدود سے ہدف اور مطلق میں بدل لیااور جب ایک مطلق حقیقت کی طرف بدل لیا توانسان اس کے پیچھے کچھ نہیں دیکھتا،اسے کوئی چیز بھی نظرنہیں آتی ۔جب ایسا ہوتو تاریخ حرکت تکرارحرکت ہوگا تو اس وقت مستقبل واقع کا ہی تکرار ہوگا اور چونکہ یہ موجود محسوس حالت سابقہ کی تکرار ہے لہٰذا مستقبل موجود محسوس اور ماضی کی تکرار ہوگا اس قسم کے ’’اِلہٰ‘‘ (اقدار) موجود محسوس کومنجمد کرتا ہے اوراس کی نسبی حالات کومطلق حالات میں بدل لیتا ہے تا کہ وہ حالات سے تجاوز نہ کرے اور اپنی خواہشات کواس سے زیادہ طلب نہ کرنے دے۔

پست اقدار اپنانے کی وجوہات:۔

ا۔الفت اور عادت:

پہلاسبب محبت، عادت ،خاموشی اور ضائع ہونا، یہ نفسی سبب ہے محبت خاموشی اورضائع ہونانفسی سبب ہے۔ اس قسم کے خیالات اگر کسی معاشرے میں پھیلیں خاموشی ،احساس کمتری ،محبت ،اورضائع ہونے کے یہ حالات اگر کسی قوم میں یامعاشرے میں پھیلیں تو وہ معاشرہ منجمد ہوگا کیونکہ اس معاشرے نے اپنی اقدار کوانہی حالات سے ماخوذ کیااس محدود محسوس نسبی کوانھوں نے حقیقت مطلقہ (ہمیشہ رہنے والی حقیقت) میں بدل لیاہے ۔اسے مُثل اعلیٰ میں بدل لیاہے اس کوایسا ہدف اورمقصد بنایاہے کہ اس کے پیچھے اسے کوئی چیز نظر نہیں آتی ..

یہ وہ اقدار ہیں جن کوقرآن کریم نے بہت سی آیات میں گذشتہ اقوام کی زبان سے نقل کیا ہے جنہوں نے انبیاء کی دعوت کا مقابلہ کیا۔ جب انبیاء ان معاشروں میں موجودمحسوس سے بلند حقیقی اعلیٰ اقدار لے کرآئے تاکہ انھیں پستی سے نکالیں ،انھیں موجود پست حالات سے نکالیں ،تو یہ اجتماع انکی مخالفت پراتر آئے۔ یہ وہی اجتماع ہیں جن میں موجودہ حالات کی الفت ،اپنی عادات اوراحساس کمتری غالب تھی۔ وہ اسے ایک بڑی چیز سمجھتے تھے۔ان لوگوں نے انبیاء کی دعوت کومسترد کیا اور کہا کہ ہمنے اپنے آباؤ اجداد کوانھی طریقوں پر پایاہے اورانہی رسم ورواج میں پایاہے۔

اورہم ان کے اقدار سے متمسک رہیں گے۔موجودمحسوس ان کے اذہان میں راسخ تھیں ان اقدار نے انکے داخل اوراحساسات میں نفوذ کیاہوا تھا یہاں تک کہ ان اقدار کے نتیجے میں ایک انسان حِسّی (محسوسات کودرک کرنے والے) بنے۔ انسان منکرنہیں بنے ان اقدار کی وجہ سے یہ انسان اپنے روزمرہ حالات کے فرزند بنے اوراپنے زمانے کے باپ نہیں بن سکے موجودمحسوس کے فرزند بنے اس کے باپ نہیں بنے کہ اسے

تربیت دیتے ۔لہٰذا یہ اپنے حالات سے آگے نہیں بڑھ سکتے تھے اس بارے میں آئین کچھ قرآن کریم کا سنتے ہیں وہ فرماتا ہے:

﴿واذاقیل لھم اتّبعوا مآانزل اللّٰہ قالوابل نتّبع مآالفیناعلیہ اٰبآء ناولو کان ایبآؤھم لایعقلون شیئاًوّلایھتدون ﴾ ''اورجب ان سے کہاجاتا ہے کہ اللہ کے نازل کردہ احکام کی پیروی کروتو وہ جواب دیتے ہین کہ ہم تواس طریقے کی پیروی کریں گے جس پرہم نے اپنے آباء واجدادکو پایا ہے' خواہ ان کے آباء واجداد نے نہ عقل سے کام لیاہواورنہ ہدایت حاصل کی ہو'' (بقرہ/۱۷۰)

﴿واذاقیل لھم تعالواالٰی ماانزل اللّٰہ والی الرسول قالواحسبناماوجدناعلیہ اٰبآء ناولوکان اٰبآء ھم لایعلمون شیئاًولایھتدون ﴾ ''اورجب ان سے کہاجاتا ہے کہ خدا کے نازل کئے ہوئے احکام اوراس کے رسول کی طرف آؤتو کہتے ہیں کہ ہمارے لئے وہی کافی ہے جس میں ہم نے اپنے آباء واجداء کو پایاہے۔ چاہے ان کے آباء واجداد نہ کچھ سمجھتے ہوں اورنہ کسی طرح کی ہدایت رکھتے ہوں'' (مائدہ/۱۰۴)

﴿قالوآاجئتنالتلفتناعمّاوجدناعلیہ اٰبآء ناوتکون لکماالکبریآء فی الارض ومانحن لکمابمؤمنین ﴾ ''ان لوگوں نے کہا کہ تم یہ پیغام اس لئے لائے ہوکہ ہمیں باپ دادا کے راستہ سے منحرف کردواورتم دونوں کوزمین میں حکومت واقتدار مل جائے اورہم ہرگز تمہاری بات ماننے والے نہیں ہیں'' (یونس/ ۷۸)

﴿قالوایٰصٰلح قدکنت فینامرجوًّاقبل ھٰذآاتنھٰنآان نعبدمایعبداٰبآؤناواننالفی شکٍّ مماتدعونآالیہ مریب ﴾ ''ان لوگوں نے کہاکہ اے صالح اس سے پہلے تم سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں کیاتم اس بات سے روکتے ہوکہ ہم اپنے بزرگوں کے معبودوں کی پرستش کریں۔ہم یقیناً تمہاری دعوت کی طرف سے شک اورشبہ میں ہیں'' (ہود/٦٢)

﴿قالت رسلهم افی اللّٰه شک فاطر السمٰوٰت و الارض یدعوکم لیغفرلکم من ذنوبکم ویؤخرکم الیٰٓ اجلٍ مسمًی قالو آاِن انتم الابشرمثلناتریدون ان تصدوناعما کان یعبداٰبآؤنافاتونابسلطٰنٍ مبینٍ﴾ ''تو رسولوں نے کہا کہ کیا تمھیں اللہ کے بارے میں بھی شک ہے جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے اور تمھیں اس لئے بلاتا ہے کہ تمہارے گناہوں کو معاف کردے اور ایک معینہ مدت تک زمین میں چین سے رہنے دے۔تو ان لوگوں نے جواب دیا کہ تم سب بھی ہمارے ہی جیسے بشر ہو اور چاہتے ہو کہ ہمیں ان چیزوں سے روک دو جنکی ہمارے باپ دادا عبادت کیا کرتے تھے تو اب کوئی کھلی ہوئی دلیل لے آؤ'' (ابراھیم/۱۰)

﴿بل قالو آاناوجدنآاٰبآء ناعلیٰٓ امةٍواناعلیٰٓ اٰثٰرھم مھتدون﴾ ''نہیں بلکہ ان کا کہنا صرف یہ ہے کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا ہے اور ہم انھیں کے نقش وقدم پر ہدایت پانے والے ہیں'' (زخرف/۲۲)

مندرجہ بالا تمام آیات میں قرآن کریم نے انسانی معاشرے کی ان پست اقدار کو اپنانے کے اسباب اور وجوہات بیان کیں ہیں۔ یہ لوگ اپنے رسم و رواج اور عادات سے الفت رکھتے تھے ان سے مانوس تھے اور انھیں میں حل ہو چکے تھے اور اسے ایک جاوید اور باقی رہنے والی سنت قرار دے چکے تھے۔اور انھوں نے اپنے آپ کو یہ اجازت نہیں دی کہ ان سے آگے بڑھیں۔انہوں نے انہی حالات کو اعلیٰ اقدار گردانا انہی اقدار کو بنیاد بنا کر انبیاء کی دعوت کی مزاحمت کی۔ یہ تھا پست اقدار کو اپنانے کا پہلا سبب۔

۲۔دوسری بنیاد فرعونی تسلط ہے

تاریخ میں ان پست اقدار کو اپنانے کا دوسرا سبب ہمیشہ فرعونی تسلط رہا ہے یعنی یہ آمریت اور استعمار جس معاشرے پر مسلط ہوا اور جس نے اقدار پر قبضہ کیا اس نے ہر اس آنکھ پر تسلط کیا جو مستقبل کی طرف دیکھنا چاہتی تھی۔ حالات کو بدلنے کے خواہشمندوں پر تسلط قائم کیا،موجودہ حالات سے نکالنے والے افکار ونظریات پر تسلط کیا غرض ہر وہ اسباب

جو ان کی عمارت کو ڈھا دینے میں معاون ہوسکتے تھے ان پر تسلط قائم کیا۔

یہاں سے ہمیں تاریخ میں فرعونیت کی یہ مصلحت دکھائی دیتی ہے کہ وہ لوگوں کی آنکھوں کو اپنے دور تک محدود کرتے تھے پر یہ لوگ اپنے ماحول میں زندگی گزاریں، اس ماحول سے باہر نہ نکلیں۔فرعونیت چاہتی تھی کہ لوگوں کو مجوس کرے، ہر قوم کو اپنے نقطہ نظر تک محدود رکھے جس کی وجہ سے وہ قائم ہیں تاکہ امت کیلئے یہ گنجائش نہ رہے کہ وہ اعلیٰ وارفع اقدار کی تلاش کرسکے جو اسے موجودہ حالات سے نکالے اور مستقبل کی جانب راہنمائی کرے،موجودہ حالات کو بہتری میں تبدیل کرے۔ یہ انسانیت کا پست اقدار اپنانے کا اجتماعی سبب ہے نہ نفسی،خارجی سبب ہے نہ کہ داخلی،یہ بھی قرآن کریم نے پیش کیا ہے:

﴿وقال فرعون یایھاالملاماعلمت لکم من الٰہٍ غیری﴾ ''اور فرعون نے کہا: اے درباریو! میں تمہارے لئے اپنے سوا کسی کو معبود نہیں جانتا'' (قصص/۳۸)

﴿یٰقوم لکم الملک الیوم ظاھرین فی الارض فمن ینصرنامن باس اللہ ان جاء ناقال فرعون ماارٰیکم الاماارٰیٰ وماھدیکم الاسبیل الرشاد﴾ ''میری قوم والو بے شک آج تمہارے پاس حکومت ہے اور زمین پر تمہارا غلبہ ہے لیکن اگر عذاب خدا آگیا تو ہمیں اس سے کون بچائے گا فرعون نے کہا کہ میں تمھیں وہی باتیں بتارہا ہوں جو میں خود سمجھ رہا ہوں اور میں تمھیں عقلمندی کے علاوہ کسی اور راہ کی ہدایت نہیں کررہا ہوں''
(غافر/۲۹)

یہاں فرعون کہتا ہے میں تمھارے لئے وہی دیکھتا ہوں جو خود اپنے لئے دیکھتا ہوں یعنی چاہتے تھے تمام لوگ جو اس کی پرستش کرتے ہیں اسی کے نقطہ نظر کے تحت رہیں انکی نظر موجودہ حالات تک ہی رہے اور اس نظر اور اس موجود محسوس کو مطلق میں بدل لیں کہ جس سے تجاوز ممکن نہ ہو یہاں پر معاشرہ کا موجود محسوس کو مُثل اعلیٰ قرار دینے کا سبب فرعونی تسلط ہے۔فرعونیت سمجھتی ہے کہ معاشرے کا ان اقدار سے نکلنا ان کے وجود کیلئے اور ان کیلئے خطرہ ہے جسکا ذکر ان آیات میں ہے:

﴿ثم ارسلنا موسٰی و اخاہ ھٰرون باٰیٰتنا وسلطن مبین. الٰی فرعون و ملائہٖ فاستکبروا وکانوا قومًا عالین. فقالوا انؤمن لبشرین مثلنا وقومھما لنا عٰبدون. فکذبوھما فکانوا من المھلکین﴾ ''پھر ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کو اپنی نشانیوں اور واضح دلیل کے ساتھ بھیجا فرعون اور اس کے زعماء مملکت کی طرف تو ان لوگوں نے بھی استکبار کیا اور وہ تو تھے ہی اونچے قسم کے لوگ۔ تو ان لوگوں نے کہہ دیا کہ کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں جبکہ ان کی قوم خود ہماری پرستش کر رہی ہے۔ یہ کہہ کر دونوں کو جھٹلا دیا اور اس طرح ہلاک ہونے والوں میں شامل ہو گئے'' (مومنون/ ۴۵ تا ۴۷)

کہتے ہیں ہم آمادہ نہیں کہ جو اقدار موسیٰؑ و ہارونؑ لائے ہیں انکی تصدیق کریں کیونکہ موسیٰؑ و ہارونؑ کے یہ اقدار خود ان (فرعون اور اس کے زعماء) کیلئے مصیبت بن جائیں گی لہٰذا لوگوں کو موجودہ حالات تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔ اس معاشرے پر قابض یہ گروہ اپنے وجود کی ضمانت اسی میں سمجھتا ہے کہ موجود اقدار جنھیں انہوں نے اپنایا ہوا ہے محفوظ رہیں۔ یہ تھا دوسرا سبب جو ان اقدار کو اپنانے کے بارے میں قرآن کریم نے پیش کیا ہے۔

قرآن کریم نے اس قسم کی طاقت کو جو محدود موجود محسوس کو مطلق میں بدل لیتا ہے اور انسان کو ان محدود حالات سے نکلنے سے باز رکھتا ہے طاغوت کا نام دیا ہے:

﴿والذین اجتنبوا الطاغوت ان یعبدوھا وانابوا الی اللّٰہ لھم البشرٰی فبشر عباد. الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ اولٰٓئک الذین ھدٰھم اللّٰہ و اولٰٓئک ھم اولو الالباب﴾ ''جن لوگوں نے ظالموں سے علیحدگی اختیار کی کہ ان کی عبادت کریں اور خدا کی طرف متوجہ ہو گئے ان کے لئے ہماری طرف سے بشارت ہے لہٰذا پیغمبر آپ میرے بندوں کو بشارت دے دیجئے۔ جو باتوں کو سنتے ہیں اور جو اچھی بات ہوتی ہے اس کا اتباع کرتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جنہیں خدا نے ہدایت دی ہیں اور یہی

لوگ صاحبان عقل ہیں'' (زمر/ ۱۷ تا ۱۸) ملاحظہ فرمایا کہ اس آیت میں طاغوت کی عبادت سے اجتناب کرنے کی روشن بنیادی صفت بیان ہوئی ہے، وہ کونسی روشن بنیادی صفت ہے جسے قرآن کریم نے عبادت طاغوت سے اجتناب کے لئے ذکر کیا ہے؟

﴿فبشر عباد. الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ﴾ یعنی ان لوگوں نے اپنے ذہن کو طاغوت کی سوچ تک محدود نہیں رکھا ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو موجودہ حالات کی چار دیواری تک محدود نہیں کیا کہ جس سے تجاوز نہ کر سکے بلکہ انھوں نے اپنی تمام کوشش کو حقیقت قرار دیا ہے۔ انھوں نے اس حقیقت کو ہی اپنا ہدف قرار دیا لہٰذا بات کو سنتے ہیں اور اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں یعنی یہ ہمیشہ اپنے اذہان اور آنکھوں کو کھول کر رکھتے ہیں یعنی بیدار رہتے ہیں۔ تلاش و جستجو میں رہتے ہیں۔ وہ اس تگ ودو میں رہتے ہیں کہ حقیقت ان پر واضح ہو جائے لیکن اگر یہ لوگ طاغوت کی پرستش کرتے تو وہ انھیں ان حالات تک ہی محدود رکھتے جنھیں طاغوت ان کیلئے سوچتے تھے اس وقت ان میں یہ استطاعت نہ ہوتی کہ کوئی بات سنیں اور اچھی بات کی پیروی کریں بلکہ صرف اسی کی پیروی کرتے جس کی پیروی کرنا ان کے لئے سوچا گیا ہے۔ یہ ہے اس طرح کے اقدار اپنانے کا دوسرا سبب۔

یہاں ہم اس گفتگو کا خلاصہ بیان کرتے ہیں۔ تاریخ انسان کے داخلی بناء سے حرکت میں آتی ہے کہ جس نے انسان کیلئے اہداف بنائے ہیں اور یہ غایات مُثل اعلیٰ کی بنیاد پر ہوتے ہیں کہ جس سے یہ غایات نکلے ہیں۔

ہر معاشرہ کیلئے ایک مثل اعلیٰ ہے اور ہر مثل اعلیٰ کیلئے ایک راستہ اور رُخ ہوتا ہے اور یہ مُثل اعلیٰ اس راستہ کو معین کرتا ہے۔ مثل اعلیٰ تین قسم کی ہیں۔ یہاں تک ہم ان تین اقسام میں سے پہلی قسم کو بیان کر چکے ہیں یعنی یہ مُثل اعلیٰ اپنا تصور اپنے ماحول سے اخذ کرتا ہے۔ اسکا تصور اپنے گرد ونواح تک محدود ہے۔ یہ مُثل اعلیٰ تکراری ہے لہٰذا اس کے سایہ میں حرکت تاریخ بھی تکراری ہوگا۔ حال کو لیا ہے تا کہ وہ اس کا مستقبل ہو جائے گا اس مثل اعلیٰ کو اپنانے کے باریک سبب قرآن کریم کی نقطہ ونظر سے ان دو میں سے ایک ہے

پہلا سبب، سبب نفسی ہے، اور یہ محبت، عادات اور ضائع ہونا ہے۔ دوسرا سبب: سبب خارجی ہے اور یہ تاریخ میں فرعونوں اور طاغیوں کا تسلط ہے۔

روز سہ شنبہ ۱۷ جمادالثانی ۱۳۹۹ھ۔

درس دہم

اعوذباللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
وافضل الصلوات علی سیدالخلق محمدوعلی الھداۃ المیامین
من آلہ الطاھرین

پست اقدار میں دینی رنگ:۔

یہ جو پست اقدار ہیں جنکے بارے میں ہم نے اس سے پہلے آپ کے سامنے گفتگو کی ہے اس نے بعض مواقع پر اپنے لئے دینی رنگ اپنایا ہے یعنی ان اقدار کو دینی رنگ سے آراستہ کیا ہے تا کہ اسے تقدس کا لباس پہنایا جائے اور یہ اقدار اجتماع میں بقا و استمرار حاصل کر سکیں چنانچہ آپ نے گذشتہ آیات میں ملاحظہ کیا کہ کس طرح اقوام وملل نے انبیاء کی دعوت کو مسترد کیا۔ یہ لوگ اصرار کرتے تھے کہ یہ اپنے آباؤ واجداد کے دین سے ہی متمسک رہیں گے یہ اُن ہی باپ دادا کے مُثل اعلیٰ کے پابند رہیں گے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان پست مثل اعلیٰ میں سے ہر ایک مثل اعلیٰ نے دینی رنگ چڑھالیا تھا چاہے یہ واضح زبان میں ہو یا مجمل۔ کیونکہ مثل اعلیٰ قرآنی اور اسلامی تعبیر میں ہمیشہ ''الہ'' کے جگہ پر آیا ہے اور ہمیشہ امت کی مثل اعلیٰ سے وابستگی اندر سے عبادت کی شکل میں ہوتی ہے۔ انسان اس کے لئے خاضع ہوتا ہے۔ دین اپنی عام شکل وصورت میں دراصل عابد کا معبود سے ارتباط کا ہی نام ہے۔

یہاں سے واضح ہوا کہ مثل اعلیٰ دینی رنگ اور دینی لباس سے جدا نہیں رہ سکتا چاہے وہ دینی رنگ صریح ہو یا پوشیدہ یا کسی اور نعروں میں پوشیدہ صورت میں ہو۔ پس مُثل اعلیٰ اپنے جوہر میں دین ہے، اپنے جوہر میں عبادت ہے، خضوع ہے لیکن یہ جو دین جسے

پست اقدار نے جنم دیا ہے ایک محدود دین ہے کیونکہ اس کے اقدار محدود ہیں۔ اگر چہ یہ اقدار پست اور محدود ہیں لیکن اپنی مصنوعی شکل میں غیر محدود نظر آتے ہیں لیکن یہ درحقیقت تاریخی ادوار میں انسان کے طویل سے طویل راستے کے عبور کے لئے تصور جزئی رہا ہے اور خود ساختگی کے طور پر مطلق اور عمومی بن گیا ہے۔

پس اقدار میں محدودیت ان ادیان پر منعکس ہوئی جنہوں نے انھیں پیدا کیا تھا۔

پس وہ ادیان جنہوں نے اس مثل کو پیدا کیا یا آسان لفظوں میں بتادوں: وہ ادیان جنہیں انسان نے اس مثل کی درمیان سے نکالا ہے اور ان مثل کے ترقی اور وسعت میں مطلقات کو تصور کرنے لگے۔ یہ ادیان ایک محدود اور پست ادیان ہونگے اور ایک قابل تقسیم دین ہیں۔ یہ ادیان دین توحید (کہ جس کے بارے میں ہم مُثل اعلیٰ کہ جو بشر کے تمام پہلوؤں کو اپنے اندر لینے کی قدرت رکھتا ہے) کے مقابل میں ایک قابل تقسیم دین ہیں یہ ادیان قابل تقسیم ادیان ہیں یہ ''اِلہٰ'' ایسے ''اِلہٰ'' ہیں جسے انسان کے دوز مانوں کے درمیان میں بنایا ہے یہی ہے جسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں تعبیر کیا ہے:

﴿ان ھی الآاسمآء سمیتموھآانتم واٰبآئکم مآانزل اللہ بھامن سلطٰنٍ ان یتبعون الاالظن وماتھوی الانفس ولقدجآء ھم من ربھم الھدٰی﴾ ''یہ سب وہ نام ہین جوتم نے اور تمہارے باپ دادانے طے کر لئے ہیں۔ خدانے ان کے بارے میں کوئی دلیل نازل نہیں کی ہے۔ درحقیقت یہ لوگ صرف اپنے گمانوں کا اتباع کررہے ہیں اور جو کچھ ان کے دل چاہتے ہیں۔ اور یقیناً ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے'' (نجم/۲۳) یہ ''اِلہٰ'' جسے انسان نے پیدا کیا ہے یہ دین جسے انسان نے جوڑا ہے یہ مثل اعلیٰ کہ جو فکر بشر کا نتیجہ ہے یہ وہ دین قیم نہیں ہوسکتا۔ یہ بشریت کو حقیقی بلند درجہ پر پرواز دینے والا نہیں ہوسکتا کیونکہ بشریت اپنے سیر وحرکت میں اپنا معبود خود تخلیق کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

وہ اقوام وملل جنہوں نے ان پست اقدار کو اپنے معاشرے کے حالات سے

لیا ہے، زندگی گذری ہے، ہم نے بتایا کہ انہوں نے ایک تکراری زندگی گزاری ہے یعنی تاریخ میں ان کی حرکت تکراری اور تمثالی ہے۔ یہ اقوام اپنے ماضی کو اپنے حاضر کی طرف کھینچ رہی ہیں اور پھر اس حاضر کو مستقبل کی طرف لے جانا چاہتی ہیں جبکہ حقیقت میں ان کا کوئی مستقبل نہیں ہے ان اقوام کا مستقبل انکا ماضی ہی ہے۔

پست اقدار کا غروب اور امت کا سقوط:۔

یہاں سے ہم پر واضح ہوتا ہے کہ جب ہم ان اقوام کا تجزیہ وتحلیل کیلئے قدم اٹھائیں گے جو ان اقدار سے متمسک ہیں، جب ہم ایک قدم آگے اٹھاتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان اقوم کی ان اقدار سے وابستگی اور محبت رفتہ رفتہ کم ہوگئی ہے اور آخر کار یہ ان اقدار سے متمسک نہیں رہیں گے کیونکہ جب یہ اقدار اپنی قدرت اور فعالیت کھو بیٹھیں گی، جب ان میں عطاو بخشش کی قدرت نہیں رہے گی اور یہ اپنے معاشرے کی فوٹوسٹیٹ بنیں گی اور یہ ایک محسوس وملموس مفروضہ اقدار بنیں گی اور جب اس میں بشریت کو ترقی وتمدن یا آگے بڑھانے کی صلاحیت نہیں رہے گی تو رفتہ رفتہ اس معاشرے کی ان اقدار سے وابستگی ختم ہوجائے گی یعنی یہ قوم وملت ان اقدار سے محبت اور وابستگی کو ختم کرے گی۔ اقدار سے محبت ختم ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اس قوم وملت میں اس وسیع وعریض جمہوریت کی بنیادیں پاش پاش ہوجائیں گی اپنی وحدت کو کھو بیٹھے گی کیونکہ اس امت کی وحدت کی بنیاد اقدار تھیں۔ جب ان اقدار سے انکی وابستگی ہی ختم ہوگی تو پھر ان کیلئے نقطہ وحدت کی کوئی بنیاد نہیں رہے گی۔ یہ امت جب اس مُثل سے وابستگی کو ختم کرے گی تو یہ پراگندگی کا شکار ہو جائے گی منتشر ہوجائے گی ان کی حالت وہی ہونگی جسے قرآن کریم نے فرمایا ہے:

﴿لایقاتلوانکم جمیعًاالافی قرًی محصنةٍ اومن ورآء جدارٍباسھم بینھم شدیدتحسبھم جمیعًاوقلوبھم شتّٰی ذٰلک بانھم قوم لایعقلون﴾ ''یہ کبھی تم سے اجتماعی طور پر جنگ نہ کریں گے مگر یہ کہ محفوظ بستیوں میں ہوں یا دیواروں کے پیچھے ہوں ان کی دھاک آپس میں بہت ہے اور تم یہ خیال کرتے ہو کہ یہ سب متحد ہیں۔

ہر گز نہیں ان کے دلوں میں سخت تفرقہ ہے اور یہ اس لئے کہ اس قوم کے پاس عقل نہیں ہے''
(حشر/۱۴)

یعنی ان کے آپس میں سخت تفرقہ ہے کیونکہ اس امت کے اندر تناقضات کا آغاز ہو چکا ہے اب یہ قوم کسی نقطہ پر جمع نہیں ہو سکتی یہ صرف رنگ وصورت میں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں انکو کوئی اعلیٰ اقدار متحد نہیں کر سکتی اور یہ کسی ایک راستے میں متحد نہیں ہو سکتی ہے ان کے دل پراگندہ ہیں انکی خواہشات منتشر ہیں روحیں پراگندہ ہیں عقل جامد ہے لہٰذا ایسی صورت حال میں امت باقی نہیں رہ سکتی۔ اگر کوئی چیز امت کے نام سے نظر آتی ہے تو وہ صرف اسکا ڈھانچہ ہے اس ڈھانچے کے سائے کے نیچے اس امت کا ہر فرد اپنی مختصر خواہشات اور آرزوؤں کی تکمیل میں مصروف ہے اور یہی اسکی منزل وہدف ہے۔ اس کے بعد ان کے پاس کوئی ایسی اقدار نہیں جو اس قوم کی توانائیوں کو متحد کر سکے اور اس اقدار کے گرد اس کی صلاحیتوں اور امکانات کو جمع کر سکے۔ اور اس کی خاطر یہ قربانیاں دے سکیں کیونکہ ان کی اعلیٰ اقدار ختم ہو چکے ہیں جب یہ مثل اعلیٰ ختم ہو جائے گا تو اس امت کی وحدت کا نظریہ بھی خود بخود ختم ہو جائے گی اس قوم کا ہر شخص اپنی محدود احتیاجات سے وابستہ ہو گا یعنی وہ شخصی مصلحت کے اسیر ہونگے وہ صرف اپنے شخصی امور کے متعلق سوچتے ہیں کیسے صبح ہو، کیسے شام کو گزاریں، کیسے اور کیا کھائیں، کیا پہنیں؟، کیسے خود اس کیلئے اس کی اولاد اور گھر والوں کیلئے راحت وسکون حاصل ہوگی؟ کونسی راحت نصیب ہوگی؟ یہاں پر راحت سے مراد راحت سے ہی فارغ ہونا ہے اور ان معنوں میں استقرار، استقرار سے کوتاہ ہونا ہے۔ ہر ایک اپنی حاجتوں کے زندان میں محبوس ہے اپنی خواہشات کا اسیر ہے۔ اسی کے لئے زندہ رہتا ہے اور اسی کے گرد گھومتا ہے اسے اور کوئی چیز نظر نہیں آتی کیونکہ اس کے پاس کوئی اقدار نہیں ہے کیونکہ اس کا اقدار منابع اور ختم ہو چکا ہیں۔

اس قوم کے بارے میں تاریخ کا فیصلہ

امت کی ایسی صورت حال میں کہ وہ ڈھانچہ میں بدل جائے اور حقیقت میں

امت کا کوئی وجود باقی نہ ہو بلکہ امت کا صرف ڈھانچہ باقی ہو تو ایسی صورت حال میں قانون تاریخ ایسی قوم کے لئے تین قسم کے فیصلے رکھتی ہے لہٰذا ان میں سے کوئی ایک انکے حق میں تطبیق یا نافذ ہوگا۔

پہلا فیصلہ:۔

یہ امت ایک بیرونی قوم کے حملے کے نتیجے میں پاش پاش ہو جائیگی کیونکہ یہ اندر سے خالی ہو چکی ہے۔ اب یہ بحیثیت فرد موجود ہے قوم نہیں۔ یہ اپنی قومیت کا تصور کھو چکی ہے۔ ہر انسان اپنے کھانے پینے کے بارے میں سوچتا ہے اپنے لباس کے بارے میں سوچتا ہے اپنی رہائش کے بارے میں سوچتا ہے اسے امت کی کوئی فکر نہیں ہے۔ وہاں کوئی شخص موجود نہیں جو امت کے بارے میں سوچے۔ بلکہ ہر انسان اپنی حاجات کے بارے میں سوچتا ہے۔ لہٰذا ایسی صورت حال میں ممکن ہے یہ قوم کسی بیرونی حملہ کی وجہ سے پاش پاش ہو جائے چنانچہ یہ عمل تاریخ میں وقوع پذیر ہو چکا ہے جب مسلمانوں نے اپنے مثل اعلیٰ کو چھوڑا اس سے انکی وابستگی ختم ہوئی تو مغلوں یعنی تاتاریوں کے حملے کا شکار ہوئے اور اسکے ساتھ ہی ان کا تمدن ان کے ہاتھوں تباہ ہو۔ایہ تاریخ کا پہلا فیصلہ ہے۔

دوسرا فیصلہ:۔

یہ قوم کسی اجنبی اقدار میں منضم اور تحلیل ہو جائیگی۔ باہر سے آنے والی قدروں کو اپنا لے گی۔ کیونکہ جب اس امت نے اپنے اندر سے نکلنے والی مثل اعلیٰ کو کھویا تو اسکے کردار اور اصالت کو بھی کھو دیا تو اب اس قوم کے پاس کوئی مثل اعلیٰ موجود نہیں اب یہ باہر سے ایک مثل اعلیٰ کی تلاش میں رہے گی تاکہ اس سے اپنی وابستگی قائم کرے اور اسے اپنا حق قیادت دے۔ یہ تاریخ کا دوسرا فیصلہ ہے۔

تیسرا فیصلہ:۔

اس امت کے اندر ایک نئی سوچ وشعور پیدا ہوگی کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی اقدار کو عصر

حاضر کی سطح تک دوبارہ لانا چاہے گی تاکہ اس کے سائے میں وہ زندگی گزارے۔

یہ دو فیصلے: یعنی فیصلہ دوم اور سوم امت جب استعمار کا زمانہ شروع ہوا تو ان دونوں مختلف فیصلوں کے سامنے کھڑی ہے کہ ان دو راستوں میں سے کس کو اختیار کرے۔ کیونکہ ایک راستہ جو اسے باہر کی اقدار میں منضم ہو جانے کی دعوت دیتا ہے یہ وہ طریقہ ہے جسے بعض مسلمان حکمرانوں نے اسلامی ممالک پر تطبیق کیا ہے جیسے رضا خان نے ایران میں ا۔ (رضا خان متولد ۱۸۷۸۔ متوفی ۱۹۴۴/ ۱۹۲۵ سے ۱۹۴۱ تک اپنے آپ کو ایران کے امیر کے طور پر مقرر کیا تھا) نے ایران میں اور کمال اتاترک مصطفیٰ کمال (مصطفیٰ کمال اتاترک متولد ۱۸۸۱۔ متوفی ۱۹۳۸ وہ پہلا شخص ہے جس نے خلافت عثمانی کے بعد ۱۹۲۳ میں جمہوری حکومت بنایا) نے ترکی میں۔ ان لوگوں نے مسلمانوں کیلئے اعلیٰ اقدار کے لئے یورپ کو فاتح کے طور پر پیش کیا اور اس مثل اعلیٰ کے حصول کیلئے مسلمانوں کی مغرب سے وابستگی کی مہم چلائی اور یہ اس وقت تھا جب مسلمان اپنی اعلیٰ اقدار کو کھو چکے تھے اس وقت فکر اسلامی کے داعیوں نے استعمار کے ابتدائی اور آخری دور یعنی عصر حاضر کے دور میں فکر اسلامی کا رواج شروع کیا اور اسلامی مفکرین اور نزہت اسلامی کے قائدین نے اپنی تمام تر کوششوں کو اس تیسرے فیصلہ کے اجراء کی طرف مبذول کیا یعنی دوبارہ زندگی کو اسلامی فکر کے تحت کریں اور اس مثل اعلیٰ کی انتشار اور زندگی کو اسی کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی اور اسے عصر حاضر کی زبان میں اور زمانہ کے تحت اور مسلمانوں کی حاجات کے تحت پیش کرنے کی کوششیں کیں۔

پس جب امت ایک ڈھانچہ میں بدل جاتی ہے تو تاریخ ان کے حق میں ان تین فیصلوں میں سے ایک کو کر لیتی ہے۔

۲۔ محدود نظریہ سے ماخوذ اعلیٰ اقدار

ابھی ہم نے اس پست اقدار سے وابستہ قوم وملت کے بارے میں گفتگو کی۔ جب ہم نے ایک قدم آگے بڑھایا تو دیکھا کہ یہ ایک تکراری اقدار ہے جو مستقبل میں ختم ہو

جائیگی امت اس سے اپنی وابستگی ختم کر دے گی اور امت ایک ڈھانچہ میں بدل جائے گی ان کو ان تین فیصلوں میں سے ایک کا سامنا ہوگا۔

اب ہم دوبارہ پیچھے چلتے ہیں جب ہم ایک قدم اور پیچھے اٹھاتے ہیں تو ہمارا ''الہٰ'' کے دوسرے قسم کا سامنا ہوتا ہے جیسا کہ ہم نے ابتداء میں بتایا کہ مثل اعلیٰ تین قسم کی ہیں ابھی تک ہم نے پہلی قسم پر بات کی ہے۔ اب ہم مُثل اعلیٰ کے دوسرے قسم کے بارے میں گفتگو کریں گے۔ مثل اعلیٰ کی دوسری قسم کا تعلق ان اقدار سے ہے جسے اپنی خواہشات کے تحت بناتے ہیں اور مستقبل پر نظر رکھ کر نکالتے ہیں۔ یہ مُثل اعلیٰ اس موجود خارجی کی تکرار نہیں ہے بلکہ یہ امت کے مستقبل پر نظر رکھتی ہے یہ جدیدیت کی قائل ہے، ترقی وتمدن کی قائل ہے۔ لیکن یہ مُثل اعلیٰ مستقبل کے ایک جز سے بنایا ہے یہ مستقبل کے اس طویل راستے کے ایک جزء سے بنایا گیا ہے یعنی وہ خواہشات جس سے امت نے یہ مُثل اعلیٰ بنائے ہیں وہ اپنی جگہ محدود ہے۔ یہ خواہشات قید و بند کی صورت میں ہیں۔ یہ طویل مسافت طے نہیں کر سکتا۔ یہ محدود مستقبل کی طرف دیکھتا ہے۔ اسی محدود مستقبل سے ہی یہ اقدار بنی ہیں۔

اس مُثل اعلیٰ میں ایک صحیح موضوع بھی ہے لیکن اس میں بہت لغزشوں کا احتمال ہے۔ اس کا صحیح پہلو یہ ہے کہ انسان اپنے طویل سفر کیلئے اپنے سفر کے اس طویل سے طویل راستہ پر احاطہ نہیں کر سکتا، وہ مطلق کو احاطہ نہیں کر سکتا، کیونکہ ذہن بشری محدود ہے بشر کا محدود ذہن مطلق پر احاطہ نہیں کر سکتا۔ وہ ہمیشہ مطلق کے ایک حصہ کی آگاہی حاصل کر سکے گا۔ مطلق سے اسی حد تک لے سکتا ہے جو اسے روشنی دے، اسے راستہ دکھائے۔ پس بشر کے احاطہ کرنے کا دائرہ محدود ہے۔ یہ ایک طبیعی کام ہے اور صحیح بھی ہے۔

لیکن اس مسئلہ میں جو خطرہ ہے وہ یہ ہے کہ انسان مطلق سے جو اخذ کرتا ہے وہ ایک محدود روشنی ہے یہ روشنی کی ایک ضو ہے جسے اس مطلق سے لیا جاتا ہے پھر اسے آسمان اور زمین کی روشنی میں بدل لیتا ہے۔ پھر وہ اسے ایک مُثل اعلیٰ میں بدل دیتا ہے۔ یہاں

پرخطر ہے کیونکہ مستقبل کے بارے میں محدود ذہنی تصور سے۔ یہ مُثل اعلیٰ بنایا جاتا ہے اوراس مثل اعلیٰ کونکالا جاتا ہےلیکن یہ محدود ذہنی تصور مطلق میں بدل جاتا ہےتو اس وقت یہ اقدار فی زمانہ خدمت کرے گی یہ مثل اپنی قدرت وطاقت کے مطابق اسے رشد ونمو کے امکانات مہیا کرے گی۔جتنی اس میں مستقبل کیلئے گنجائش ہوگی اتنا ہی انسان کوحرکت دے گی۔اس میں سرگرمی پیدا کرے گی لیکن جلد ہی یہ اپنی انتہا کو پہنچے گی ،جلد ہی اس مثل کے آخر کو پہنچے گی۔تو اس وقت یہ مُثل خود ہی اس حرکت کا مانع ہوگا،ترقی کا مانع ہوگا،انسان کی حرکت کو منجمد کرنے والا بنے گا کیونکہ انسان نے اسے اپنا مُثل بنایا ہے۔اس اقدار کو اپنا معبود بنایا ہے،دین قرار دیا ہے۔اسے ایک حقیقت تصور کیا ہے اس وقت خود یہ مُثل انسان کے حقیقی کمال تک جانے میں رکاوٹ بنے گی۔

محدود اقدار کو عمومیت دینا:۔

یہ محدود اقدار جسے غلطی سے عمومیت دیا ہے، غلطی سے محدود سے مطلق میں تبدیل کیا ہے۔اس میں غلطی سے عمومیت ایک دفعہ افقی پہلو سے دی جاتی ہے اور دوسری دفعہ عرضی پہلو سے۔یہاں پر اس مُثل میں غلطی سے دو عمومیت ہے۔ایک غلطی افقی عمومیت ہے اور دوسری غلطی عرضی عمومیت ہے۔

عمومیت افقی کی غلطی

انسان اپنے مستقبل کی طرف تصور سے ایک اقدار کو اخذ کرے اور اسے ایسا قرار دے کہ انسان کے تمام اقدار اس میں منضم ہوں جن کیلئے وہ کوشش کرتا ہے اور جن کی راہ میں جنگ کی جاتی ہے درحالیکہ یہ مُثل اگرچہ ایک وجہ سے صحیح ہے لیکن یہ اقدار کا ایک جزء ہے پس یہ عمومیت افقی عمومیت میں غلطی ہے۔

جدید یورپی انسان نے اپنے انقلاب صنعت کے موقع پر اپنے لئے ایک مثل اعلیٰ بنائی جسکا نام آزادی ہے۔انہوں نے آزادی کو اپنے لئے اعلیٰ قدر قرار دیا کیوں کہ

انھوں نے دیکھا کہ مغرب کے لوگ اس وقت قید و بند میں زندگی گزار رہے تھے وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اسیر تھے۔وہ اپنے دینی اور علمی نظریات میں کلیسا کے پابند تھے،کلیسا ان پر سختی کرتے تھے۔وہ اپنے لقمہ حیات کیلئے جاگیرداری نظام کے پابند تھے۔غرض وہ جہاں بھی جائیں وہ اسیر تھے۔مغرب کے انسانوں کے رہبر نے انقلاب صنعت کے ذریعے اس انسان کو ہر قسم کے قید و بند سے آزادی دلانا چاہا۔ان کو کلیسا اور جاگیرداری نظام سے آزادی دلائی۔اسے ایک خود مختار انسان بنانے کا سوچا کہ جس وقت جو کام چاہے کر سکے اپنی عقل سے سوچے نہ کہ کسی اور کی عقل سے،خود جو تصور کرے اور خود ہی غور وفکر کرے اور اس تصور اور غور وفکر کو دوسروں سے ایک حتمی دستور کی شکل میں نہ لے۔

یہ فکر ایک لحاظ سے اپنی جگہ صحیح ہے لیکن یہاں جو غلطی ہے وہ اسکو عمومیت دینا ہے۔یہ آزادی جس کے معنی انسان کو قید و بند سے نجات دلانا ہے اپنی جگہ قدرت مند ہے لیکن تنہا یہ آزادی انسان کو نہیں بنا سکتی۔یہ وہ مُثل اعلیٰ نہیں ہے؛ انسان تنہا اس سے نہیں بنتا۔ آپ ایسا نہیں کر سکتے کہ انسان کو قید و بند سے آزاد کروانے کے بعد اسے کہیں جو کچھ مرضی ہو کرے وہ آزاد ہے۔نہ کوئی انسان، نہ کوئی وجود، نہ کوئی جاگیردار، نہ کوئی باپ، نہ کوئی بادشاہ، نہ کوئی سرکش کہ جو آپ کو کسی کام پر مجبور کرے یا کسی موقف کو آپ پر واجب کرے۔

لہٰذا ان قید و بند کو توڑنا کافی نہیں ہے کیونکہ قیود کا توڑنا صالح انسان کی رشد ونمو کیلئے ایک چوکھٹ بنایا ہے لیکن اسے مضمون اور محتویٰ کی ضرورت ہے فقط ہر کام کر سکنا،صرف بازاروں میں چل پھر سکنا کافی نہیں ہے، وہ بازاروں میں کیسے چلیں؟ وہ بازار میں کس ہدف ومقصد کیلئے چل رہے ہیں؟ یہ محتویٰ اور مضمون ہے جسے یورپی انسان نے کھو دیا ہے۔

یورپی انسان نے آزادی کو اپنا ہدف بنایا جو صحیح ہے لیکن اسے ایک اعلیٰ اقدار قرار دینا صحیح نہیں درحالیکہ یہ آزادی حقیقت میں ایک چوکھٹ ہے اور یہ چوکھٹ ایک مفہوم و مضمون کا نیاز مند ہے اور جب یہ چوکھٹ اس محتویٰ اور مضمون سے خالی ہو تو اس کا نتیجہ حسرت اور نابودی ہوگی۔یہ اسے مصیبت کی طرف دھکیل دے گی جسکا آج کل کے مغربی

تمدن کو سامنا ہے جس نے بشریت کی نابودی کے تمام وسائل مہیا کیئے ہیں کیونکہ یہ چوکھٹ بغیر محتویٰ و مضمون کے باقی رہ گیا ہے۔ یہ تھی اقدار کو افقی طور پر عمومیت دینے کی مثال، مُثل اعلیٰ کو افقی طور پر عمومیت دینا۔

عمومیت عرضی میں غلطی:۔

اقدار کو عرضی طور پر عمومیت دینے بھی تاریخ کچھ حد تک کامیابی حاصل کی ہے لیکن یہاں بھی محدود سے مطلق کی طرف جانا صحیح نہیں ہے انسان کو اپنے عمل میں اس محدود کو مثل اعلیٰ قرار دینا صحیح نہیں انسان مثل اعلیٰ کے ضمن میں اسے بھی طے کر لیں لیکن خود ان اقدام کو مثل اعلیٰ قرار دینا صحیح نہیں ہے انسانی تاریخ میں جب کچھ خاندان جمع ہوئے تو قبیلہ وجود میں آیا اور اسی طرح جب کچھ قبائل جمع ہوئے تو عشایر وجود میں آئے اور جب بعض عشایر جمع ہوئے تو ایک اُمت وجود میں آئی۔ یہ انسانی تمدن یا اسکی وحدت کی طرف ایک صحیح قدم ہے۔ ان اقدامات میں سے ہر ایک قدم کو مثل اعلیٰ قرار نہیں دے سکتا، جائز نہیں کہ ان محدود اقدامات کو مطلق میں تبدیل کیا جائے اور ایک عشیرہ سے ایک مطلق بن جائے کہ انسان اس کے لئے جنگیں لڑے اپنی جان قربان کرے بلکہ قربانی صرف مطلق حقیقی کے لئے ہونی چاہیے اور وہ مطلق حقیقی خداوند سبحانہ کی ذات ہے۔ لہٰذا ہر قدم ایک قانون کی شکل میں ہوتا ہے، لیکن مطلق نہیں ہوتا۔ مطلق صرف خداوند سبحانہ کی ذات ہے۔ یہ عمومیت عرضی بھی ایک غلط عمومیت ہے جب یہ مُثل جو ایک محدود اقدام سے وجود میں آئے اور تاریخ گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ مُثل اعلیٰ میں بدل گئے ہیں۔

اس انسان کی مثال جس نے زمان میں محدود نظر سے اس مثل کو لے کر مثل مطلق قرار دیا ہے اسکی مثال یوں ہے کہ ایک انسان جب اوپر دیکھتا ہے تو اسکی آنکھ محدود مسافت سے آگے نہیں دیکھ سکتی۔ لہٰذا وہ سمجھتا ہے کہ دنیا یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ جہاں تک اسکی نظر گئی ہے آسمان یہیں تک ہے جہاں اسے وہ زمین سے ملتا نظر آ رہا ہے۔ اسی طرح کبھی انسان سراب کو اپنے قریب پانی تصور کرتا ہے لیکن یہ حقیقت میں انسان کی بینائی کی عاجزی کی وجہ

سے ہے اور اس نے زمینی مسافت کے طویل کو دیکھ کر بنایا ہے۔

اسی طرح یہاں بھی یہ انسان تاریخ کے طویل راستے پر کھڑا ہے، شر کے راستے پر کھڑا ہے اس نے اپنے قاصر ذہن سے ایک افق بنایا ہے بشر کے محدود ذہن کے تحت ایک افق بنایا ہے، جغرافیائی افق کی طرح اس کیلئے ایک افق ہے لیکن اس کے ساتھ وہی سلوک ہوا جو ایک عام افق کے ساتھ ہوتا ہے نہ کہ مطلق افق کا سلوک۔ جیسا کہ ہم جغرافیائی صعود میں جس افق کو دیکھتے ہیں اس کے ساتھ یہ سلوک نہیں کیا جاتا کہ ۲۰ میٹر یا ۲۰۰ میٹر کے بعد زمین کی آخری حدود ہیں، ہم اس کے ساتھ ایک افق کا سلوک اپناتے ہیں۔

دیکھیں قرآن کریم نے کتنی اچھی مثال پیش کی ہے:

﴿والذین کفروا اعمالھم کسراب بقیعةٍ یحسبه الظمآن ماء حتٰی اذاجاء ه لم یجده شیئًا و وجدالله عنده فوفّاه حسابه والله سریع الحساب﴾ ''اور جن لوگوں نے کفر اختیار کر لیا ان کے اعمال ریت کے مانند ہیں جو چٹیل میدان میں ہو اور پیاسا اسے دیکھ کر پانی کا تصور کرے اور جب اس کے قریب پہنچے تو کچھ نہ پائے بلکہ اس خدا کو پائے جو اس کا پورا پورا حساب کر دے کہ اللہ بہت جلد حساب کرنے والا ہے''
(نور/ ۳۹)

قرآن ان تمام خود ساختہ اور جعلی اقدار کو جو خداوند سبحانہ کے مقابلے میں بنائی گئی ہیں اسے تارعنکبوت کی طرح سمجھتا ہے:

﴿مثل الذین اتخذوا من دون اللّٰہ اولیآء کمثل العنکبوت اتخذت بیتًا و ان اوھن البیوت لبیت العنکبوت لو کانوا یعلمون﴾ ''اور جن لوگوں نے خدا کو چھوڑ کر دوسرے سرپرست بنالئے ہیں ان کی مثال مکڑی جیسی ہے کہ اس نے گھر تو بنالیا لیکن سب سے کمزور گھر مکڑی کا گھر ہوتا ہے اگر ان لوگوں کے پاس علم و ادراک ہو'' (عنکبوت/ ۴۱)

پست اقداراور محدود اقدار میں موازنہ:۔

اگر ہم ان دونوں مُثل اعلیٰ کا موازنہ کریں یعنی جومثل اپنے گردونواح سے حاصل کی ہیں اور وہ مثل جو محدود نظریہ سے اخذ ہوئی ہیں تو ہم پر واضح ہوگا کہ جومثل پہلے نمونے کی ہیں وہ دراصل اس دوسری نوع کا ہی تسلسل ہیں۔ اس طرح ہے کہ پہلے مُثل پیدا ہوتا ہے اور اس خواہشات سے مُثل اعلیٰ کا ابتداء ہوتا ہے لیکن جب یہ محدود نظریہ وقوع پذیر ہوتا ہے جب بشریت اس نقطہ تک پہنچتی ہے جہاں پر یہ مثل واقع ہوا ہے تو جسے اس اقدار نے پیدا کیا ہے وجود خارجی کے حوالے سے یہ مثل بھی ایک محدود مثل میں منتقل ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ محدود آگے چل کر ایک تکراری مثل بن جاتا ہے۔

یہاں سے جیسا کہ ہم نے گذشتہ اسباق میں کہا اگر ایک قدم پہلے قسم کیم مُثل اعلیٰ کی طرف رجوع کریں تو ہم دوسرے قسم کی ''اِلٰہ'' کا برخورد ہوتا ہے تو یہ مسالہ اکثر اوقات اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ مستقبل کی خواہشات سے ایک مُثل اعلیٰ کی ابتداء ہوتی ہے پھر یہ مثل اعلیٰ مثل تکراری میں بدل جاتا ہے پھر یہ مثل تکراری پاش پاش ہوجاتا ہے جیسا کہ بیان ہوا اس کے بعد پھر امت ایک ڈھانچہ کی صورت میں باقی رہ جاتی ہے۔

دوسری قسم کی مثل میں انقلاب کے مراحل

درحقیقت اس مدت میں امت چندمراحل سے گزرتی ہے ہمارے لئے ممکن ہے کہ ہم اسکا چار مرحلوں میں خلاصہ پیش کریں۔

پہلا مرحلہ:۔

اس مثل کی قدرت و فعالیت سے متعلق ہے۔ یہ مثل اس حوالے سے کہ ایک مستقبل کو ذہن میں رکھتے ہوئے شروع ہوئی ہے اور اس میں مستقبل پر نظر ہے تو یہ پہلے مرحلہ میں جتنا اس کا مستقبل سے رابطہ ہے اس حدتک کچھ کردار کا مالک ہے اس میں عطا کی طاقت موجود ہوتی ہے اس میں تجدید ہوتی ہے۔

لیکن یہ عطا اور فعالیت اور یہ تجدید وہی ہے جسے قرآن کریم نے ''عاجل'' کہا ہے لیکن یہ کسب عاجلہ یہ سود خط طویل میں نہیں ہے یہ مقاصد کسب عاجلہ ہیں کیوں اس لحاظ سے کہ ان اقدار کی عمر محدود ہے تو لامحالہ ان سے ملنے والی عطا بھی محدود ہوگی کیونکہ مثل آگے چل کر نابودی سے دوچار ہوگا اور جو کچھ اس نے حاصل کیا ہوگا وہ ختم ہوگا۔ لہٰذا قرآن نے اسے عاجل کہا ہے دیکھیں ان آیات کی طرف:

﴿من کان یریدالعاجلة عجلنالہ فیھامانشآء لمن یریدثم جعلنالہ جھنم یصلٰھامذمومًامدحورًا. ومن ارادالاٰخرة وسعٰی لھاسعیھاوھومؤمن فاولٰئک کان سعیھم مشکورًا. کلاًّنمدھؤلآء من عطآء ربک محظورًا ﴾

''جوشخص بھی دنیا کا طلب گار ہے ہم اس کے لئے جلد ہی جو چاہتے ہیں دے دیتے ہیں پھر اس کے بعد اس کے لئے جہنم ہے جس میں وہ ذلت ورسوائی کے ساتھ داخل ہوگا۔ اور جوشخص آخرت کا چاہنے والا ہے اور اس کے لئے ویسی ہی سعی کرتا ہے اور صاحب ایمان بھی ہے تو اس کی سعی یقیناً مقبول قرار دی جائے گی۔ ہم آپ کے پروردگار کی عطا و بخشش سے ان کی اور اُن کی سب کی مدد کرتے ہیں اور آپ کی پروردگار کی عطا کسی پر بند نہیں ہے'' (اسراء/ ۱۸ تا ۲۰)

ذات باری تعالیٰ سبحانہ خیر محض ہیں۔ اسطرح اسکی بخشش اور عطا بھی خیر محض ہے کوئی قوم اپنے مثل جتنا زیادہ قابل حرکت بنائیں گے اسے اسی کے تناسب سے عطا کریں گے لیکن یہ دینے کی صلاحیت اس مثل کی قدرت وقابلیت کے لحاظ سے ہوگی یعنی اسے جلدی دیں گے نہ کہ زیادہ۔

ایسے حالات میں وہ حاکم جو مثل کو پیدا کرتا ہے خود وہ حاکم مثل اعلیٰ بن جاتا ہے، خود دینے والا اور ایجاد کرنے والا بن جاتا ہے اور ایسے اقدار کے حدود میں اس کا امت کیلئے قیادت قابل توجہ ہوتا ہے اور اس مثل کو بنانے میں اور اس مثل کے وجود میں آنے میں امت بھی شریک ہوتی ہے ایسے حالات میں یہ مثل امت کو ایک محدود فائدہ دے گی یہ فائدہ وہاں

تک ہوگا جہاں تک اس مثل کی حدود ہیں لیکن وہ قرآن جو عمیق وطویل ہے اسکی نظر میں یہ فائدہ عاجلہ ہے لیکن اسکے پشت میں جہنم ہے ایک جہنم اس دنیا میں ہے اور ایک آخرت میں۔ یہ وہ پہلا انقلاب ہے جو اس ایجاد اور امت سے ہوگا۔

دوسرا مرحلہ:۔

جب یہ مثل منجمد ہوگا یعنی جب اسکی طاقت اختتام کو پہنچے گی تو جب اسکی عطا اور فائدہ دینے کی صلاحیت ختم ہو جائے گی۔ اس وقت یہ مُثل تمثال (شکل خالی ڈھانچہ) میں تبدیل ہوگا۔ اب یہ مثل نہیں رہے گا بلکہ تمثال (فوٹو) بنے گا وہ قائدین جو اس اقدار کے زیر نظر قوم کو عنایت کرنے والے تھے اور اس راہ پر لگانے والے تھے وہ رفتہ رفتہ آمریت اور ڈکٹیٹر شپ کی طرف بڑھیں گے۔ وہ قائد نہیں ہوں گے بلکہ حاکم میں بدل جائے گا اور امت اسکی مطیع بنے گی، اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنیوالے ہونگے یہ ایجادات اور ترقی میں شریک نہیں ہونگے۔ اس مرحلے کے بارے میں بھی قرآن کریم نے فرمایا ہے:

﴿وقالوا ربنآ انآ اطعنا سادتنا و کبرآء نا فاضلونا السبیلا﴾ ''اور کہیں گے کہ ہم نے اپنے سردارو اور بزرگوں کی اطاعت کی تو انہوں نے راستہ سے بہکا دیا'' (احزاب/ ٦٧)

تیسرا مرحلہ

اس کے بعد تیسرا مرحلہ آتا ہے۔ تاریخ میں ان کے تسلسل کی باری آتی ہے۔ یہاں سلطنت والے صاحبان اقتدار ایک گروہ میں تبدیل ہونگے اور اپنے بعد یہ عہدہ اپنی نسبت یا خاندان میں منتقل کریں گے یعنی اقسام واشکال وراثت میں دیں گے۔ اس وقت یہ طبقہ مترف اور منعم یعنی طبقہ عیش وعشرت میں تبدیل ہوگا۔ یہ کسی بڑے مقاصد کے حامل نہیں ہونگے بلکہ اپنے چھوٹے چھوٹے مقاصد میں مشغول ہونگے چنانچہ اس گروہ کے بارے میں آیا ہے:

﴿وکذٰلک مآ ارسلنا من قبلک فی قریۃٍ من نذیرٍ الا قال

مترفوھآ انا وجدنآ اٰبآء نا علی امۃٍ و انا علٰی اٰثٰرھم مقتدو﴾ ''اور اسی طرح ہم نے آپ سے پہلے کسی بستی کی طرف کوئی تنبیہ کرنے والا نہیں بھیجا مگر یہ کہ وہاں کے عیش پرستوں نے کہا: ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک رسم پر پایا اور ہم انہی کے نقش قدم کی پیروی کر رہے ہیں'' (زخرف/٢٣)

یہ اپنے آباؤ اجداد کے تاریخ کا تسلسل ہے اور یہ انہی کی پیداوار ہیں۔ یہ تاریخی تسلسل مُثل اور عطاء کی حیثیت سے نکل جائے گا اور یہ عیش طلب طبقہ میں منتقل ہوگا اور یہ جایگاہ وراثت کے مختلف اقسام کے ذریعے وراثت میں تبدیل ہوگا۔ یہ تھا تیسرا مرحلہ۔

چوتھا مرحلہ:۔

جب امت منتشر اور پراگندہ ہو جائے گی اسکی مُثل اعلیٰ سے وابستگی ختم ہو جائے گی۔ وہ مُثل اعلیٰ تکراری ہوگا جیسا کہ بیان ہوا۔ اب یہ چوتھے مرحلے میں داخل ہوگی۔ یہ مرحلہ تمام مراحل سے زیادہ خطرناک ہے۔ اس مرحلہ میں اس امت کا مجرم ان پر مسلط ہوگا۔ ایسے لوگ ان پر مسلط ہونگے جو کسی عہد و پیمان کا پاس نہیں رکھیں گے اور نہ ہی کوئی ذمہ داری کو قبول کریں گے ایسے گروہ کے تسلط کے بارے میں قرآن میں یوں بیان ہوا ہے:

﴿وکذٰلک جعلنا فی کل قریۃٍ اکٰبر مجرمیھا یمکروا فیھا ومایمکرون الا بانفسھم ومایشعرون﴾ ''اور اسی طرح ہم نے ہر قریہ میں بڑے بڑے مجرمین کو موقع دیا کہ وہ مکاری کریں اور ان کی مکاری کا اثر خود ان کے علاوہ اور کسی پر نہیں ہوتا ہے لیکن انہیں اس کا بھی شعور نہیں ہے'' (انعام/١٢٣)

اس وقت اس امت پر مجرمین کا تسلط ہوگا۔ جیسے ہٹلر اور اس کی نازی پارٹی یورپ پر مسلط ہوئے تاکہ مغرب میں جو اچھائی ہے اور جتنے بھی ایجادات ہیں ان کو نیست و نابود کریں تاکہ جدید مغربی انسانوں میں جس مثل اعلیٰ کو اٹھایا ہوا ہے اس کو ختم کریں اور یورپ والوں کی تکراری مثل اعلیٰ جو اپنی بوسیدگی کے آخری مرحلہ پر تھی اسے بھی ختم کر دیں لیکن اس مُثل اعلیٰ کے فوائد مغربی معاشرے میں باقی تھے وہاں پر ہٹلر جیسا کوئی شخص آتا ہے

تا کہ ان فوائد کو بھی پاش پاش کرے اور ان فوائد کو بھی سرے سے ختم کر دیے۔

۳۔ مُثل اعلیٰ یعنی مُثل اعلیٰ حقیقی:۔

اب ہم اس مرحلہ پر پہنچے ہیں کہ مثل اعلیٰ کے تیسرے قسم کے بارے میں بات کریں۔ یہی تیسرا قسم مثل اعلیٰ حقیقی ہے اس مثل حقیقی سے مراد ذات باری تعالی ہے۔وہ تناقضات جو پہلے اور دوسرے مثل اعلیٰ میں پیش آئے تھے یہاں ان تناقضات کا سامنا نہیں ہوگا۔ وہاں تناقضات کی وجہ انسانی ذہن سے نکلنے والے مُثل تھے جو محدود تھے اور مثل کا غیر محدود ہونا ضروری ہے لیکن یہاں ایک محدود کو ایک غیر محدود سے جوڑنا کیسے ممکن ہے محدود اور غیر محدود میں سیاق کیسے ایک ہونگے۔

محدود اور غیر محدود میں یہ وحدت بھی مُثل اعلیٰ ہے جو کہ اللہ سبحان تعالیٰ ہی میں پاتے ہیں، کیسے؟ کیونکہ یہ مثل انسانی ذہن کی پیداوار نہیں ہے۔انسانی ذہن کی ساخت نہیں ہے۔ بلکہ مثل اعلیٰ حقیقی اپنی جگہ ایک وجود رکھتا ہے۔ یہ خارج میں موجود مطلق ہے۔اس کیلئے قدرت مطلقہ ہے، علم مطلق اور کلی ہے اور اس کے پاس عدالت بھی مطلق اور کلی ہے یہ مثل اعلیٰ حقیقی ہے کیونکہ یہ اپنی جگہ مطلق ہے لیکن جب انسان اس نور سے الہام لینا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس نور کے ایک ٹکڑے سے متمسک ہوجائے۔جب وہ صرف مقید کی شکل میں متمسک ہوجاتے ہیں۔اس نور سے محدود مقدار میں ہی منور ہوسکتے ہیں لیکن یہاں پر مُثل اعلیٰ اور اس نے جس مقدار سے تمسک کیا ہے ان میں فرق پایا جاتا ہے۔مُثل اعلیٰ ذہن کے حدود سے خارج ہے لیکن وہ نور کے ایک ٹکڑے سے متمسک ہوجاتا ہے یہ ٹکڑا مقید ہے لیکن مثل اعلیٰ مطلق ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ہمیشہ آپ کو ہر وہ چیز جو آپکے وجود ذہنی میں ہے اور جو کچھ خدا کے پاس ہے ان کے آپس میں فرق رکھنے کی سفارش کی ہے۔ وجود ذہنی اور مثل اعلیٰ میں فرق رکھنے کی تاکید ہوئی ہے بلکہ یہاں تک کہا ہے کہ اسم اور مسمّٰی میں فرق رکھیں اور فرمایا کہ اسم کی عبادت جائز نہیں ہے اور عبادت ہمیشہ مسمّٰی کیلئے ہونا چاہئے۔ کیونکہ

اسم ایک وجود ذہنی سے بڑھ کر کچھ اور نہیں ہے۔ یہ اسم فقط خدا نے ان کے ذہن میں متعارف کیا ہے اور انسان کا ذہن ہمیشہ اپنی جگہ محدود ہے لہٰذا عبادت ہمیشہ مسمّٰی کیلئے ہونی چاہیے نہ کہ اسم کیلئے۔ جو مطلق ہے وہ مسمّی ہے اور اسم اپنی جگہ مقید و محدود ہے۔ ذہنی توجہات ایک ذہن کی حد تک باقی رہیں گی لیکن صفت مثل اعلیٰ خدا سے قائم ہے اس کے بارے میں تفصیلی گفتگو آگے کریں گے۔

روز چہارشنبہ ۱۸ جماد الثانی ۱۳۹۹ھ

درس یازدہم

اعوذباللہ من الشیطان الرجیم   بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
وافضل الصلوات علی سیدالخلق محمدوعلی الھداۃ المیامین
من الہ الطاھرین

انسان کامُثُل اعلیٰ خدا ہے:

قال سبحانہ وتعالیٰ ﴿یاایُّھاالانِسانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلی رَبِّکَ کَدْحاًفَمُلٰاقِیہِ﴾

اے انسان تو اپنے پروردگار کی طرف جانے کی کوشش کررہا ہے تو ایک دن اس کا سامنا ہوگا'' (انشقاق/۶)۔ اس آیت کریمہ کے تحت خداوندمتعال انسان کا سب سے اعلیٰ وارفع ہدف ہے۔ اس آیت میں انسان سے مراد کوئی خاص انسان نہیں ہے بلکہ کل انسانیت مراد ہے۔ انسانیت اپنی تمام تگ ودواور مشقت کے ساتھ خدا کی طرف متحرک ہے یعنی خدا کی طرف مسلسل حرکت میں ہے۔ اس حرکت میں وہ مشکلات اورزحمتیں اُٹھاتا ہے۔ کیونکہ یہ اس کی عادی حرکت نہیں ہے بلکہ تکامل کی طرف ایک ارتقائی اورصعودی حرکت ہے۔

یہ انسان جو پہاڑوں پر چڑھتا ہے تاکہ اس کی چوٹی تک پہنچے اوراس راہ میں تکالیف برداشت کرتا ہے اس راستہ کو طے کرنے میں مشکلات اٹھاتا ہے اورجدوجہد کرتا ہے۔ اسی طرح انسان جب خدا کی طرف حرکت کرتا ہے تو یہ بلندی اور کمال کی طرف حرکت ہے۔ یہ حرکت بھی زحمتوں پر مشتمل ہے۔ یقیناً حرکت کیلئے ایک راستہ چاہیئے جو متحرک اور ہدف کے درمیان ہو۔ یہاں اس راستہ کو قرآن کی آیات میں مختلف ناموں سے بیان کیا ہے۔ کبھی سبیل اللہ کہا ہے، کبھی اسے صراط، کبھی صراط اللہ، راستے کیلئے یہ مختلف صیغے قرآن

نے استعمال کیئے ہیں وہ راستہ جو اس حرکت کیلئے ضروری ہے اورجیسا کہ حرکت کیلئے راستہ کی ضرورت ہے اسی طرح راستہ کیلئے بھی حرکت کا ہونا ضروری ہے اوریہ آیت کریمہ ﴿یاایُّھاالانِسانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلی رَبِّکَ کَدْحاًفَمُلٰاقِیہِ﴾ ایک قائم حقیقت کی بات کررہی ہے۔ ایک ثابت موضوع کے بارے میں گفتگو ہورہی ہے۔ اس آیت میں لوگوں کو حرکت کی دعوت نہیں دی جارہی کہ خدا کے راستے پرحرکت کرو۔ یہاں طلب اور تحریک کی بات نہیں ہورہی ہے جیسا کہ دیگر آیات اورمقامات پرذکر ہوا ہے۔

اس آیت میں یہ نہیں فرمایا کہ اے لوگو آجاؤ خدا کے راستے پر یا خدا کی طرف رجوع کرو۔ بلکہ فرماتے ہیں کہ تم خود خدا کی طرف زحمتوں کے ساتھ حرکت میں ہو۔ یہاں زبان خبر سے ایک حقیقت کی خبر دی جارہی ہے اوروہ یہ ہے کہ تاریخ میں انسان کا ہرقدم اور ہرحرکت خداوندسبحان کی طرف ہے اورحرکت خداوندسبحان کی طرف حرکت ہے حتیٰ وہ گروہ جو پست اقدار سے متمسک ہے جو جعلی خداؤں کی پرستش کرتے ہیں اوراپنے لئے ایک حرکت اپنائے ہیں وہ اس لمبے سفر میں مومنین کے ہمسفر ہیں۔ حتیٰ کہ وہ گروہ جسے قرآن نے مشرکین کے نام سے پکارا ہے بھی اپنے حرکت میں ان اقدام کو خدا کی طرف بڑھاتے ہیں۔ یہ اقدام اپنے کرداراوراپنی ضخامت کے مقدار کے مطابق خدا سے قریب ہونگے لیکن احساس ذمہ داری کے ساتھ پیش قدمی کرنا اورغیرمحسوس انداز میں آگے بڑھنے میں فرق ہے۔ اس بارے میں تفصیلی گفتگو بعد میں ہوگی۔

لیکن جب انسان بیداراورآگاہانہ اس مُثُل اعلیٰ کی طرف حرکت کرتا ہے تو اس کی یہ حرکت ذمہ داریا مسئول حرکت ہوگی۔ یہاں اسکی پیش قدمی فقہ کی زبان میں عبادت تصور ہوگی۔ یہ اپنے اوپرعبادت کا رنگ ڈالے گا ان کیلئے لمبے راستہ کا سفر ہوگا اورکائنات کے عرض کے ساتھ ہم آہنگ ہوگا۔ لیکن اگرپیش قدمی اس مُثُل کے بارے میں سوچے سمجھے بغیر ہو تو یہ بھی ایک حرکت ہے جو خدا ہی کی طرف حرکت ہے لیکن ایک غیرذمہ داراورغیرمسئول حرکت ہے، چنانچہ ہم آگے بیان کریں گے۔

لہٰذا انسان کا ہر قدم خدا کی طرف ہے حتٰی ان لوگوں کا قدم جو سراب کے پیچھے دوڑتے ہیں جیسا کہ آیت میں آیا ہے کیونکہ جو اجتماعی سراب کے پیچھے حرکت کرتے ہیں، پست اقدار کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ جب یہ لوگ اس سراب تک پہنچتے ہیں تو انھیں وہاں کچھ نہیں ملتا۔ وہاں یہ لوگ خدا کو پاتے ہیں جیسا کہ گذشتہ آیات میں بیان ہوا ہے۔

لہٰذا راستہ کی انتہا خدا ہے۔ لیکن یہ انتہا جغرافیائی انتہا نہیں ہے، مکانی راستہ نہیں ہے۔ اس بارے میں ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ کربلا راستہ کی انتہا ہے جو انسان نجف اور کربلا کے درمیان حرکت کرتا ہے کربلا نجف والوں کیلئے ایک جگہ کے حوالے سے راستہ کی انتہا ہے۔ یعنی اس راستہ کے آخر میں واقع ہے یعنی کربلا درمیان میں نہیں آتا بلکہ آخر میں ہے۔ چنانچہ ایک انسان کربلا کی طرف جانا چاہتا ہے تو وہ اگر راستہ کے درمیان بیٹھ جائے تو اس نے کربلا کا کچھ بھی حصہ نہیں پایا ہے۔ اسے کربلا کی مٹی نصیب نہیں ہوگی کیونکہ کربلا اس راستہ کے آخر میں موجود ہے یہ ایک جغرافیائی سفر ہے لیکن خداوند سبحان جغرافیائی لحاظ سے ملتا نہیں ہے اللہ تعالیٰ سبحانہ مطلق ہے۔ وہ مُثل اعلیٰ ہے۔ وہ مطلق حقیقی ہے اور ایک مطلق ہونے کے حوالے سے وہ پورے راستہ میں موجود ہے اور جو خدا کی طرف حرکت میں ہے اسکے اور خدا کے درمیان فاصلہ نہیں ہے۔ یعنی اسکی کوئی حد نہیں ہے کہ اتنے میل جانے کے بعد خدا سے مل جائے گا۔ کیونکہ خدا کیلئے کوئی حد نہیں ہے خدا تمام مسافت میں موجود ہے۔ جو نصف راستے پر پہنچے تو وہ بھی خدا کو پائے گا۔ جو سراب پر پہنچے تو وہ بھی خدا کو پائے گا اور جو بیٹھا ہے وہ بھی خدا کو پائے گا جیسا کہ آیت میں آیا ہے۔ اس نے خدا کو پایا اور اپنا حساب پایا کیونکہ مطلق تمام راستہ پر موجود ہے۔ جتنا راستہ دشوار ہوگا آگے بڑھنا مشکل ہوگا وہ مُثل اعلیٰ کو پائے گا۔ وہ جہاں بھی توقف کرے گا خدا کو پائے گا یعنی حرکت کو روکے یا آگے بڑھائے خدا کو پائے گا کیونکہ خدا مطلق ہے۔

خداوند سبحان مطلق ہے پس راستہ بھی لامتناہی ہے اور یہاں قرب خدا دائمی ہے۔ جتنا آگے بڑھیں گے وہ قرب سے نزدیک ہونگے لیکن یہ قریب ہونا نسبی ہے۔

انسان راستہ پر صرف قدم اٹھا رہا ہے، راستے کو طے نہیں کر رہا کیونکہ محدود مطلق تک نہیں پہنچ سکتا یعنی محدود لامتناہی تک نہیں پہنچ سکتا۔ انسان اور اسکے مُثل اعلیٰ میں فاصلہ بہت طویل ہے۔ مسافت غیر متناہی ہے۔ یہاں خدا نے اسکے لئے غیر متناہی ایجادات کا موقع فراہم کیا ہے۔ ترقی اور تکامل کے بے حساب میدان رکھے ہیں کیونکہ یہ وہ راستہ ہے جسکی کوئی انتہا نہیں ہے۔

مُثل اعلیٰ حقیقی کا بشریت کی حرکت پر اثر:۔

جب نوع انسانی اس مثل اعلیٰ حقیقی کو اپناتے ہیں، جب انسانی فکر اور خارج میں واقع موجود (جسے اس مثل اعلیٰ نے حقیقی طور پر قائم کیا ہے) میں مطابقت اور توافق قائم ہوتا ہے جیسا کہ آیت کریمہ میں بیان ہوا ہے انسانی حرکت میں جب سوچ اور خارج میں واقع میں مطابقت ہو اس لحاظ سے کہ یہ خدا کی طرف متوجہ ہوئے اور خدا کی طرف حرکت کرنے والا ہے تو اس حرکت میں کمی اور کیفی لحاظ سے تغیر آئے گا اور یہ حرکت جلد ہی اس میں کمی اور کیفی لحاظ سے تغیر لائے گا۔

کمیت میں تغیر:۔

ہم نے اشارہ کیا کہ یہ حرکت جو مثل اعلیٰ حقیقی کی طرف جاری ہے اس حوالے سے یہ راستہ غیر متناہی ہے یعنی یہاں ترقی ابتکار اور نمو ہمیشہ قائم و دائم اور ابدی صورت میں موجود ہے اور انسان کے سامنے یہ دروازہ ہمیشہ کھلا ہے۔ انسان جب یہ مثل اعلیٰ اپناتا ہے تو اسے اس راستے میں حائل ہونے والے تمام جعلی معبودوں، جعلی بتوں کو جو اسکے راستے میں پیدا ہوں گے اور مثل اعلیٰ کی راہ میں رکاوٹ بنیں گے انھیں دور کرنا ہوگا۔

یہاں سے واضح ہوا کہ دین توحید ہمیشہ مختلف قسم و انواع کے معبودوں، پست اقدار اور تکراری مثل کے ساتھ جنگ میں ہوتا ہے۔ یہ سب کوشش کرتے ہیں کہ انسانی حرکت کو محدود کریں یا کوشش کرتے ہیں کہ انسانی حرکت کو ایک نقطہ تک روکیں اور کہتے ہیں

: اے انسان رک جاؤ یہ ''اِلٰہ'' جن کا یہ ارادہ ہے کہ انسان کو راستہ میں روکیں اور ایک معین نقطہ پر توقف کرائیں تو دین توحید نے طول تاریخ میں ہمیشہ ان چیزوں کے خلاف جنگ کا علم بلند کیا ہے تو یہ مثل اعلیٰ انسانی حرکت میں تغیر کمی لائیں گی کیونکہ یہ مثل اعلیٰ انسان کو بندشوں سے آزاد کرواتی ہیں ان جعلی حدود و قیود سے آزاد کراتی ہیں تا کہ وہ اپنی حرکت کو جاری رکھ سکے۔

کیفیت میں تغیر

کیفیت میں تغیر جو یہ مثل اعلیٰ اس حرکت میں پیدا کریں گی یہ تغیر درحقیقت انسان کی اندرونی حِس جدل و تناقص کا حل پیش کرے گا۔ انسان کو اسکی مسئولیت کا احساس دلائے گا۔ انسان ان مثل اعلیٰ پر ایمان لانے کی وجہ سے اس کے ذریعہ بیدار ہے کہ اس کائنات کی حدود کے بارے میں جو علم حاصل ہوگا اس بیداری سے اس میں ایک موضوعی شعور بیدار ہوگا اسے اس مثل اعلیٰ کے مقابل میں ایک گہری مسئولیت کا احساس دلائیں گی اور بشر کی تاریخ مثل میں یہ پہلا مثل ہے کہ جو بشر کو طول تاریخ میں حرکت دے رہا ہے۔

کیونکہ یہ مثل اعلیٰ حقیقی اور واقعیت پر مبنی ہے۔ یہ انسان سے جدا ہے اسی وجہ سے یہ انسان کو ایک عقلی اور منطقی اور حقیقی مسئولیت دیں گی کیونکہ حقیقی مسئولیت دو پہلوؤں اور دو طرف کے بغیر واقع نہیں ہوسکتا۔ ایک مسئول اور دوسرا **مسئول لدیه** یعنی جس کے حضور میں وہ حاضر ہے۔ جب ایک انسان کا یہ ایمان نہیں کہ وہ اعلیٰ وارفع ہستی کے سامنے حاضر ہے تو اسکے لئے ممکن نہیں کہ وہ ایک حقیقی شعور اپنے اندر پیدا کرے۔ مثلا وہ پست مثل وہ ''اِلٰہ'' اور وہ مجسمے کہ جو انسانی تاریخ میں پیش آئے ہیں انسان کی حرکت کے راستے میں واقع ہوئے ہیں یہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے جسے ہم دیکھ رہے ہیں یا جس طرح ہم اس کا تجزیہ و تحلیل کر رہے ہیں بلکہ یہ بشر کی اپنی ساخت ہیں اسکی اپنی پیداوار ہیں یعنی یہ مثل اور ''اِلٰہ'' انسان کا ایک جز ہے یہ اسکے وجود سے نکلی ہیں لہٰذا جو چیز انسان کے اندر سے نکلی ہے ممکن نہیں اسکے سامنے خود کو جوابدہ تصور کرے خود کو اسکے سامنے خاضع کرے جیسا کہ

قرآن کریم نے اس طرف اشارہ کیا ہے:

﴿**ان هی الا اسمآء سمیتموها**﴾ یہ وہ مثل ہیں جو انسان کے اندر مسئولیت ایجاد نہیں کر سکتے۔ یہاں ممکن ہے کہ یہ کوئی قوانین یا عادات جعل کر سکیں یا کوئی اخلاق پیدا کر سکیں لیکن یہ سب ظاہری پردہ کی طرح ہونگی جب بھی انسان کو موقع ملے گا ان عادات سے خود کو بری کرے گا، ان اخلاق سے خود کو آزاد کرلے گا کیونکہ وہ اس میں آزاد ہے لہٰذا یہ قوانین خود بخود ختم ہو جائیں گے۔

جب کہ مثل اعلیٰ دین توحید ہے جو پوری تاریخ میں انبیاء نے حقیقت و واقعیت کے طور پر پیش کی ہیں۔ یہ انسان کے اندر سے نہیں نکلیں بلکہ اوپر سے اس پر نافذ ہوئی ہیں یہ بشر کی پیدا کردہ نہیں ہیں لہٰذا جلد ہی انسانیت کے اندر مسئولیت کا شعور پیدا کرتی ہیں کیونکہ پوری تاریخ انسانیت میں انبیاء نے سب سے زیادہ استقامت کیوں دکھائی ہے؟ پوری تاریخ میں سب سے زیادہ پاک انبیاء کے انقلاب کیوں رہے ہیں؟ یہ ذوات تاریخ میں کسی قسم کی سازش میں کیوں نہیں آئیں، کسی سے کسی قسم کا کیوں لین دین نہیں کیا؟ کیوں دائیں بائیں کسی طرف جھکاؤ نہیں؟ ایسا کیوں ہوا؟ جب کہ ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ بہت سے انقلابیوں نے شکست کھائی ہے جبکہ ہم نے یہ کبھی نہیں سنا کہ کسی نبی نے توحید میں شکست کھائی ہو یا اپنی رسالت اور وظیفہ میں دائیں بائیں جھکاؤ اختیار کیا ہو۔ یا وہ رسالت جو ان کے ہاتھ میں تھی یا وہ کتاب جو ان پر آسمان سے نازل ہوئی تھی اس سے انحراف کیا ہو۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ جو مثل اعلیٰ ان کے پاس موجود تھیں وہ ان سے جدا تھیں ان کے اوپر تھیں ان مثل اعلیٰ نے انھیں ایک شعور اور احساس کا گلدستہ انکی روح کو دیا جو ان کے پورے جسم میں سرایت کر گیا، جو انکے تمام افکار و عواطف اور شعور میں حلول کر گیا۔ یہاں سے ہم کہتے ہیں کہ نبی ہمیشہ معصوم ہوتا ہے۔

یہاں سے مثل اعلیٰ حقیقت میں انسانی حرکت میں ایک تغیر کیفیت لاتی ہے کیونکہ وہ اسے احساس مسئولیت دیتی ہے۔ یہ احساس مسئولیت ایک عارضی حالت نہیں ہے۔ یہ

انسانی حرکت میں ثانوی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ اس حرکت کو کامیاب بنانے میں اور انسان کے اندر موجود تناقض اور جدل کو حل کرنے میں یہ ایک بنیادی شرط ہے کیونکہ انسان اپنی ترکیب اور خلقت کے حوالے سے تناقضات کی زندگی بسر کرتا ہے کیونکہ وہ ایک مٹی کے کیچڑ اور ایک روحِ الٰہی سے مرکب ہے چنانچہ آیات کریمہ میں بیان ہوا ہے۔ کہ انسان کو مٹی سے خلق کیا گیا ہے اور اس میں خدا کی روح پھونکی گئی ہے:

﴿الذی احسن کل شیءٍ خلقه وبدا خلق الانسان من طینٍ﴾ ''اس نے ہر چیز کو حسن کے ساتھ بنایا ہے اور انسان کی خلقت کا آغاز مٹی سے کیا ہے'' (سجدہ/۷)

﴿ثم سوّٰه ونفخ فیه من روحه﴾ ''اس کے بعد اسے برابر کر کے اس میں اپنی روح پھونک دی ہے'' (سجدہ/۹)

پس انسان میں دو نقیض جمع ہوئی ہیں یا ان دو کا وصل ہوا ہے۔ ایک مٹی ہے جو اسے زمین کی طرف کھینچتی ہے جو اسے شہوات اور پست چیزوں کی طرف کھینچتی ہے اسے ہر اس چیز کی طرف کھینچتی ہے جو زمینی ہے نابودی اور انحطاط تک۔ جبکہ اس کے برعکس روح خدا جو اس میں نفخ ہوئی ہے اسے اوپر کی طرف کھینچتی ہے۔ وہ انسان کی انسانیت کو بلند کرتی ہے وہ اسے صفات خدا اور اخلاق خدا کی طرف کھینچتی ہے۔ چنانچہ احادیث میں آیا ہے خدا کے اخلاق اپناؤ۔ یہ اسے اس علم کی طرف لے کر جاتی ہے جسکی کوئی حد نہیں ہے، اس طاقت وقدرت کی طرف لے کر جاتی ہے جس کی کوئی انتہا نہیں، اس عدل کی طرف لیکر جاتی ہے جسکی کوئی حد نہیں ہے۔ اسے وجود رحمت کی طرف لیکر جاتی ہے، اسے اخلاق الٰہی کی طرف لیکر جاتی ہے۔

یہ انسان تناقضات کی لہروں پر ہے۔ وہ تناقضات وجدل جو اسکی ترکیب میں موجود ہیں جیسا کہ قصہ آدم میں ہم انشاء اللہ بیان کریں گے۔ ان تناقضات وجدل کو ختم کرنے کا ایک ہی حل ہے اور وہ ہے احساس مسئولیت۔ لیکن وہ احساس مسئولیت نہیں جو خود ان جدل کی پیداوار ہے کیونکہ جو خود اس سے پیدا ہوا ہے وہ کیسے اس جدل کو ختم کر سکتا

ہے، کیونکہ اس صورت میں یہ مسئولیت فرزند جدل ہوگی۔ یہ ان تناقضات کی پیدا کردہ ہے۔ بلکہ احساس مسئولیت سے ہماری مراد وہ موضوعی احساس مسئولیت ہے جو مُثُل اعلیٰ دیتی ہے، جو انسان سے مافوق ہے۔ انسان اس مثل اعلیٰ کی روشنی میں رب قادر، سمیع وبصیر اور حساب لینے والے کے حضور خود کو پاتا ہے۔ وہ ذات جو ظلم کی سزا اور عدل کی جزا دینے والی ہے۔ یہ مسئولیت موضوعی وہی تغیر کیفیت ہے جو انسان کی اندر موجود تناقضات وجدل کو حل کر سکتی ہے کہ جو انسان کی طبیعت اور ترکیب کو احاطہ کئے ہوئے ہیں۔

انبیاء اور مترفین کی جنگ:۔

دین کا کردار یہ ہے کہ اس نے اس طویل اور لمبے راستے کو انسان کیلئے آسان گزر گاہ بنائے۔ دین اسکی رکاوٹوں کو دور کر کے حرکت کی کمیت وکیفیت دونوں میں رشد ونمو پیدا کرے اور ان جعلی مثل اور خود ساختہ تکراری اقدار سے جنگ کرتا ہے جو ایک طرف سے حرکت کو روکنا چاہتی ہیں اور دوسری طرف سے اسے احساس مسئولیت سے نکالنا چاہتی ہیں۔ اسی وجہ سے ہے کہ انبیاء جنگ جیسا کہ بیان ہوا ان خود ساختہ اور جعلی معبودوں کے ساتھ رہی ہے۔

جیسا کہ بیان ہوا جب ان اقداروں میں ہر ایک اقدار ترقی کر کے اپنی آخر حد کو پہنچے اور تمثال (فوٹو) میں تبدیل ہونا شروع ہو تو یہ لوگوں کے ایک گروہ میں پایا گیا جو ان بتوں کا دفاع کرتے ہیں کیونکہ انکی مصلحتیں انہی بتوں سے وابستہ ہیں انہی اقدار سے مربوط ہیں۔ انکی عیش وعشرت اور دنیاوی ومادّی خواہشات انہی مثال کے بقاء سے مربوط ہیں جو ابھی تمثال میں بدل گیا ہے لہٰذا وہ ہمیشہ اپنی ان مصلحتوں، اپنی دنیا اور اپنے عیش وعشرت کے دفاع میں انبیاء کے مقابل کھڑے ہوئے۔

یہاں سے ہے کہ قرآن کریم نے قوانین تاریخ میں سے ایک قانون کا اعلان کیا کہ انبیاء کو ہمیشہ اپنے اجتماع کے مترفین کا سامنا ہوتا ہے یعنی ایک طرف ہیں اور دوسری طرف مترفین۔ مترفین وہی ہیں جو ان مُثُل کے تمثال (فوٹو) میں بدل جانے کے بعد ان

سے مستفید ہوتے ہیں۔ ان سے یہی مترف فائدہ اٹھاتے ہیں۔وہ فائدہ کیا ہیں؟اس معاشرے میں مترفین جوفائدہ اٹھاتے ہیں وہ یہ ہیں کہ وہ اپنے فائدے کولوگوں کے کھاتے میں ڈالتے ہیں۔انہوں نے ان تمثال کواپنے وجود کی بقاء کا مسئلہ بنایا۔ یہاں سے ہے ایک طبیعی بات ہے کہ مترفین جوان تمثال سے فائدہ اٹھانے والے تھے انبیاء کے مقابلے میں اتر آئے جسکا ذکران آیات میں ہے:

﴿وکذٰلک ماارسلنامن قبلک فی قریةٍ من نذیرٍالّاقال مترفوھااناوجدناآباء ناعلیٰ امةٍ واناعلیٰ اٰثرھم مقتدون ﴾''اوراسی طرح ہم نے آپ سے پہلے کسی بستی کی طرف کوئی تنبیہ کرنے والانہیں بھیجا مگر یہ کہ وہاں کے عیش پرستوں نے کہا: ہم نے اپنے باپ دادا کوایک رسم پر پایا اورہم انہی کے نقش قدم کی پیروی کررہے ہیں''(زخرف/۲۳)

﴿ومآارسلنافی قریةٍ من نذیرٍالاقال مترفوھاانابماارسلتم بہٖ کافرون ﴾''کبھی ایسانہیں ہوا کہ ہم نے کسی بستی میں ایک خبردار کرنے والانہیں بھیجا ہواوراُس بستی کے کھاتے پیتے لوگوں نے یہ نہ کہا ہوکہ''جو پیغام تم لیکرآئے ہواس کوہم نہیں مانتے''(سباء/۳۴)

﴿ساصرف عن اٰیٰتی الّذین یتکبّرون فی الارض بغیرالحق وان یّرواکلّ اٰیةٍ لایؤمنوابھا وان یّرواسبیل الرشد لایتخذوہ سبیلاً وان یّرواسبیل الغی یتّخذوہ سبیلاًذٰلک بانھم کذبوابِاٰیٰتِناوکانواعنھاغافلین ﴾''میں عنقریب اپنی آیتوں کی طرف ان لوگوں کوپھیردوں گاجوروئے زمین میں ناحق اکڑتے پھرتے ہیں اور یہ کسی بھی نشانی کودیکھ لیں ایمان لانے والےنہیں ہیں۔ان کا حال یہ ہے کہ ہدایت کاراستہ دیکھیں گےتواسے اپناراستہ نہ بنائیں گے اورگمراہی کاراستہ دیکھیں گےتواسے فوراًاختیارکرلیں گے۔ یہ سب اس لئے ہے کہ انھوں نے ہماری نشانیوں کوجھٹلایاہےاوران کی طرف سے غافل تھے''(اعراف/۱۴۶)

﴿وقال الملامن قومہٖ الذین کفرواوکذبوابلقاء الاٰخرة واترفناھم فی الحیٰوة الدنیاماھٰذاالابشرمثلکم یاکل ممّاتاکلون منہ ویشرب مماتشربون ﴾''توان کی قوم کےان رؤساءنےجنہوں نے کفراختیارکیا تھااورآخرت کی ملاقات کاانکارکردیا تھااورہم نے انہیں زندگانی دنیامیں عیش وعشرت کاسامان دے دیا تھاوہ کہنے لگے کہ یہ توتمہاراہی جیسا ایک بشرہے جوتم کھاتے ہووہی کھاتا ہےاورجوتم پیتے ہووہی پیتا بھی ہے''(مومنون/۳۳)

دین توحیدہی ان کے معبودوں اوران مثُل کوجومجسمہ یاتمثال کی شکل اختیارکرچکے ہیں کوختم کرکےان مترفین کے مصلحتوں کوختم کردیتا ہےدین ہی بشریت کاان پست اقدار سے رابطہ توڑتا ہےلیکن دین بشریت کاان پست مُثُل سے رابطہ توڑنااس لئےنہیں ہے کہ اسے زمین بوس کریں،اس لئےنہیں ہے کہ اسے ایک ایسے انسان میں تبدیل کریں جومٹی کاایک ٹیلہ ہوجس کے پاس کوئی میل ورغبت نہ ہو،جس کا کوئی خواہش نہ ہو،اس لئےنہیں کہ وہ اعلیٰ وارفع کی طرف نظرنہ رکھیں جیسا کہ مادی انقلاب کی حالت ایسی تھی کہ جوتاریخ کے مادی زاویہ سے الھام لیتے تھےاورمادی لحاظ سے تاریخ کوسمجھتے تھے۔ان لوگوں نے بھی جعلی خداؤں سے جنھیں خدا کہتے تھے جنگ لڑی ہےاورکہایہ قوموں کوپلانے والی افیون ہے اورہم نے بھی جعلی مثل اعلیٰ سے جنگ لڑی ہےلیکن ہماراجنگ لڑنااس لئےنہیں کہ ہم ان کو انسان سے حیوان میں تبدیل کریں ہماری جنگ اس لئےنہیں کہ انھیں اوپرسے نیچےگرائیں بلکہ ہماری جنگ کامقصدانسان کاان پست اقدارسے رابطہ توڑناہےتاکہ اسے مثل اعلیٰ سے جوڑاجائےاورخداسے رابطہ قائم ہوجائے۔

مثل اعلیٰ حقیقی اپنانے کی شرائط یااسکے تقاضے:۔

انسانی تاریخ میں مثل اعلیٰ حقیقی جوانسانی حرکت میں کمیت وکیفیت دونوں حوالوں سےتغیرلاتی ہیں۔ایک ایسی مثل اعلیٰ کااپنانا چندامورپرمتوقف ہےیعنی مثل اعلیٰ حقیقی اپنانے کیلئے جوانسانی حرکت میں کمیت وکیفیت دونوں حوالوں سےتغیرلائے وہ چندامورپر

متوقف ہے۔

۱۔ یہ مُثل اعلیٰ افکار ونظریات کے حوالے سے واضح وروشن ہونا چاہئے۔ اور اس مثل اعلیٰ کا طول تاریخ میں افکار ونظریات کے حوالہ سے روشن وواضح ہونا عقیدہ توحید پر قائم ہے۔ عقیدہ توحید کہ جو ایمان باالله پر حاوی ہے جو تمام مثل، تمام غایات اور خواہشات اور تمناؤں اور تمام انسانی نظروں کو اس مثل اعلیٰ سے ربط دیتا ہے۔ یہ مثل اعلیٰ علم کل ہے، قدرت مطلقہ ہے مجسمہ عدالت ہے، رحمت کل ہے، جبارین سے انتقام لینے کا اعلیٰ مظہر ہے۔ یہ مثل اعلیٰ جس میں تمام خواہشات اور غایات واہداف جمع ہوتے ہیں۔ یہ مثل اعلیٰ ہمیں توحید کے بارے میں واضح نظریہ دیتا ہے۔ ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ صفات خدا کے ساتھ، اخلاق خدا کے ساتھ کیا رویہ ہونا چاہیئے یا انھیں کیسے اپنانا چاہیئے ۔ نہ اس لحاظ سے کہ یہ صفات وحقائق ہم سے منفصل اور جدا ہوئے ہیں جیسا کہ یونانی فلاسفہ سمجھتے ہیں بلکہ صفات خدا اور اخلاق خدا سے ہمارا معاملہ ایک قیادت ورہبری کے حوالے سے ہے۔ ان مثل اعلیٰ کو اپنی زندگی کا ہدف سمجھنا ہے۔ خدا تک جانے کے راستے کا راہنما سمجھنا ہے۔ ان تمام شرائط کو عقیدہ توحید ہی پورا کرتا ہے یعنی مثل اعلیٰ کو افکار ونظریات کے حوالہ سے واضح وروشن کرنا ہے۔

۲۔ اس مثل اعلیٰ سے ایک ایسی روحی طاقت حاصل ہونی چاہیئے جو طول تاریخ میں ارادۂ بشری کیلئے سرمایہ اور ایندھن ہو۔ یہ طاقت وقدرت جو خداوند عالم سے ملتی ہے عقیدۂ قیامت میں ظاہر ہوتی ہے۔ حشر اور اس زندگی کے امتداد کے عقیدے میں بھی یہی طاقت ہے۔ یوم قیامت پر عقیدہ انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ تاریخ کا یہ چھوٹا میدان جہاں انسان کھیلتا ہے برزخی اور حشر کے میدانوں سے تاریخ ساز رابطہ رکھتا ہے اور ان خطرناک اور بڑے میدانوں میں انسان کی حرکت اس تاریخی میدان میں انسان کے کردار سے مربوط ہے۔ یہی عقیدہ اسے روحی طاقت عطا کرتا ہے۔ یہی قدرت انسان کے ارادہ کو حرکت میں رکھتی ہے۔

۳۔ یہ مثل اعلیٰ جس کے بارے میں ہم ابھی گفتگو کر رہے ہیں ان مثل اعلیٰ سے مختلف ہے جسے ہم نے پہلے بتایا تھا کہ وہ تکراری اور پست مثل اعلیٰ ہیں۔ اس لحاظ سے کہ یہ مثل انسان سے جدا ہے۔ یہ انسان کا جز نہیں ہے۔ انسان کا پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ انسان سے الگ چیز ہے۔ یہ خود حقیقی واقع ہے، خود قائم ہے اور ہر جگہ موجود ہے لیکن انسان کا جز نہیں ہے۔ یہ جدائی یہ انفصال خود اپنی جگہ انسان اور مثل اعلیٰ کے درمیان میں رابطہ کی ضرورت کو بتاتا ہے اور رابطہ کا متقاضی ہے تاکہ انسان اور مثل اعلیٰ کے درمیان رابطہ قائم ہو۔ جب کہ دوسرے مثل جو پہلے بیان ہوئے وہ انسانی تھے، وہ بشر کی پیدوار تھے۔ لہٰذا رابطہ کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ اسکی مخلوق ہے۔ جی ہاں طول تاریخ میں فرعون اور نمرود نے خود کو بشر اور سورج پرستی اور ستارہ پرستی کے درمیان رابطہ دینے والا قرار دیتے تھے لیکن یہ ایک رابطہ وجودی ہے جو انہوں نے جعل کیئے ہیں۔ چونکہ انکی الوہیت وہمی ہے، انکے اذہان کی اختراع ہے، انسان کی پیدا کردہ ہے لیکن جس مثل اعلیٰ کی ہم گفتگو کرتے ہیں وہ انسان سے جدا ہے۔ لہٰذا انسان اور اس مثل اعلیٰ کے درمیان ربط کی ضرورت ہے۔

یہ ربط نبوت کے سانچے میں شخصیت نبی میں مجسّم ہوتا ہے۔ نبی وہ انسان ہے جو حکم خدا سے پہلی اور دوسری شرط کو ربط دیتا ہے یعنی انسان کے اندر مثل اعلیٰ کے بارے میں ایک واضح وروشن نظریہ اور عقیدہ، قیامت سے جو روحی طاقت حاصل ہوتی ہے ان دونوں میں رابطہ قائم کرتا ہے ان دونوں عناصر کے درمیان رابطہ پیدا کرتا ہے پھر یہ نبوت کے کردار کی شکل میں ظہور کرتا ہے کہ جو مثل اعلیٰ اور انسان کے درمیان رابطہ دینے والا ہے تاکہ اس مرکب کو بشریت تک بشیر اور نذیر ہوتے ہوئے پہنچا دیں۔

۴۔ بشریت جب ایک ایسے مرحلہ میں داخل ہوتی ہے جسے قرآن نے مرحلہ اختلاف کہا ہے اسکا بیان جلد ہی انہی دنوں میں آپ کے سامنے پیش کریں گے۔ چنانچہ یہاں تنہا بشیر ونذیر کا آنا کافی نہیں ہے چونکہ اختلاف کے دور سے مقصود وہ پست مثل یا تکراری مثل یا وہ جعلی معبودوں کا انتخاب ہے یہ ''اِلٰہ'' جن کی پرستش ہوتی ہے درحقیقت

انسان اور مثل اعلیٰ حقیقی (خداوندمتعال) کے درمیان حجاب ہیں، مانع ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے بشران جعلی خداؤں کے خلاف لڑنے کیلئے میدان میں اترے۔ ان طاغوتوں اور پست اقدار کے خلاف جنگ کرے، جو خود کو بشریت کا نگہبان بنائے ہیں اور ان موانع اور رکاوٹوں کا راستہ روکے جو خدا تک جانے کے راستے میں حائل ہیں۔ ان ''اِلٰہ'' کے خلاف جنگ کی ضرورت ہے۔ چنانچہ یہاں ایک قیادت کی ضرورت ہے جو اس جنگ کی ذمہ داری کو اٹھائے۔ یہ قیادت امامت ہے۔ یہاں سے دور امامت شروع ہوتا ہے۔ امام وہ ہے جو اس معرکہ میں ذمہ دار ہے۔ امامت ایک دفعہ نبوت کے ساتھ ہے اس میں مدغم ہے جیسا کہ قرآن نے ذکر کیا ہے جس کے بارے میں ہم انشاء اللہ گفتگو کریں گے۔ احتمال قوی یہ ہے کہ یہ دور حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے سے شروع ہوا۔ نبوت امامت سے مرکب ہے لہٰذا یہ تسلسل قائم رہا لیکن نبوت کا سلسلہ ختم ہوا اور امامت کا تسلسل باقی رہا۔ پیغمبر میدان میں نہیں لیکن میدان میں جنگ جاری ہے اور ان ''اِلٰہ'' اور جعلی معبودوں کو ختم کرنے کی ضرورت ہمیشہ کیلئے ہے لہٰذا نبوت کا دور ختم ہونے کے بعد امامت کا دور ہمیشہ کیلئے جاری وساری ہے۔ یہ چوتھی شرط تھی جو تاریخ میں بشریت کیلئے اس مثل اعلیٰ کو اپنانے کیلئے ضروری ہے۔

حرکت بشری میں اصول دین کا کردار:۔

گذشتہ بیان کی روشنی میں ہمارے پاس ایک واضح و روشن لائحہ عمل موجود ہے جسے ہم پنجگانہ اصول دین کہتے ہیں۔ یہ پانچ اصول اپنے طبیعی مراحل کے موقع یا صحیح اور سالم مقام پر انسان کی حرکت کا انتظام کرتے ہیں۔

پہلی اصل: التوحید

توحید ہے جو شرط اول کو پورا کرتی ہے جو انسان کو واضح و روشن فکر دیتی ہے۔ یہی انسان کے تمام نظریات اور تمام غایات کو ایک مثل اعلیٰ میں جمع کرتی ہے اور وہ مثل اعلیٰ خدا

سبحانہ تعالیٰ ہے۔

دوسری اصل: العدل

عدل توحید کا ایک حصہ ہے لیکن اس سے علیحدہ بیان ہوا ہے۔ عدل خدا کی صفات میں سے ہے جیسے صفات علم وقدرت ہیں۔ ہمارے پاس عدل کے بارے میں عقائد کے حوالے سے کوئی خاص امتیاز نہیں ہے جو علم وقدرت کے مقابلہ میں ہو۔ لیکن عدل کو جو یہاں خاص امتیاز حاصل ہے وہ اجتماعی حوالہ سے ہے، قیادت ورہبری کے حوالہ سے امتیاز حاصل ہے کیونکہ عدل وہ صفت ہے جو اجتماعی حرکت میں نمایاں ہوتی ہے، جو اجتماعی حرکت کو بے نیاز بناتی ہے۔ انسانی اجتماعی حرکت دیگر صفتوں کی بہ نسبت عدل کی زیادہ نیاز مند ہے اور اسی کی راہنمائی اور تربیتی حوالے کی وجہ سے یہ اصول دین میں دوسری اصل کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ یعنی ہم نے کہا کہ صفات خدا، اخلاق خدا کے بارے میں اسلام نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ ہم ان سے وہ سلوک نہ کریں جو ماوراء طبیعت حقائق سے کی جاتی ہے، جن سے ہمارا کوئی ربط نہیں ہے۔ ہمارا ان صفات سے سلوک اس ضمن میں ہے کہ یہ ہمیں راستہ کی راہنمائی کرتی ہیں یہ راستہ میں مینار کا کردار ادا کرتی ہیں۔ یہاں سے واضح ہوا کہ بشریت کو صحیح راستہ دکھانے میں عدل کا بڑا کردار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عدل دیگر صفات سے زیادہ نمایاں ہے ورنہ عدل حقیقت میں توحید کے اندر ہے۔ یہ خود مثل اعلیٰ میں شامل ہے۔

تیسری اصل: النبوت

نبوت ہے جو انسان اور مثل اعلیٰ کے درمیان رابطہ قائم کرنے کا کردار ادا کرتی ہے جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا حرکت بشری میں بشر نے اس مثل اعلیٰ کو اپنایا جو اس سے جدا ہے۔ خود اسکی پیدا کردہ نہیں۔ اس کی فکری نتائج نہیں۔ تو اس حوالے سے بشر ایک رابطہ کا نیاز مند ہے۔ یہ رابطہ نبی میں تجسم پاتا ہے نبوت میں تجسم پاتا ہے بلکہ کل انبیاء صلوات اللہ علیھم اس رابطہ کا کردار ادا کرتے ہیں۔

چوتھی اصل: الامامت

امامت درحقیقت وہی قیادت ہے جونبوت میں مدغم ہے۔ نبی اپنی جگہ امام بھی ہے۔یعنی نبی نبی بھی ہے اور امام بھی۔لیکن نبوت کے ختم ہونے سے امامت ختم نہیں ہوتی کیونکہ معرکہ اپنی جگہ باقی ہے۔ جب رسالت اپنی جگہ باقی ہے تو رسالت محتاج ہے ایک قائد ورہبر کی جو معرکہ میں قیادت کرے۔ یہاں سے ہم کہتے ہیں کہ نبوت کا قیادتی پہلو امامت کی صورت میں باقی رہنا چاہیئے لہٰذا امامت اصول دین میں چوتھا اصل ہے۔

پانچویں اصل :ایمان بیوم القیامة

اصل ایمان بہ آخرت ہے۔ ان چار شرائط میں سے جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں یہی پانچواں اصل اس دوسری شرط کو پورا کرتی ہے۔ یہ انسان میں روحانی طاقت پیدا کرتی ہے۔ یہی انسان میں ایک محرک ربانی پیدا کرتی ہے کہ جس سے انسان کے ارادے میں تجدد پیدا ہوتا ہے، اسکی قدرت میں نمو پیدا ہوتی ہے۔ اسکے اندر احساس مسئولیت پیدا کرتی ہے، ایک ضمانت پیدا کرتی ہے۔

اصول دین یا جو کچھ ہم نے پہلے بیان کیا یہ سب مثل اعلیٰ کوترکیب دینے میں برابر کے شریک ہیں اوران اجتماعی تعلقات کو جسے قرآن کریم نے چار پہلو سے تعبیر کیا تھا ان کے عطا کرنے میں بھی شریک ہیں جن کا ذکر ہم نے چند دن پہلے کیا تھا۔

ہم نے کہا تھا کہ قرآن کریم نے انسانی اجتماع کو چار زاویوں میں پیش کیا ہے نہ کہ تین زاویئے میں ۔قرآن کریم نے اس کونظریہ استخلاف پیش کیا ہے اور ہم نے استخلاف کی شرح بھی پہلے بیان کی اور کہا تھا کہ استخلاف انسانی اجتماع کے چار زاویے بناتا ہے ۔اس میں ایک انسان ہے دوسرا طبیعت ہے تیسرا انسان کا انسان اور طبیعت سے تعلقات ہیں اور چوتھا خدا ہے جو کہ متخلف ہے ان چار گوشہ تعلقات اجتماعی کی دوسری تعبیر وہ صیغہ ہے کہ جس میں یہ پانچ اصول دین مدغم ہیں اور اسکا مقصد اس طویل سفر میں انسان کوحرکت دینا اور خدا کی

طرف لے جانا ہے۔

جو کچھ ہم نے بیان کیا اس سے انسانی حرکت میں انسان کا کردار واضح ہوا۔ یہ بھی واضح ہوا کہ انسان اس حرکت میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور یہ بھی واضح ہوا کہ انسان کے اساس و بنیاد ہونے سے مراد اسکا فزیکی پہلو نہیں بلکہ اسکا داخلی مفہوم ہے۔اس تفسیر کی روشنی میں یہ بھی واضح ہوا کہ انسان کا داخل بنانے کا کردار ان مثل اعلیٰ کو حاصل ہے جنھیں وہ اپناتا ہے۔ کیونکہ مثل اعلیٰ ہی سے غایات بنتی ہیں اور غایات ہی انسان کوحرکت دیتی ہیں تا کہ وہ میدان تاریخ میں سرگرم رہے۔

پس انسان کے داخل کو بنانے میں مثل اعلیٰ کا بنیادی کردار ہے۔ اس طرح ہمارے سامنے چوتھے رکن کا کردار بھی واضح ہوا۔

روز سہ شنبہ ۲۴ جمادالثانی ۱۳۹۹ھ

درس دوازدہم

اعوذباللہ من الشیطان الرجیم   بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
وافضل الصلوات علی سیدالخلق محمدوعلی المیامین من الہ الطاهرین

حرکت تاریخ میں تعلقات اجتماعی کا کردار

اجتماعی عناصر کے تجزیہ وتحلیل میں جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے اجتماع تین عناصر سے مرکب ہے: انسان،طبیعت اورتعلقات اجتماعی ۔ہم نے یہاں تک انسان کے بارے میں گفتگو کی اورحرکت تاریخ میں اسکے بنیادی کردار ہونے کوواضح کیا اوراسکے ساتھ طبیعت کے بارے میں بھی بات کی اور تاریخ میں اسکی حیثیت کو بھی بیان کیا۔اب ہمارے پاس تیسرا عنصر باقی ہےاوروہ تعلقات اجتماعی ہے۔اس کے بارے میں قرآن کے مطابق پہنچے ہوئے اپنے موقف کوہم یہاں سے شروع کرتے ہیں۔یعنی انسان اورطبیعت کا کردارتاریخ میں کیا ہے؟

تیسرا عنصر تعلقات اجتماعی ہے۔جیسا کہ پہلے بیان کیا کہ یہ تعلقات اجتماعی اپنی جگہ ایک مرکب کی شکل میں موجود ہیں۔اس کے دوعنصر ہیں۔ایک انسان کا طبیعت سے تعلق اور دوسرا انسان کا اپنے جیسے انسان سے تعلق ہے۔تعلقات اجتماعی یہ دوسمت ہیں۔ہم ان دونوں کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ دونوں اپنی جگہ نسبی استقلال رکھنے کے باوجودایک دوسرے کو کچھ حدتک متاثر بھی کرتے ہیں اورایک دوسرے میں کرداررکھتے ہیں۔اس کی وضاحت ہم بعد میں کریں گے کہ یہ دونوں خط ایک دوسرے سے مختلف ہیں اورایک دوسرے کومتاثر بھی کرتے ہیں۔کیونکہ تعلقات کے حوالے سے ان دونوں کومشکل کا سامنا ہےلیکن یہ مشکل حل طلب ہے۔

انسان کا طبیعت سے تعلق:۔

پہلا خط یعنی انسان کا طبیعت سے تعلق ہے۔انسان کسطرح اس سے فائدہ اٹھائے،اسے کیسے اپنے لئے خاضع اور مطیع بنائے اور کیسے اپنی زندگی کی ضروریات کواس سے پیدا کرے۔اس خط میں انسان کوایک مشکل کا سامنا ہے جوانسان اورطبیعت میں تضاد کا ہونا ہے۔اس تناقض کی صورت یہ ہے کہ طبیعت انسان کے سامنے طاغی وسرکش ہے، طبیعت اسکا ساتھ نہیں دیتی۔یہاں سے انسان اورطبیعت میں یہ تناقض انکے تعلقات میں ایک مشکل ہے۔

لیکن اس مشکل کا حل جو ثابت تاریخ کے ایک قانون کی صورت میں موجود ہے اوروہ قانون طبیعت سے مدد لینا ہے۔اور یہ قانون آگاہی اورطبیعت کے ساتھ معاملہ کے تناظر وتبادل کا قانون ہے کیونکہ انسان طبیعت کے بارے میں اپنی جہالت کو جتنا کم کرے گا اتنا ہی طبیعت کی زبان سے آشنا اوراس کے قوانین پرزیادہ تسلط پیدا کرسکے گا۔اسی تناسب سے طبیعت اسکی اطاعت میں آئے گی اوراس سے اپنی حاجات کو لینے کیلئے اسے ذلیل کرسکے گا۔اس میدان میں طبیعت سے متعلق معلومات عمل کیلئے ایک موقع فراہم کرتی ہیں۔طبیعت سے متعلق ہرقسم کا معاملہ اپنی جگہ ایک نئی آگاہی پیدا کرتا ہے لہٰذا طبیعت سے آگاہی اورعمل کے درمیان تاثیر متبادل کا قانون اس تناقص کوحل کرنے کا کفیل ہے یہ ہمیشہ انسان اورطبیعت کے درمیان حل کو بڑھاتا رہتا ہے کیونکہ جتنی انسان کی طبیعت کے بارے میں جہالت دور ہوتی جائے گی طبیعت کے بارے میں اسکی معرفت بڑھتی جائے گی۔طبیعت اسے نئی معلومات فراہم کرے گی اور یہ نئی معلومات اسے طبیعت کے میدانوں میں سے نئے میدانوں پرتسلط فراہم کریے گا پس وہ نئے میدانوں میں عمل شروع کریں گے اور یہ عمل بھی اپنی جگہ آگاہی میں بدل جائیں گے۔اس طرح انسان کی آگاہی میں نمو ورشد کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے جب تک خود انسان یا طبیعت میں کوئی بڑی مصیبت پیش نہ آئے۔

یہ قانون اپنی رشد ونمو اور تاریخ میں اپنی عملی تطبیق کے ساتھ ترتیب سے ان مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ لہٰذا انسان اور طبیعت کے درمیان جو مشکل ہے وہ قانونی طور پر حل ہے۔ قرآن کریم کی اس آیت میں اس طرف اشارہ ملتا ہے جو قانون عمل اور آگاہی کے درمیان متبادل تاثیر کی طرف اشارہ ہے:

﴿واٰتکم من کل ماسالتموہ وان تعدوانعمت اللہ لاتحصوھاان الانسان لظلوم کفار﴾ ''اور جو کچھ تم نے مانگا اس میں سے کچھ نہ کچھ ضرور دیا اور اگر تم اس کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو گے تو ہرگز نہیں کر سکتے بیشک انسان بڑا ظالم اور انکار کرنے والا ہے'' (ابراھیم/۳۴)

اس آیت میں فرمایا ہے تمھارے ہر سوال کا جواب دیں گے۔ یہاں سوال سے مراد وہ دعاء اور سوال لفظی نہیں ہے جو دعا کے معنوں میں معروف ہے کیونکہ آیت میں تمام انسانوں سے خطاب ہے ۔ یہاں سوال انسان کے حوالے سے ہیں یعنی جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے ، جو خدا سے دعا کرتے ہیں اور جو خدا سے دعا نہیں کرتے سب شامل ہیں۔ دعائے لفظی نہ ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے جی ہاں ہر دعا کی استجابت ہوتی ہے لیکن جس چیز کے حصول کے لئے دعا کی گئی ہے اس کے حصول کی ضمانت نہیں ہوتی جبکہ آیت کریمہ میں فرماتے ہیں: **﴿واٰتکم من کل ماسالتموہ﴾** تمہارے ہر سوال کا جوب دیں گے یعنی تم جب سوال کرو گے عطا ہوگی فوراً جواب ملے گا ۔ یہاں پر عطا کرنا ہے اور استجابت فعلی ہے یعنی جو مانگا گیا ہے وہ عطا ہوگا۔ احتمال قوی ہے کہ یہ سوال طول تاریخ میں کل انسانیت کی طرف سے ہے، وہ ماضی ہو یا حال میں یا مستقبل میں تو معلوم ہوا یہاں سوال سے مراد سوال فعلی ہے اور طلب تکوینی ہے کہ جو آگاہی اور عمل کے درمیان تاثیر متبادل کے قانون کا مسلسل تاریخ میں تطبیق ہونے سے محقق ہوتا ہے۔ یہ تھی وہ مشکل جو تعلقات اجتماعی میں طبیعت کی طرف سے انسان کو درپیش تھی اور اسکا حل بھی واضح ہوا جو ہم نے پیش کیا ہے۔

انسان کا اپنے جیسے انسان سے تعلق

تعلقات اجتماعی کے دوسرے خط میں انسان کو اپنے جیسے انسان سے سامنا ہے۔ یہاں تعلقات سے مراد تقسیم ثروت یا دیگر امور اور سرگرمیاں کے حوالے سے ہے یہاں بھی انسان کو دوسرے انسان سے تعلق قائم کرتے وقت ایک مشکل کا سامنا ہے لیکن یہ مشکل اس مشکل جیسی نہیں جو انسان اور طبیعت میں تناقض سے پیدا ہوئی ہے بلکہ یہ مشکل انسان اور انسان کے درمیان اجتماعی تناقض ہے یہ تناقضات اجتماعی جو ایک انسان اور دوسرے انسانوں کے درمیان معاشرے میں پائے جاتے ہیں اسکی مختلف اشکال وصورتیں ہیں لیکن یہ ہمیشہ اپنے حقیقت اور جوہر میں باقی رہے گا ایک ثابت شی ایک حقیقت اور ایک عام روح میں ہمیشہ باقی رہے گا اور یہ ایک قوی اور ایک ضعیف کے درمیان میں تناقض ہے ایک انسان طاقت کے مرکز پر ہے اور دوسرا کمزوری اور ناتوانی کی جگہ پر ہے ان دونوں کے درمیان کا تناقض ہے۔

یہ موجود جو قوت کے مرکز پر قابض ہے جب تک اس کا اپنا خاص تناقض حل نہیں ہوگا، جب تک اس کے داخل سے جدل انسانی ختم نہیں ہوگا تو حتماً وہ ایک اجتماعی تناقض کی صورت میں ظاہر ہوگا وہ تناقض اپنی قانونی شکل میں کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو کتنا ہی اپنی تشریعی صورت یا تمدن کے حوالے سے مختلف کیوں نہ ہو بالآخر یہ قوی اور ضعیف کا تناقض ہوگا۔ یہ قوی کبھی ایک فرد فرعونی ہوسکتا ہے، کبھی ایک جماعت ہوسکتی ہے، کبھی ایک طبقہ یا قوم اور کبھی ایک امت بھی ہوسکتی ہے۔ تناقضات کی ان مختلف شکلوں کی روح ایک ہی ہے اور وہ وہی روح جنگ و مقابلہ ہے ۔ وہ دوسروں کو پابند کرنے کی روح ہے کہ جس کا داخلی تناقض حل نہیں ہوا ہے اور اس میں جدل انسانی موجود ہوتا ہے لہٰذا یہاں جنگ قوی اور ضعیف کے درمیان میں ہے۔ یہاں ضعیف کا استحصال کرنے کی بات ہے۔

تناقضات کی مختلف شکلیں ہیں جہاں انسان کو اپنے جیسے انسان کا سامنا ہے۔ ان مختلف اور متعدد شکلوں کا مصدر و ماخذ ایک ہے، ایک ہی چشمہ سے پھوٹتا ہے۔ اسکا بنیادی

نقطہ ایک ہی ہے اور وہ ہے وہ جدل انسانی جو ایک ٹکڑا مٹی اور شوق الی اللہ سے قائم ہے۔

جب تک اس جدل انسانی میں افضل واشرف فاتح نہیں ہوگا یہ انسان آئے دن حالات وواقعات اور فکری اور ثقافتی شروط کے تحت ایک تناقض کے بعد دوسرا تناقض پیدا کرتا رہے گا۔ ایک شکل کے بعد دوسری شکل بناتے رہیں گے۔ پس اس وقت اسلام کا تعلقات اجتماعی کے حوالے سے ایک کھلا اور گہرا نظریہ ہے۔ یہ تناقض کی ایک شکل کے حل پر اکتفاء نہیں کرتا یعنی ایک شکل کو حل کر کے باقی کو نظر انداز یا مہمل نہیں کرتا۔ اسلام چاہتا ہے کہ پوری تاریخ میں اس خط کو لاحق تناقضات کو حل کرے، انکا خاتمہ کرے۔ اسلام چاہتا ہے کہ ان تناقضات کی گہرائی میں جائے اور انکی حقیقت کو کشف کرے اور ان تمام تناقضات میں جو مشترک روح ہے اسکا خاتمہ کرے۔

پھر ان سب تناقضات کو سب سے گہرے تناقض سے ربط دیتا ہے جو کہ جدل انسانی ہے۔ یہاں اسلام ایک ہی رسالت اور پیغام الٰہی پر ایمان رکھتا ہے اور اسی کو تعلقات اجتماعی کو درپیش تمام تناقضات کا حل سمجھتا ہے۔ اور یہ وہ رسالت یا حل ہے جو بیک وقت دو سطح پر کام کرتا ہے۔ ایک تو یہ فی زمانہ ختم ہو اور دوسرا آنے والے زمانے میں بھی اسکا خاتمہ ہو یعنی یہ جدل' انسان کے اندر سے ختم ہونا چاہیئے۔ اسلام چاہتا ہے کہ اس تناقض کا جو سرچشمہ ہے اسکو خشک کر دے۔ اسلام کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ جدل اور تناقض کے سرچشمہ کو اپنے حال پر چھوڑ کر اجتماعی میدان میں تناقض کی قانونی شکل کو ختم کرنا ایک آدھا کام ہے یعنی یہ آدھے حصہ کا حل ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں جلد ہی اس چشمہ سے تناقض ایک نئی صورت میں نمودار ہوگی جسے آپ نے پہلے ختم کیا ہوگا اور اسطرح یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔

اس مشکل کا اسلامی حل:۔

اسلامی نظریہ چاہتا ہے کہ اس مسئلے کا بنیادی حل فراہم کرے یعنی اس مشکل کے بارے میں دو سطح پر کام کرے۔ اسلام بیک وقت دو جہاد پر ایمان رکھتا ہے۔ ایک جہاد اکبر ہے اس کے نتیجے میں انسان کے اندر کے تناقضات کا خاتمہ ہوگا، داخلی جدل کا خاتمہ ہوگا اور

دوسرا جہاد اجتماع میں ظاہر ہونے والے مختلف تناقضات ہیں۔ جہاں قوی ضعیف کا استحصال کر رہا ہے۔ اسلام ان دونوں جہادوں کا حکم دیتا ہے نہ کہ آپ کو ایک محدود تناقض یا استحصال کے خاتمہ تک محدود کرے۔ کیونکہ محدود تناقضات کے خاتمے کے باوجود اسکی روح باقی رہتی ہے۔

یہ تھا اسلام کا وہ وسیع اور حقیقت پر مبنی نقطہ ونظر جو تاریخ بشریت میں عملی طور پر تجربہ کر کے دکھایا جا چکا ہے جب کہ وہ اجتماعی تناقض کو ختم کرنے کا نظریہ جسکی تفسیر تاریخ مادّی والوں نے کی ہے وہ اس نظریہ اسلام کے برخلاف تنگ نظریہ ہے مارکس اپنی جگہ ذہین ہونے کے باوجود اس یورپی تنگ نظری سے آگے نہیں بڑھ سکا وہ یورپ کا فرد ہونے یا یورپی ہونے کی وجہ سے اس تنگ نظری کی اسارت میں تھا۔

یورپی انسان کی نظر میں دنیا وہاں تک ہے جہاں تک یورپ ہے یا تمام الفاظ میں بولوں تو یہ لوگ مغرب کی زمین کو دنیا کا آخر سمجھتے ہیں۔ جیسا کہ یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ انسانیت صرف انہی تک محدود ہے یعنی صرف وہ ہی انسان ہیں اور باقی سب حیوان ہیں انکی اس منطق کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے: (آل عمران: ۷۵)

عربوں کی طرف سے ہمارے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں ہے یہود کا عقیدہ ہے کہ کوئی ہمارے اوپر کوئی سلطنت نہیں کر سکتا کیونکہ وہ بشر نہیں ہیں وہ لوگ انسان نہیں ہیں وہ لوگ ان پڑھ اور ھمج الراعی انسان ہیں۔ اسی طرح یورپ کے لوگوں کا بھی نظریہ ہے۔ یہ لوگ دنیا کو یورپین ممالک کے حدود تک دیکھتے ہیں اور صرف مغرب کی زمین کو پوری دنیا سمجھتے ہیں۔ مارکسزم یورپی فکری تقلید سے خود کو نجات نہیں دلا سکا۔ وہ انسانی معاشرے میں طبقہ بندی سے خود کو آزاد نہیں کر سکا کہ اسی طبقہ بندی نے تاریخ میں مادّی افکار کا ایک کھیل کھیلا۔

اسی وجہ سے ہے کہ اس نے ان تعلقات اجتماعی میں انسان کو درپیش تناقضات کے حل کیلئے وہی تنگ نظریہ ہمارے سامنے پیش کیا۔ اسکا یہ اعتقاد ہے وہ تمام تناقضات جو بشریت کو لاحق ہیں ان سب کی برگشت ایک ہی ہے اور وہ طبقہ بندی ہے یعنی ایک طبقہ

پیداوار کے تمام یا بیشتر حصّہ پر قابض ہے جبکہ دوسرا طبقہ اس پیداوار میں کسی چیز کا مالک نہیں۔ وہ صرف مالک طبقہ کے فائدے کے لئے کام کرتا ہے۔ وہ ان وسائل کو پیداواری طبقہ کے فائدے کے لئے استعمال کرتا ہے تا کہ اس کے پسینے کی کمائی اس پیداواری طبقہ کی جیب میں جائے۔ یہ مالک طبقہ اسے اس پیداوار میں سے دوسرے طبقہ کو بہت ہی کم دیدیگا اسی حد تک دے گا کہ جس سے یہ اپنی زندگی چلا سکے تا کہ یہ طبقہ مالک طبقہ کی خدمات کو جاری رکھ سکے۔

اس نظریہ کے تحت یہ وہ طبقاتی تناقض ہے جو دیگر تناقضات اور جدل کی اساس و بنیاد ہے۔ یہ تناقض اجتماعی حوالے سے مالک اور مزدور کے درمیان تلخ اختلاف سے وجود میں آتا ہے۔جتنی وسائل اور پیداوار میں ترقی ہوگی نئی مشینری اور ٹیکنالوجی وجود میں آئے گی اسی تناسب سے ان دونوں طبقوں کی جنگ میں نمو آئے گی اور اس تناقض میں شدت آئے گی۔ کیونکہ جتنا وسائل ترقی کریں گے معیشت پستی کی طرف جائے گی یہاں سے سرمایہ داروں کو موقع ملے گا کہ وہ مزدور کی اجرت کو کم کریں گے کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ مزدور اپنی زندگی بچانے کی مقدار سے زیادہ اجرت حاصل کرے۔

جب وسائل میں ترقی ہوگی تو ضروریات کم ہوتی جائیں گی اسطرح معیشت میں کمی آئے گی اور سرمایہ دار مزدور کی تنخواہ کم کریں گے۔ اسکے علاوہ پیدواری آلات میں ترقی سے مزدوروں کی ایک بڑی تعداد کے مقابلے میں انکا ایک حصہ ہی یہ کام کر سکے گا کیوں کہ باقی مزدوروں کی جگہ یہ آلات اور مشینری لےلیلیں گی۔لہٰذا سرمایہ دار بہت سے مزدوروں کو نکال دیں گے۔ اسطرح ان دو طبقوں یعنی سرمایہ داروں اور مزدور طبقہ کے درمیان تناقضات میں اضافہ ہوگا۔ یہاں تک کہ انقلاب برپا ہوگا اور یہ انقلاب مزدور کی طرف سے ہوگا اور اس انقلاب کے نتیجے میں معاشرے میں موجود طبقاتی تضاد کا خاتمہ ہو جائیگا اور معاشرہ ایک طبقہ بن جائے گا۔ اس میں دو گروہ نہیں رہیں گے یعنی ایک ہی طبقہ ہوگا جو پورے اجتماع کی نمائندگی کرے گا یہاں سے ہر قسم کے تناقضات کا خاتمہ ہو جائیگا کیونکہ

تناقضات کی بنیاد طبقہ بندی ہے جب اس طبقہ بندی کی بنیاد کا خاتمہ ہوگا تو دیگر فروعی طبقہ بندیاں ازخود ختم ہو جائیں گے۔

یہ تھا مارکس اور انقلابیوں کے نقطہ نظر کا خلاصہ جو وہ تناقضات کے حل کے بارے میں پیش کرتے ہیں۔

لیکن انکا یہ نقطہ نظر بہت محدود اور تنگ ہے۔ اسکے علاوہ باہر حقیقت سے بھی مطابقت نہیں رکھتا۔ تاریخی حادثات پر بھی اسکی تطبیق نہیں ہوتی۔ معاشرے میں تناقض دراصل مشینری کی ترقی سے وجود میں نہیں آیا بلکہ یہ تضاد خود انسان کا پیدا کردہ ہے۔ یہ یورپی انسان کے بنائے ہوئے تناقض ہیں۔مشینری نے مزدور کا استحصال نہیں کیا میشنری نے نظام سرمایہ داری پیدا نہیں کیا بلکہ یہ یورپی انسان ہے جس کے ہاتھ میں یہ مشینری آئی ہے اور اسی نے ایک سرمایہ داری نظام پیدا کیا ہے اور اسے زندگی پر نافذ کیا ہے اور اس فکر کی تطبیق زندگی پر کی۔

طبقاتی تناقض دوسرے تناقضات کی اقسام وانواع کے مقابلے میں ایک شکل واحد نہیں ہے بلکہ اسکے علاوہ اور بھی تناقضات اجتماعی میدان میں پائے جاتے ہیں۔ اسکے علاوہ تناقض طبقاتی دوسرے تناقضات کی بنیاد بھی نہیں ہے۔ جب کہ حقیقت میں اجتماعی میدان میں تناقضات کی انواع واقسام کی بنیاد صرف ایک تناقض ہے اور وہ ہے جدل انسانی۔ وہ جدل جو انسان کے اندر اور داخل میں پوشیدہ ہے اور یہی وہ سب سے بڑا اور بنیادی تناقض ہے کہ جس سے ہر آئے دن اور ہمیشہ متعدد تناقضات وجود میں آتے رہیں گے۔

آیئے مارکسزم کی تنگ نظری اور تجربہ بشریت کے درمیان جو باہر اجتماع میں موجود ہے ان دونوں کے درمیان موازنہ کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں دونوں میں سے کونسا نقطہ نظر ہماری اس دنیا میں زیادہ تطبیق ہوتا ہے اور اس سے ہم کیا توقعات کر سکتے ہیں؟ اور اگر تناقضات کی تفسیر یہی ہو اور یہ اپنی جگہ صحیح ہو تو ہمیں کس چیز کا انتظار کرنا چاہیے؟

ہم مارکس کی اس تفسیر کے تحت اس انتظار اور توقع میں تھے کہ سرمایہ داروں اور

مزدوروں کے درمیان تناقض میں آئے دن اضافہ ہوگا کیونکہ یورپی معاشرہ میں وسائل پیداوار اور صنعت نے بے تحاشہ ترقی کی ہے لہٰذا برطانیہ امریکہ اور فرانس وغیرہ میں ہر آئے دن اس تناقض میں اضافہ ہونا چاہئے تھا یہاں تک کہ یہ استحصال کرنے والا طبقہ پاش پاش ہو جاتا اور یہ نظام متزلزل ہو جاتا مارکس کی اس تفسیر کے تحت مزدور کی بدبختی اور زوال میں ہر دن اضافہ ہونا چاہیئے تھا اور سرمایہ داروں کے مال میں ہر روز اضافہ ہونا چاہیئے تھا۔ ہمیں مارکس کے نظریہ کے تحت امریکہ برطانیہ اور فرانس کے بارے میں ایسی توقع رکھنی چاہیئے تھی کہ ہم وہاں کسی مصیبت کی آمد کے انتظار میں ہوتے۔ ہم یورپی اور امریکی مزدور کے انقلاب برپا کرنے کے منتظر ہوتے کیونکہ مارکس کی نظر میں اس تناقض کا واحد حل یہی تھا۔ اگر تناقض کی تغیر میں یہ افکار صحیح ہوتے تو اس تغیر سے ہماری یہ توقعات تھی۔

لیکن وہاں ایسا نہیں ہوا۔ خارج میں ایسی کوئی تبدیلی ظاہر نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کے خلاف ہوا۔ ہم افسوس کے ساتھ ان ملکوں میں سرمایہ داری نظام اپنی آب وتاب کے ساتھ جاری وساری دیکھتے ہیں اور ہر آئے دن مرکزیت حاصل کر رہا ہے یہ اپنی بزرگی میں آئے دن وسعت پا رہا ہے۔ اس نظام کے جلد گرنے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ وہ پاک تمنائیں جو مادی انقلابیوں نے کی تھیں کہ برطانیہ اور یورپ میں جہاں صنعتی انقلاب آیا ہے وہاں جلد ہی مارکس کی تفسیر کے تحت زوال آجائے گا۔ مارکس اور اسکے معتقدین کی یہ تمنائیں پوری ہوتی نظر نہیں آرہی ہیں بلکہ یہ سب تمنائیں سراب میں تبدیل ہوگئی ہیں اور یہ پیشینگوئیاں ان ملکوں میں آئیں جہاں نہ وسائل پیدوار میں ترقی ہوئی تھی اور نہ ہی مزدور اور سرمایہ دار میں کوئی تضاد موجود تھا کیونکہ یہاں صنعتی انقلاب کے بہت بڑے دروازے نہیں کھلے تھے جیسے روم، روس اور چین وغیرہ۔

اب اگر ہم دیکھیں کہ کیا مزدور کا فقر و فاقہ یورپ میں بڑھ گیا ہے آیا وہاں استحصال میں اضافہ ہوا ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہوا۔ مزدور وہاں خوش ہیں آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بلکہ سرمایہ داروں کے ایجنٹ کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ امریکی مزدور تھوڑی

محنت سے اتنا پیسہ کمالیتا ہے جتنا سوشلسٹ ملکوں کے مزدور دن رات مشقت کر کے کماتے ہیں۔ تو آیا یہاں یعنی یورپ اور برطانیہ میں مزدور کو کوئی مصیبت آئی ہے؟ ایسا نہیں بلکہ یہاں مزدور سرمایہ داروں کا نمائندہ ہے اور رفتہ رفتہ اس تعلق نے ایک نظام کی شکل اختیار کر لی ہے یہاں مزدوروں کو سیاسی سہولتیں حاصل ہوئی ہیں۔ انہوں نے انقلاب لانے کا تصور چھوڑ دیا ہے۔ انقلاب کا کلمہ ان کے اذہان سے نکل چکا ہے۔ اب یہ ان سرمایہ داروں کے دوش بدوش چلتے ہیں وہاں مزدور کے حقوق کا نعرہ بلند ہوتا ہے مزدور تنظیموں کے توسط سے پارلیمنٹ میں یا انتخابات کے ذریعے مزدوروں کے حقوق کی آواز اٹھائی جاتی ہے۔ یہی حالت سیاسی سہولیات میں ہے یہ تمام تبدیلیاں یہاں مختصر مدت میں وقوع پذیر ہوئیں آخر ایسا کیوں ہوا؟ آیا مارکس ان سرمایہ داروں کے بارے میں بدگمانی کرتے تھے اور اس بنیاد پر انھوں نے یہ پیشینگوئیاں کیں۔ لہٰذا اس لئے یہ وقوع پذیر نہیں ہوئیں۔ آیا یہ سرمایہ دار جو استحصال کرتے تھے مارکس اور مارکسزم سے مرعوب ہو کر خود کو نیچے لائے اور زیادہ منافع سے ہاتھ اٹھایا۔ تاکہ مزدور انکے خلاف انقلاب برپا نہ کرسکیں۔ کیا یہ بات صحیح ہے؟۔ آیا امریکی ارب پتی کے ذہن میں اب بھی اس حوالہ سے کوئی خوف ہے؟ آیا اب بھی وہ مزدور انقلاب کے بارے میں سوچتے ہیں۔ ممکن ہے آج سے سو سال پہلے وہ اس بارے میں سوچتے ہوں لیکن اس وقت وہ ایسا نہیں سوچتے۔ یہ بات ہم کیسے سوچ سکتے ہیں کہ امریکی سرمایہ دار کے دل میں مزدور کا خوف بیٹھ گیا ہے اور اس نے اپنے فائدے سے ہاتھ اٹھالیا ہے۔ یا یوں کہیں کہ کہیں امریکی سرمادیہ دار کے دل میں تقوی نے جگہ بنالی ہو اور اس کا دل اسلام سے منور ہو گیا ہو۔ جسطرح پہلے مسلمانوں کا تھا جو اپنی دولت میں ایک دوسرے کو شریک کرتے تھے اور اس میں کسی قسم کی حد کے قائل نہیں تھے۔ کیا اسی طرح امریکی سرمایہ داردن بہ دن مسلمان ہو رہے ہیں؟ لیکن ان سب باتوں میں سے کچھ بھی نہیں ہوا۔ نہ انہوں نے اپنے فائدے سے تنزل کیا ہے نہ ان کے دل میں مزدور کا خوف ہے اور نہ ہی انہوں نے اسلام قبول کیا ہے اور نہ ہی کارل مارکس ان کے بارے میں بدگمان تھا بلکہ اس

کاان کے بارے میں یہ گمان کامل طور پر صحیح تھا۔اور نہ ہی سرمایہ دار مزدور طبقہ سے خوف کھائے ہیں تا کہ اس کی خاطر اپنے فائدے کا تنزل کیا ہے اور نہ ہی ان کے دلوں میں تقویٰ نے جگہ لی ہے۔اُنھیں نے تقویٰ کو نہ جانا ہے نہ جانیں گے کیونکہ یہ لوگ لذت مال اور شہوت میں غرق ہیں۔تو پھر ایسا کیوں ہوا؟ ہم اس امریکی نظام کی کیا تفسیر کریں گے؟

یہ ہے وہ حقیقت جو خارج میں واقع ہے۔ یہ ایک اور تناقض کا نتیجہ ہے جو ہمیشہ طبقاتی تناقض کے ساتھ رہا ہے لیکن مارکس اور ماڈی تاریخ اسے کشف نہیں کر سکے لہٰذا انہوں نے تناقض کو صرف طبقہ بندی تک محصور کیا انھوں نے اس تناقض کو امریکی سرمایہ داروں اور مزدوروں منحصر کیا، برطانوی امیر اور غریب طبقوں میں محصور کیا۔ مارکس اور مارکسزم اس بڑے تناقض کو نہیں دیکھ سکے جسے یورپی انسان کے جدل نے پیدا کیا ہے۔ جو اسکے داخل میں تھا اس تناقض سے انھوں نے چشم پوشی کی اسے منجمد کیا اور ایک مدت کیلئے اسے روک دیا۔

تو وہ کونسا تناقض تھا؟ اگر ہم کھلے ذہن اور وسعت نظری سے اس کا جائزہ لیں تو ہم اس تناقض تک پہنچ سکتے ہیں، اس پر انگلی رکھ سکتے ہیں۔ کیونکہ ہم نے اپنے آپ کو اس طبقاتی تناقض تک محدود نہیں رکھا ہے۔ ہم نے یہ کہا ہے کہ اجتماع میں موجود تناقضات کی بنیاد انسانی جدل ہے۔ وہ تناقض جو امریکی اور یورپی سرمایہ داروں میں پایا جاتا ہے۔ انہوں نے اس تناقض میں مزدور سے معاہدہ کیا اور کہا کہ ہم اور مزدور دونوں مل کر ایک طبقہ بنتے ہیں تا کہ یورپ میں طبقہ بندی کا وجود ہی نہ رہے اور ان دونوں نے آپس میں اتحاد کر کے تاریخ بشریت میں ایک اور تناقض کو جنم دیا۔

لیکن اس تناقض میں دوسرا پہلو کون ہے؟ اس کی بھی دو سمتیں ہیں ۔ایک طرف امریکی سرمایہ دار اور مزدور اکٹھے کھڑے ہیں۔ دوسری سمت ہم اور آپ کھڑے ہیں یا دنیا کے فقراء کھڑے ہیں، جنھیں یہ لوگ تیسری دنیا کہتے ہیں۔ اس میں ایشیاء، افریقا اور لاطینی امریکہ کے محروم طبقے کھڑے ہیں اور یہ اس تناقض میں دوسرے فریق کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس وقت امریکی اور یورپی سرمایہ داروں اور مزدوروں نے یہ معاہدہ کیا کہ ہمیں آپس میں جنگ و جدال کی بجائے ان محروم اور فقیر قوموں سے لڑنا چاہیئے۔ اب یہ تناقض منقلب ہوا اور تاریخ کے صفحات میں اس نے اجتماعی استعمار گری کی شکل اختیار کی اور یہ استعمار کی مختلف شکلوں میں تبدیل ہوا۔ جس وقت یورپی اور امریکی انسان اپنے ملک سے دنیا کے ذخائر کے مراکز کی تلاش میں نکلے تا کہ ان فقیر ملکوں اور قوموں کے ذخائز و دولت کو لُوٹ سکیں، اس وقت اس تناقض نے طبقاتی تناقض کو چھپا دیا بلکہ اسکو منجمد کیا چونکہ اس تناقض کے پس منظر میں یورپی انسان کا جدل زیادہ قوی اور قدرت مند تھا۔ اس وقت یورپی یا امریکی سرمایہ داروں کے پاس جو دولت وثروت موجود ہے وہ سب کی سب بلکہ ان میں سے زیادہ تر حصّہ امریکی مزدوروں کے پسینے کی کمائی نہیں ہے۔ دولت جنگی غنائم سے ہے اور غارت گری سے حاصل کی گئی ہے۔ یہ دولت ان فقیر ملکوں پر غارت گری کر کے حاصل کی گئی ہے۔ یورپ نے ان ملکوں پر جنگیں مسلط کیں اور انکی دولت کو لوٹا۔ یہ جو دولت اس وقت ان کے پاس موجود ہے یہ یورپی مزدور کا حق نہیں یہ مزدور اور سرمایہ دار کے تضاد سے حاصل شدہ دولت نہیں ہے بلکہ اس دولت کا ماخذ ایشیاء اور لاطینی امریکہ کا تیل ہے، یہ تنزانیہ کے الماس کی پیداوار ہے، یہ افریقا کے مختلف ملکوں کی لوہا پیتل اور یورینیم کی دولت ہیں جو غارت گری سے حاصل کی گئی ہے۔ یہ مصر کی کپاس کی دولت ہے یہ لبنان کے تمباکو کی دولت ہے یہ جزائر کے خمر (شراب) کی دولت ہے۔ ہاں جزائر کا خمر کیونکہ کافر جب اس ملک میں داخل ہوئے تو انہوں نے اس ملک کی زمین کو انگوروں کے باغات میں تبدیل کیا اور ان انگوروں کو شراب میں تبدیل کیا تا کہ اس سے مزدور کو مدہوش کریں۔ یہ مزدور نشے اور بے حسی کی زندگی گزاریں۔

کیونکہ وہ لوگ جزائر کے خمر پیتے ہیں جزائر کے انگور اُگاتے ہیں اور اسے شراب میں بدل لیتے ہیں۔ یہ تمام دولت انہوں نے ان مراکز سے لی ہے ان معدنوں سے حاصل کیا ہے۔ جزائر کی شراب سے مست ہوتا ہے فرانس، یورپ اور امریکہ کے مزدوروں کے

پسینے سے مست نہیں ہوتے۔

پس وہ تناقض جس نے اس تناقض کو منجمد کیا ہے، جس نے اس تناقض کو روک دیا ہے، یہ ایک بہت بڑا تناقض ہے۔ یہاں سرمایہ دار اور مزدور مل کر دوسری فقیر اقوام و ملل کے ساتھ تناقض پیدا کر رہے ہیں۔

اس نئے تناقض کی روشنی میں یورپ اور امریکی سرمایہ داروں نے فیصلہ کیا کہ انکی مصلحت اس میں ہے کہ جو مال و دولت انہوں نے آپ اور ہم سے حاصل کی ہیں، وہ دولت جو انہوں نے مستضعفین کی زمین سے نکالی ہے، اس کا کچھ حصہ اپنے مزدوروں کی عیش وعشرت پر لگائیں، جزائر کی شراب سے خود بھی مست ہو جائیں اور مزدوروں کو بھی مست کریں، تنزانیہ کے ہیروں کو خود بھی زینت بنائیں اور مزدوروں یا ان کی بیویوں کو دے دیں۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ وہاں مزدور نے اپنی زندگی کو ایک نئے انداز سے شروع کیا ہے۔ ان مزدوروں کی زندگی مارکس کی پیشنگوئی سے بالکل مختلف ہے۔ یورپی اور امریکی سرمایہ داروں کی اس عنایت کا مقصد ایسا نہیں کہ ان کے دلوں میں کوئی رحم آیا ہو یا ان کے دلوں میں تقویٰ نے جگہ لے لی۔ ہوا ایسا نہیں ہے بلکہ انھیں اس بے شمار دولت میں سے کچھ حصہ ان مزدوروں کو دیتا ہے جو اسی پر قناعت کرتے ہیں۔

پس حقیقت جو انسانی تاریخ سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ انسانی تناقضات کو ایک تناقض میں محصور نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ تناقضات کی مختلف شکلیں ہیں۔ یہ سب ایک ہی منبع سے نکلتے ہیں اور وہ جدل انسانی ہے۔ اس جدل انسانی کا کوئی بدل نہیں ہے۔ اگر جدل انسانی کو ایک تناقض سے نکال دیا جائے تو یہ اسکا حل نہیں ہے کیونکہ وہ دوسرے تناقض میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ یہ بات صحیح نہیں کہ ہم تمام تناقضات کو طبقاتی ناقض سے بنائیں اور ملک اور مزدور کا تناقض بتا دیں اور جب ہم اس تناقض کو حل کریں تو یہ بولیں کہ سارے تناقضات ختم ہو گئے ہم تناقض کو فقط اسی میں محصور نہیں کر سکتے۔ ان تمام تناقضات کی برگشت ایک تناقض کی طرف ہے اور وہ ہے قوی کے ہاتھوں ضعیف کا استحصال۔ جب تک یہ قوی اپنے

ذاتی تناقض کو حل نہیں کریں گے اس وقت تک یہ ضعیف کا ہزاروں شکلوں میں استحصال کرتے رہیں گے۔ کبھی یہ اجتماعی تناقض ہوگا۔ کبھی دستوری تناقض، مالک و مملوک کا تناقض، حق حکومت کا تناقض، اختیار سفارش کا تناقض ،غرض ہزاروں قسم کے تناقضات معاشرے میں وجود میں آئیں گے۔ جب بھی کوئی ضعیف انسان ملیں گے ان پر ملکیت اور قانون کی شکل میں تناقضات بناتے جائیں گے۔

ملکیت ایک قانون اصطلاح ہے یہ شرعی اور قانونی دونوں کا مظاہر ہے۔ یہ شرعی اور قانونی ان وسائل میں سے ایک ہے کہ جس سے ممکن ہے استحصال نکل آئے لیکن استحصال ممکن ہے قانون کی بہت ساری دوسری صورتوں سے نکل آئے۔ جب تک تناقض کے سرچشمہ کو نہ سکھایا جائے گا جب تک انسان کا جدل حل نہ ہوگا۔ جب تک داخل سے اسکا خاتمہ نہ کر دیں تب تک یہ تناقض پیدا ہوتے رہیں گے۔

لہٰذا یہاں تک واضح ہوا کہ ہمارے پاس دو مختلف زاویئے ہیں۔ مشکل کا ایک زاویہ انسان کی طبیعت کے ساتھ تعلق میں درپیش ہے اور دوسری مشکل انسان کا انسان کے ساتھ تعلقات میں درپیش ہے۔ لیکن ان دو مشکلوں کا قانونی حل موجود ہے اور ہر ایک کا خاص قانون ہے جو دوسرے خط کے قانون سے جدا ہے۔ یہی دونوں خطوط میں سے ایک خط کا دوسرے سے استقلالی نسبی ہونے کا معنٰی ہے لیکن اس کے باوجود قرآن کریم کا یہ اعتقاد ہے کہ ان دونوں کے درمیان ایک قسم کی اثر اندازی ہے کیونکہ یہاں ایک قسم کی تاثیر متبادل ہے۔

روز چہارشنبہ ۲۵ جمادالثانی ۱۳۹۹ھ۔

درس سیزدہم

اعوذباللہ من الشیطان الرجیم   بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
وافضل الصلوات علی سیدالخلق محمدوعلی الہ المیامین.

تعلقات اجتماعی میں تاثیرمتبادل:۔

جیسا کہ ہم نے ذکر کیا کہ انسان کو طبیعت سے تعلق میں جو مشکلات پیش آتی ہیں وہ قانون طبعی کو اخذ کرنے کے بعد ختم ہوسکتی ہیں۔لیکن ان مشکلات اور انسان کے انسان سے تعلق میں جو مشکلات ہیں ان میں فرق ہے۔اور جیسا کہ ہم نے ذکر کیا کہ انسان اور طبیعت ایک حوالے سے استقلال رکھتے ہیں لیکن یہ استقلال اپنی جگہ ایک استقلال نسبی ہے ایسا استقلال نہیں جس کی وجہ سے یہ ایک دوسرے پراثر انداز نہ ہوسکتے ہوں۔جبکہ ان دونوں میں ایک دوسرے پراثر اندازی کی صورت موجود ہے۔ان دونوں میں موجود تاثیر متبادل کو ہم قرآن کریم کی روشنی میں بیان کریں گے۔

پہلا تعلق: یعنی انسان کا طبیعت سے تعلق کس حدتک انسان کے انسان سے تعلق پراثر انداز ہوتا ہے۔

دوسرا تعلق: یعنی انسان کا انسان سے تعلق کس حدتک اس کے طبیعت سے تعلق پراثر انداز ہوتا ہے۔

پہلا تعلق: انسان کا طبیعت سے تعلق کس حدتک انسان کے انسان سے تعلق پر اثر انداز ہوسکتا ہے۔اس بارے میں جیسے ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ انسان کی جتنی طبیعت کے بارے میں آگاہی بڑھتی جائے گی اتنا ہی طبیعت سے تعلق میں اسکا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا۔ جتنا وہ طبیعت کے ذخائز پر قابض ہوگا اتنا ہی اس کی بے نیازی میں اضافہ ہوتا

جائے گا۔ یہاں سے انسان،انسان کے انسان سے تعلق میں استحصال کرے گا۔ چنانچہ قرآن کریم میں اس کا ذکر ہے: ﴿کلّا انّ الانسان لیطغٰی.ان راٰہ استغنٰی﴾ ”انسان جب بھی بے نیاز ہوتا ہے وہ طاغی ہو جاتا ہے“ (علق/٦)۔ یہ آیت اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ انسان کا جتنا طبیعت پرتسلط زیادہ ہوتا جائے گا وہ زیادہ وسائل پیدوار حاصل کرے گا اتنا ہی اسکا اثر انسان کے انسان سے تعلق پر ہوگا۔اس کے اثرات اس پر مرتب ہونگے۔ یہاں سے ہی اسکی شہوات اور خواہشات کا دروازہ کھل جائے گا وہ ان وسائل سے فائدہ اٹھارتے ہوئے غریب اور ضعیف کا استحصال کرے گا۔

مثلا آپ تصور کریں ایک ایسے معاشرے کا جہاں کے افراد ہاتھ یا لکڑی یا بیلچہ سے شکار کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ایسا معاشرہ طاقت وروں اور دہشت گردی کرنے والوں جیسا کردار ادانہیں کرسکتا ہے؟ اور عام طور پراجتماعی استحصال پر قادر نہیں ہوتا۔کیونکہ اس کی پیداوار اور ان کی قدرت محدود ہے۔اس معاشرے میں ہر انسان اپنی مزدوری سے اپنی گذر اوقات کرتا ہے اسکے پاس اتنی قدرت نہیں کہ وہ ایک وسیع اجتماع پر طغیانی کرے۔اگرچہ دوسرے حوالہ سے یہ لوگ کچھ استحصال کرسکیں۔

اسی طرح اسکو آپ دوسرے رخ سے دیکھیں کہ ایک ایسا معاشرہ ہے جو ترقی یافتہ ہے،جہاں انسان کے وسائل پیداوار شمار میں نہیں آتے اس نے الیکٹرونک اور ایٹمی ٹیکنالوجی کے ذریعے طبیعت کو اپنے ارادے کے تحت کرسکتے ہیں۔ایسے معاشرے میں وہ پیچیدہ اور جدید الیکٹرونک اور ایٹمی ٹیکنالوجی انسان کا دوسرے انسان سے تعلقات بڑھانے کا ذریعہ ہے اور یہ امکان فراہم کرتا ہے یہاں فلاسفہ کی اصطلاح کے تحت استحصال بالقوہ ہے پس انتظار ہے قوت فعلیت میں تبدیل ہوجائے اور یہ انسان پر اور اجتماعی میدان میں اس کے تاریخی کردار پر منحصر ہے۔

پس انسان ہی ہے جو استحصال کرتا ہے۔انسان ہی ہے کہ جب اسے ایٹمی اور ٹیکنالوجی اور الیکٹرونک ہاتھ آئے تو اس نے نظام سرمایہ داری اور استحصال کرنے والے

نظاموں کو پیدا کیا ہے لیکن یہ الیکٹرونک اور ایٹمی ٹیکنالوجی ہے جو اس استحصال کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ انسان کو یہ فرصت دے دیتی ہے، اس کے خواہشات کے دروازہ کھول دیتی ہے، اس کی حس جاگ جاتی ہے، اس کی داخلی جدل اور تناقض کو حرکت دیتی ہے تاکہ اس میدان کے مناسب وسائل اور پیداوار مہیا کریں۔

یہی وہ فرق ہے جو ہمارے اور تاریخ مادّی (مارکسیزم) والوں کے درمیان ہے۔ مادی تاریخ والوں کا عقیدہ تھا کہ خود وسائل استحصال پیدا کرتے ہیں، وسائل ہی اسی کے مناسب نظام بناتے ہیں لیکن ہم کہتے ہیں وسائل کا کردار صانع والا کردار نہیں ہیں وسائل صرف انسان کو موقع فراہم کرنے کا کردار ادا کرتا ہے قابلیت وصلاحیت دیتے ہیں۔ لیکن منفی یا مثبت اثرات کا مرتب کرنا، امانت داری یا خیانت کا مظاہر کرنا، استقامت یا شکست کا مظاہر کرنا، ان سب میں انسان کا کردار ہے۔ انسان کے داخل کا اس میں کردار ہے وہ مثل اعلیٰ ہے جو اسے حرکت دیتا ہے کہ وہ اپنی حرکت کو ان مثل اعلیٰ سے ہم آہنگ کرے۔ یہ تھا اثر پذیری کے لحاظ سے پہلا تعلق کا کردار۔

دوسرا تعلق: انسان کا انسان سے تعلق اسکی طبیعت سے تعلق پر کس حد تک اثر انداز ہوتا ہے یہ تعلق قرآنی اس طرح ہے کہ جتنا انسان کے انسان سے تعلق میں عدل کا مظہر ہوگا جتنا وہ عدالت کے اصولوں کو درک کر سکے گا جتنا انسان اپنے جیسے انسان سے تعلقات میں ہر قسم کے ظلم وجور اور استحصال سے دور رہے گا، یہ جتنا زیادہ واقع ہوگا، اتنا ہی انسان کا طبیعت سے تعلق زیادہ اور روشن وتابناک ہوگا۔ طبیعت اس وقت ذخائر کے دروازے اس کیلئے کھول دے گی اور جو دولت طبیعت کے پاس ہے وہ اسے فراہم کر دے گی۔ آسمان سے برکتیں نازل ہونگی۔ زمین اپنی نعمتوں کو منفجر کر دے گی۔

یہ ہے انسان کے انسان سے تعلق کے بارے میں قرآن کا نقطہ ونظر۔ قرآن کریم کے بہت سارے نصوص میں اس کی تشریح ہوئی ہے:

﴿وان لّو استقاموا علی الطّریقة لاسقیناهم مّآءً غدقًا﴾ ''اور (انھیں یہ بھی

سمجھا دیں کہ) اگر یہ لوگ اسی راہ پر ثابت قدم رہتے تو ہم انھیں وافر پانی سے سیراب کرتے'' (جن/۱۶)

﴿ولو انّهم اقاموا التّورٰة والانجیل وماانزل الیهم مّن رّبّهم لاکلوا من فوقهم ومن تحت ارجلهم منهم امّةٌ مّقتصدةٌ وکثیرٌ مّنهم سآء مایعملون﴾ ''اور اگر یہ اہل کتاب توریت وانجیل اور ان کے رب کی طرف سے ان پر نازل شدہ دیگر تعلیمات کو قائم رکھتے تو وہ اپنے اوپر کی (آسمانی برکات) اور نیچے کی (زمینی برکات) سے مالامال ہوتے ان میں کچھ میانہ رو بھی ہیں لیکن ان میں اکثریت بدکردار لوگوں کی ہے'' (مائدہ/۶۶)

﴿ولو اهل القرٰی اٰمنوا واتّقوا لفتحنا علیهم برکاتٍ مّن السّمآء والارض ولٰکن کذّبوا فاخذناهم بما کانوا یکسبون﴾ ''اور اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے لیکن انھوں نے تکذیب کی تو ہم نے ان کے اعمال کے سبب انھیں گرفت میں لے لیا'' (اعراف/۹۶)

انسان کا تعلق طبیعت سے اسی تناسب سے ہوگا جتنا وہ اپنے بھائی انسان کے ساتھ عدالت کی راہ کو انتخاب کرتا ہے۔ جتنا عدالت کو فروغ ملے گا اتنا ہی انسان کا تعلق طبیعت سے بہتر ہوگا۔ اور اسی طرح جتنا عدالت کو میدان سے ہٹایا جائے گا اتنا ہی طبیعت اپنے خزانے روک دے گی یعنی عادل معاشرہ جہاں انسانی تعلقات میں زیادہ عدالت ہوگی طبیعت سے اتنا ہی تعلقات بڑھیں گے اور ظالم معاشرہ سے نتیجہ یہ ہوگا یہ تعلقات کم ہوں گے، انسان اور طبیعت کا تعلق کم ہوگا۔

مثل اعلیٰ اور مثل فرعونی میں فرق:۔

یہ انسان کا انسان سے تعلق، انسان سے طبیعت کا تعلق میں اثر انداز ہونا فقط غیبی مفہوم نہیں ہے گرچہ ہمارا یہ بھی اعتقاد ہے کہ اس کا غیبی مفہوم ہے، لیکن غیبی ربانی مفہوم کے

علاوہ مفہوم قرآن کریم کے تحت یہ قوانین تاریخ میں سے ایک قانون بھی ہے اور یہ کچھ اس طرح ہے کہ ظالم معاشرہ، طول تاریخ میں فرعونی معاشرہ، ایک پراگندہ معاشرہ ہے، ایک منتشر فرعونی گروہ ہے۔ جب یہ گروہ انسان کا اپنے جیسے انسان کے بارے میں حکم کرتا ہے تو اس کا ہدف معاشرہ کی طاقت اور قدرتوں کا پراگندہ کرنا ہوتا ہے، اس کے گروہوں کو منتشر کرتا ہے اس کے امکانات کو ہوا میں اڑاتا ہے اور یہ ایک واضح سی بات ہے کہ جب ایسے منتشر، پراگندہ، فنا، ٹکڑا ٹکڑا کرنا وغیرہ ہو تو وہ اس معاشرے کے افراد کی حقیقی طاقتوں کو جمع نہیں کرسکتا اور تمام ایجادات کی بنیاد کو جمع نہیں کرسکتا تا کہ طبیعت سے معاملہ اور استفادہ لینے کے میدان میں طبیعی طور پر اس میں رشد و نمو آجائے اور طبیعت پر مسلط ہو سکے۔ یہ ہے پست فرعونی مثل اعلیٰ اور حقیقی مثل اعلیٰ یعنی توحیدی میں فرق۔ مثل اعلیٰ توحیدی انسانی معاشرے کو متحد کرتی ہے۔ ہر قسم کے اختلافات و امتیازات جو اس مثل اعلیٰ کی حدود میں ہیں ان کو مٹاتی ہے۔ اس میں شامل ہونے کے اعتبار سے وہ تمام حدود اور امتیازات کو اپنے احاطہ میں لے لیتا ہے، تمام اختلافات کو پی لیتا ہے، تمام بشریت کو ایک نکتہ پر جمع کرتا ہے اور ان میں بعض سے بعض کے درمیان فرق پیدا کرنے کی کوئی چیز نہیں۔ یہاں امتیاز کیلئے نہ خون نہ جنس اور نہ قومیت یا قبیلہ یا جغرافیائی حدود کسی کو قبول نہیں کیا جاتا۔

یہ مثل اعلیٰ اپنی شمولیت کے لحاظ سے بشر کو متحد کرتی ہے۔ لیکن پست مثل اعلیٰ معاشرے میں تقسیم بندی اور تفرقہ ڈالتی ہیں۔ دیکھیں مثل اعلیٰ توحیدی کو ان آیات میں بیان کیا گیا ہے:

﴿انّ هٰذہٖ امّتکم امّةً وّاحدةً وّانا ربّکم فاعبدون﴾ ''یہ تمہاری امت یقیناً اُمت واحدہ ہے اور میں تمہارا رب ہوں لہٰذا تم صرف میری عبادت کرو'' (انبیاء/۹۲)

﴿وانّ هٰذہٖ امّتکم امّةً وّاحدةً وّانا ربّکم فاتّقون﴾ ''اور تمہاری یہ امت یقیناً امت واحدہ ہے اور میں تمہارا پروردگار ہوں لہٰذا مجھ سے ہی ڈرو'' (مومنون/۵۲)

یہ مثل اعلیٰ توحیدی کی منطق ہے جو کسی قسم کی حد بندی اور بشریت کے درمیان فاصلہ یا حجاب کی قائل نہیں ہے۔ آیئے اب پست مثل اعلیٰ کی منطق کو دیکھیں اور اس ظالم معاشرے کے بارے میں قرآن کیا کہتا ہے، انکی کیا منطق ہے:

﴿انّ فرعون علافی الارض وجعل اهلها شیعًا یّستضعف طآئفةً مّنهم یذبّح ابناء هم ویستحي نسآء هم انّه کان من المفسدین﴾ ''اور فرعون نے زمین میں سر اٹھا رکھا تھا اور اس کے باسیوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا ان میں سے ایک گروہ کو اس نے بے بس کر رکھا تھا وہ ان کے بیٹوں کو ذبح کرتا اور ان کی عورتوں کو زندہ چھوڑتا تھا اور وہ یقیناً فسادیوں میں سے تھا'' (قصص/۴)

فرعون پست مثل اعلیٰ کا نمونہ ہے پوری تاریخ میں فرعونیوں نے انسان اور انسان کے درمیان تعلقات کو ظلم واستحصال پر قائم کیا ہے۔ فرعون معاشرے کو منتشر کرتا ہے، اجتماع کی توانائیوں کو برباد کرتا ہے، انسانوں کے اندر جو توانائی وقدرت ہے انکا ضیاع کرتا ہے، انسان کی وہ صلاحیتیں جو طبیعت سے استفادہ اور اس میں نمو اور رشد کی ہے ان سے چھین لیتا ہے۔

فرعونی معاشرے کا گروہ

فرعونی معاشرے کی تقسیم کے حوالہ سے یہ معاشرہ چند بابوں اور چند گروہوں میں تقسیم ہوتا ہے:

پہلا گروہ: اس معاشرے کا پہلا گروہ ظالم ہے لیکن ساتھ ہی مستضعف بھی ہے۔ فرعونی معاشرے کی تقسیم بندی کے دوران ظالمین کا پہلا گروہ جہاں ظالم ہے وہیں مظلوم بھی ہے یا اسے ہمارے آئمہؑ کی تعبیر کے مطابق ''اعوان الظلمہ''، یعنی ظالمین کے مددگار ہیں۔ یہ ظالم مستضعف فرعون کی حمایت کرتے ہیں اجتماع میں یہی لوگ فرعون کیلئے پشت پناہ ہیں یہ گروہ ہی اسکے استمرار اور ڈھانچہ کی ضمانت ہے۔ خداوند عالم فرماتے ہیں:

﴿وقال الّذین کفروا لن نؤمن بهٰذا القراٰن ولا بالّذی بین یدیه ولو ترٰی

اذلظّالمون موقوفون عندربهم يرجع بعضهم الى بعض القول يقول الّذين اسُتضُعفو اللّذين اسُتكبرو الو لاانتم لكنامؤمنين ﴾''اور کفار یہ کہتے ہیں کہ ہم نہ اس قرآن پر ایمان لائیں گے اور نہ اس سے پہلے والی کتابوں پر،تو کاش آپ دیکھتے جب ان ظالموں کو پروردگار کے حضور کھڑا کیا جائے گا اور ہر ایک بات کو دوسرے کی طرف پلٹائے گا اور جن لوگوں کو کمزور سمجھ لیا گیا ہے وہ اُنچے بن جانے والوں سے کہیں گے کہ اگر تم درمیان میں نہ آگئے ہوتے تو ہم صاحب ایمان ہو گئے ہوتے'' (انبیاء/ ۳۱)

اس آیت میں خداوند عالم نے ظالمین کے بارے میں گفتگو کی ہے ﴿اذلظّالمون موقوفون﴾ کہ جب قیامت کے دن ظالمین کو کھڑا کیا جائے گا یہ گروہ اپنی جگہ دو حصوں میں تقسیم ہونگے ایک ظالم ہیں استکبار کرنے والے یعنی صاحب قدرت اور دوسرے وہ ہیں جنھیں ضعیف بنا کر مظلوم بنایا گیا ہوگا۔پس یہاں پر ظالمین میں مستکبرین بھی ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں جو معاشرہ میں فرعونیت پھیلاتے ہیں اور ان میں مستضعفین ہیں،پس فرعونی ظالم معاشرہ کی تقسیم میں پہلا گروہ ظالمین اور مستضعفین ہیں۔

یہ لوگ قیامت کے دن ظالمین کے ساتھ محشور ہونگے۔ یہ لوگ اس دن ان ظالمین ومستکبرین کو خطاب کریں گے جنھوں نے انھیں ظلم کرنے کیلئے مستضعف بنایا کہ اگر تم لوگ نہ ہوتے تو ہم مومن ہوتے۔لہٰذا اس پہلے گروہ میں ظالمین سے مراد وہ لوگ ہیں جو فرعون کی حمایت کرنے والے ہیں۔

دوسرا گروہ: ظالم معاشرے میں فرعونی پراکندگی کے عمل کے لحاظ سے دوسرا گروہ یہ ہے جو فرعونی حکومت کے حاشیہ نشین ہیں یعنی اسکی حکومت کے گن گاتے ہیں۔یہ لوگ خود ظلم نہیں کرتے لیکن ہمیشہ فرعون کی حمایت کرتے ہیں۔فرعون کی کامیابی ودوام کے خواہاں ہیں۔اسکی خواہشات کے مطابق چلتے ہیں اور یہ لوگ خود ان سے پہلے بات کرتے ہیں تاکہ ان کے کردار اور سیرت پر صحت کی مہر لگادیں۔ان کے بارے میں یہ آیت ملاحظہ کریں:

﴿وقال الملا من قوم فرعون اتذرموسیٰ وقومه ليفسدوافى الارض ويذرک والٰهتک قال سنقتل ابناء هم ونستحي نساء هم وانافوقهم قاهرون ﴾''اور فرعون کی قوم کے ایک گروہ نے کہا کہ کیا تو موسیٰ اور ان کی قوم کو یوں ہی چھوڑ دے گا کہ یہ زمین میں فساد برپا کریں اور تجھے اور تیرے خداؤں کو چھوڑ دیں۔اس نے کہا کہ میں عنقریب ان کے لڑکوں کو قتل کرڈالوں گا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھوں گا میں ان پر قوت اور غلبہ رکھتا ہوں'' (اعراف/ ۱۲۷)

یہ وہ گروہ ہے جو فرعون کو اٹھاتا ہے یہ لوگ جانتے ہیں کہ ان کی باتیں فرعون کے دل میں موجود انتقامی جذبہ کو ابھاریں گی۔خود فرعون ایسی باتیں کرنے والوں کا نیازمند بھی ہے لہٰذا یہ لوگ ایسی باتیں کرتے وقت ایک دوسرے پر سبقت لینے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ فرعون کو اسکے اندر سے آگاہ کریں اور اسکے ساتھ وہ انکی حمایت احساسات وعواطف کو بھی جان لے۔

تیسرا گروہ: فرعونی معاشرے کی تقسیم بندی میں ظالمین کا تیسرا گروہ وہ ہے جن کے بارے میں امیر المومنینؑ حضرت علیؑ نے فرمایا کہ یہ لوگ ''همج الرعا'' ہیں۔یہ گروہ صرف ایک آلہ ہیں اور ظلم کے سامنے سرتسلیم خم ہوتے ہیں،شاید ان پر ظلم ہوتے وقت خود انھیں اس بات کا احساس بھی نہ ہوتا ہو۔انکو یہ بھی پتہ نہیں کہ یہ مظلوم ہیں یا یہ بھی درک نہیں کرتے کہ معاشرے پر ظلم ہو رہا ہے انکی گردش مشین کے پرزے کی مانند ہے مثلاً گاڑی کے ٹائر کی حرکت کی طرح ہیں بغیر سوچے سمجھے اور تدبر کے ایک اتباع اور اطاعت میں محو ہیں۔فرعون نے ان سے تدبر اور فکر کی صلاحیت کو چھین لیا ہے ان کی عقل اور ان کی سوچ کو ان سے سلب کیا ہے ان کے ہاتھ کو ان سے جوڑے رکھا ہے اور ان کی عقل کو ان سے الگ رکھا ہوا ہے۔اسی وجہ سے ان کے ہاتھ کی حرکت ایک آلہ کی حرکت کی طرح ہوتا ہے۔ہر قسم کے احکام کے سامنے سرتسلیم خم ہوتے ہیں۔فرعونی تمام اوامر کا بغیر کسی سوال ومناقشہ کے اطاعت کرتے ہیں۔ان کے بارے میں کوئی سوچتا نہیں۔

یہ وہ گروہ ہے جس کی طبیعت سے لڑنے اور اس سے استفادہ کرنے کی صلاحیت کو محو کر دیا گیا ہے، اسکی تمام قابلیت ختم ہو چکی ہے کیونکہ اس کو ایک مشین کے آلہ میں بدل گیا ہے۔ اگر اس سے کہیں کوئی قدرت وایجاد دیکھنے میں آئے تو یہ اسکی عقل وشعور کی پیدا کردہ نہیں ہے۔ یہ اس حرکت دینے والے کی ہے، یہ اس فرعون کی ایجادات ہیں جو ان آلات کو حرکت دے رہا ہے۔ اس گروہ کو ایسے لوگ اور ایسے بشر نہیں کہہ سکتے جو فکر کرتے ہوں اور سوچتے ہوں تاکہ اس سوچ کی مدد سے معاشرے میں کوئی ایجاد یا تحریک چلائی جا سکے:

﴿وقالو اربنا انا اطعنا سادتنا و کبر آءنا فاضلو انا السّبیلا﴾ ''اور کہیں گے کہ ہم نے اپنے سرداروں اور بزرگوں کی اطاعت کی تو انھوں نے راستی سے بہکا دیا'' (احزاب/ ٦٧)
انکے کلام میں آپ کو کوئی ایسی چیز نہیں ملے گی کہ جس سے یہ اندازہ ہو جائے کہ وہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا احساس کر رہے ہیں یا یہ حس کر رہے ہوں کہ خود وہ لوگ مظلوم ہیں بلکہ یہ صرف اطاعت وپیروی کرنے والے ہیں۔

یہی گروہ مولا امیر المومنینؑ کے اس فرمان میں تیسرا گروہ ہے جہاں آپؑ نے فرمایا: لوگ تین قسم کے ہوتے ہیں ایک عالم ربانی ہیں دوسرے نجات کیلئے راستہ تلاش کرنے والے متعلم ہیں اور تیسرے یہی ھمج الرعٰی ہیں جو ہر آواز کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔

یہ تیسرا گروہ ہر صالح معاشرے کے لئے مشکل ایجاد کرتا ہے لہٰذا صالح معاشرے کو چاہیئے کہ جتنا ممکن ہو سکے اس گروہ کو ختم کرے اور اسکو دوسرے گروہ میں تبدیل کرے یعنی حضرت امیر المومنینؑ کی تعبیر کے مطابق حقیقت کا متلاشی گروہ یعنی متعلم علی سبیل نجات یا قرآن کریم کی تعبیر کے مطابق تابع بہ احسان میں تبدیل کرے یا آگاہانہ بصیرت کے ساتھ تقلید کرنے والوں میں تبدیل کرے جیسے فقہ میں آیا ہے۔

جتنا اس گروہ کو دوسرے گروہ میں تبدیل کر سکیں گے اتنا ہی معاشرہ دوام پائے گا اور اسکی عمر طویل ہوگی یہاں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ امیر المومنینؑ کی نظر میں یہ صالح معاشرہ

کہ ضرورت میں سے ہے کہ اس تیسرے گروہ سے نفرت کی جائے۔ یہ گروہ ھمج الرعٰی ہیں یہ ہر آواز کے پیچھے چلتے ہیں۔ انکی اپنی کوئی عقل یا ارادہ نہیں ہے لہٰذا امام علیؑ کا یہ نظریہ ہے کہ اس گروہ کا صالح معاشرے سے خاتمہ ہونا چاہیئے۔ اور یہاں خاتمہ سے مراد انکو قتل کرنا نہیں ہے بلکہ انھیں دوسرے گروہ میں تبدیل کرنا ہے تاکہ صالح معاشرہ اپنی ایجاد وابتکار کو جاری رکھ سکے۔ تاکہ صالح معاشرہ دنیا کے تمدن میں شریک ہو سکے اور فرعونیوں کے خلاف اٹھ سکے۔

لیکن اس کے برخلاف فرعون اور فرعونی معاشرہ ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ اس تیسرے گروہ میں اضافہ ہو اسکو وسعت ملے۔ اس ھمج الرعٰی گروہ کو وسعت ملے جو ہر آواز کے پیچھے چلتے ہیں۔ کیونکہ جتنا ان میں وسعت آئے گی معاشرہ اتنا ہی پستی کی طرف جائے گا کیونکہ اگر داخل یا باہر سے کوئی مصیبت آ جائے تو یہ گروہ کسی بھی صورت اپنے معاشرہ کا دفاع نہیں کر سکے گا۔ معاشرہ میں اس طبقہ کا جتنا اضافہ ہوگا' اس تیسرے گروہ کے ان لوگوں کا جو ہر آواز پر چلتے ہیں تو معاشرے کو فنا و نابودی کی طرف لے جائے گا اور آخر کار معاشرہ طبعی موت مر جائے گا۔

قرآنی اصطلاح کے تحت معاشرہ، اقوام اور امتوں کیلئے جو موت کا ذکر ہے وہ مرنے کے بعد دفنانے والی موت نہیں ہے۔ اجتماع کیلئے دو موتیں ہیں ایک موت طبعی ہے اور دوسری موت شگافی۔ معاشرے کی طبعی موت اس تیسرے گروہ کی تعداد اور کیفیت میں اضافے سے ہوتی ہے۔

چوتھا گروہ: چوتھا گروہ وہ لوگ ہیں جو ظالم کو نفسیاتی طور پر مسترد کرتے ہیں وہ گروہ ہیں جنہوں نے فرعون اور فرعونیت کے مقابل اپنی عقل کو نہیں کھویا ہے۔ یہ ظلم کو برا گردانتے ہیں۔ لیکن عملی طور پر خاموشی اختیار کرتے ہیں اور وقت گذرنے کا انتظار کرتے ہیں۔ یہ لوگ پریشانی اور اضطراب کی زندگی گزارتے ہیں جب ایسی حالت میں زندگی گزارتے ہیں تو انسان کی طبیعت کے ساتھ تعلقات میں کوئی ایجاد تجدید اور رشد ونمو نہیں

کرسکتے انکے بارے میں قرآن کریم کی یہ آیت ہے:

﴿انّ الّذین توفّٰھم الملٓئکة ظالمی انفسھم قالوا فیم کنتم قالوا کنّا مستضعفین فی الارض قالوا الم تکن ارض اللّٰہ واسعةً فتھاجروا فیھا فاولٓئک مأوٰھم جھنّم وسآء ت مصیرًا﴾ ''وہ لوگ جو اپنے آپ پر ظلم کررہے ہوتے ہیں جب فرشتے ان کی روحیں قبض کرتے ہیں تو ان سے پوچھتے ہیں: تم کس حال میں مبتلا تھے؟ وہ کہتے ہیں: ہم اس سرزمین میں بے بس تھے۔ فرشتے کہتے ہیں: کیا اللہ کی سرزمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ پس ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت بری جگہ ہے'' (نساء/ ۹۷)

انہوں نے دوسروں پر ظلم نہیں کیا یہ لوگ ظالم مستضعف بھی نہیں ہیں جیسا کہ پہلا گروہ تھا اور نہ ہی حاشیہ نشین اور فرعون کے مداحان میں سے تھے اور نہ ہی انکا شمار ھمج الرعٰی میں ہے کہ جو اپنی عقل کو کھو چکے ہیں، نہیں یہ لوگ ایسے نہیں ہیں بلکہ اس کے برعکس ہیں یہ لوگ یہ درک کرتے ہیں کہ وہ مستضعف ہیں: ﴿قالوا کنّا مستضعفین فی الارض﴾ انہوں نے عقل کو نہیں کھویا ہے یہ اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا احساس کرتے ہیں۔ اپنے گردونواح کے حالات کے ساتھ مصالح اور خاموشی میں زندگی گزارتے ہیں۔ لہٰذا قرآن کریم نے فرمایا انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ کیا اس گروہ سے یہ توقع رکھنا صحیح ہے کہ انسان اور طبیعت کے تعلقات کے میدان میں ان سے کوئی ایجادات رونما ہونگے؟ ہرگز نہیں!

پانچواں گروہ: فرعونی معاشرے کی تقسیم بندی کے درمیان ظالمین کا پانچواں گروہ وہ ہے جو میدان سے فرار کی راہ اختیار کرتا ہے، میدان سے دور ہوجاتا ہے۔ یہ گروہ رہبانیت ہے جو طول تاریخ میں تمام ظالم معاشرے میں موجود رہا ہے۔ انکی دو قسمیں ہیں۔ ان میں سے ایک اپنے آپ کو نجات دلوانا چاہتا ہے۔ خود کو اس ظالم معاشرے میں ملوث نہیں کرنا چاہتا۔ یہ جزئیت اپنانے والا گروہ ہے اسکا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں ہے:

﴿ثم قفّینا علٰی اٰثارھم برسلنا وقفّینا بعیسی ابن مریم واتیناہ الانجیل وجعلنا فی قلوب الّذین اتّبعوہ رأفةً ورحمةً ورھبانیة ابتدعوھا ما کتبناھا علیھم الا ابتغاء رضوان اللّٰہ فما رعوھا حق رعیتھا فاٰتینا الّذین اٰمنوا منھم اجرھم وکثیرٌ مّنھم فاسقون﴾ ''پھر ہم نے انہی کے نقش قدم پر دوسرے رسول بھیجے اور ان کے پیچھے عیسیٰ بن مریم کو بھیجا اور انھیں انجیل عطا کردی اور ان کا اتباع کرنے والوں کے دلوں میں مہربانی اور محبت قرار دیدی اور جس رہبانیت کو ان لوگوں نے ازخود ایجاد کرلیا تھا اور اس سے رضائے خدا کے طلبگار تھے اسے ہم نے ان کے اوپر فرض نہیں قرار دیا تھا اور انھوں نے خود بھی اس کی مکمل پاسداری نہیں کی تو ہم نے ان میں سے واقعاً ایمان لانے والوں کو اجر عطا کردیا اور ان میں سے بہت سے تو بالکل فاسق اور بدکردار تھے'' (حدید/ ۲۷)

اسلام اس رہبانیت کو مسترد کرتا ہے کیونکہ یہ اسلام کا روئے زمین پر خلیفہ ہونے کی مسئولیت کے بارے میں منفی موقف رکھتی ہے۔

یہاں ایک جعلی اور خودساختہ رہبانیت بھی ہے یہاں خود کو راہب بناتے ہیں۔ راھبوں کا لباس پہنتے ہیں لیکن اندر سے راھب نہیں ہیں بلکہ یہ مصنوعی رہبانیت سے لوگوں کو غفلت میں رکھنا چاہتا ہے۔ اور فرعون اور اسکے ظلم کے مقابلہ سے باز رکھنا چاہتا ہے اور لوگوں پر روحی اور نفسی لحاظ سے مسلط ہونا چاہتا ہے اس گروہ رہبانیت کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں ہے:

﴿یاایّھا الّذین اٰمنوا اِنّ کثیرًا مّن الاحبار والرّھبان لیأکلون اموال النّاس بالباطل ویصدّون عن سبیل اللّٰہ والّذین یکنزون الذھب والفضّة ولا ینفقونھا فی سبیل اللّٰہ فبشّرھم بعذاب الیم﴾ ''اے ایمان والو! (اہل کتاب کے) بہت سے علماء اور راہب لوگوں کا مال ناحق کھاتے ہیں اور انھیں راہ خدا سے روکتے ہیں اور جو لوگ سونا اور چاندی ذخیرہ کرتے ہیں اور اسے راہ خدا میں خرچ نہیں کرتے انھیں

دردناک عذاب کی خوشخبری سنادیجئے‘‘(توبہ/۳۴)

چھٹا گروہ: چھٹااورآخری گروہ مستضعفین ہیں۔جب فرعونیت نے معاشرہ کوگروہوں میں تقسیم کیااورفرعون نے جب اپنی قوم سے ایک گروہ کواپنالیاتو قوم میں ایک معین گروہ کومستضعف بنایاانھیں ذلیل اورضعیف بنادیاانکی کرامت وعزت کوگرایاہے کیونکہ یہ وہی گروہ تھا جو پہچانا جاتا تھا کہ فرعون کے خلاف حرکت کی بنیادرکھیں گے لہٰذا انہوں نے چن چن کرانھیں مستضعف بنایااسکاذکراس آیت میں ہے:

﴿واذانجیناکم من اٰل فرعون یسومونکم سوٓء العذاب یذبّحون ابنآء کم ویستحیون نسآء کم وفی ذٰلکم بلاءٌ مّن رّبّکم عظیم﴾’’اور(وہ وقت یادکرو)جب ہم نے تمھیں فرعونیوں سے نجات دی جوتمھیں بری طرح اذیت دیتے تھے‘ تمہارے لڑکوں کوذبح کرتے تھےاورتمہاری عورتوں کوزندہ رہنے دیتے تھےاوراس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑاامتحان تھا‘‘(بقرہ/۴۹)یہ چھٹا گروہ ہے۔

تعلقات میں تبدیل کے مطابق مواقع کی تبدّل ہوتی ہے:

قوانین تاریخ میں سے ایک قانون کے ضمن میں قرآن کریم نے یہ بھی سکھایاہے کہ ظالم فرعونی معاشرہ کے ترکیب کے ہرگروہ کاموقعیت ظلم ختم ہونے کے بعداسی تناسب سے برعکس ہوگا(مثلاً جب عدالت قائم ہوگی توچھٹا گروہ پہلاگروہ ہوگا۔مترجم)۔وہ گروہ جوصحیح معنوں میں ظلم کومسترد کرتا ہےاوراسکا خاتمہ چاہتا ہے وہ یہ چھٹا گروہ ہے اسکا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں موجود ہے:

﴿ونریدان نّمنّ علی الّذین اسُتضعفوافی الارض ونجعلھم ایمۃً وّنجعلھم الوٰرثین﴾’’اورہم یہ چاہتے ہیں کہ جن لوگوں کوزمین میں کمزوربنادیا گیاہےان پراحسان کریں اورانھیں لوگوں کاپیشوابنائیں اورزمین کاوارث قراردیدیں‘‘(قصص/۵)

خدا چاہتا ہے اس چھٹے گروہ کوقائدورہبر بنائے اوراسکواس روئے زمین پراپنا وارث بنائے اوریہ ایک الگ تعلقات ہےاورایک الگ تاریخی قانون ہےجس کے بارے

میں گفتگوانشاءاللہ بعدمیں ہوگا۔

اب ہم یہاں تک کی اس حقیقت کا خلاصہ بتاتے ہیں:معاشرہ میں ظلم کے ساتھ انسان کی طبیعت کے ساتھ تعلقات کے زیادہ ہونے میں برعکس تناسب ہے(یعنی جب ظلم نہ ہوتو تعلقات بہتر ہونگے)اورمعاشرہ عدل ہونے کے ساتھ انسان کاطبیعت کے ساتھ تعلقات زیادہ ہونے میں مثبت تناسب ہے۔فرعونی معاشرہ جو پراگندہ اور تقسیم درتقسیم ہے اس کی قابلیت اورصلاحتیں ضائع ہوتی ہیں۔طاقت وتوانائیاں جامد ہوتی ہیں اسی وجہ سے ان پرآسمان اپنی رحمت روک دیتاہے۔اورزمین بھی اپنی برکات کھینچ لیتی ہے۔لیکن جہاں معاشرے پرعدل کی حکمرانی ہووہاں اسکے برعکس ہوتا ہے۔تمام صلاحتیں اورقابلیت متحد ہوتی ہیں اورقدرت وتوانائی کے مواقع پیدا ہوتے ہیں۔اس معاشرے میں جیسا کہ روایات میں آیاہے کہ امام زمانؑ ظہور کے موقع پرزمین وآسمان اپنی خیرات کے دروازے کھول دیں گےاوراس کی وجہ عدالت کا قائم ہوناہے،عدالت طبیعت کے پھلنے پھولنے میں بڑاکرداررکھتی ہے یہ تھے وہ دوزاویئے یعنی انسان کاتعلق طبیعت سے اورانسان کاتعلق انسان سےاوران دونوں کاآپس میں ایک دوسرے پراثرانداز ہونا۔

روزسہ شنبہ۴رجب۱۳۹۹ھ

درس چہاردہم

اعوذباللہ من الشیطان الرجیم   بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
وافضل الصلوات علی خیرخلق محمدوعلی آلہ المیامین
الطاھرین.

معاشرہ کے عناصران عناصر کے کرداراوراجتماعی تعلقات میں موجوددوخطوط کے درمیان قائم تعلق کے بارے میں قرآنی نقطہ ونظرکا کامل تحلیل وتجزیہ ہم نے یہاں تک بیان کیااوراجتماعی تعلقات میں موجوددوخطوط سے مرادانسان کاانسان سے تعلق اورانسان کاطبیعت سے تعلق ہے۔اب ہم اس قرآنی نظریہ کے روشنی میں اس نتیجہ پرپہنچتے ہیں کہ ان دونوں خطوط میں سے ہرایک دوسرے سے مستقل ہےاور یہ استقلال بھی استقلالِ نسبی ہے یہ دواجتماعی تعلقات ہرایک دوسرے سے مستقل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک حوالے سےایک دوسرے پراثرانداز بھی ہوتے ہیں۔

معاشرہ کے عناصرکی تحلیل اورمعاشرہ کوایک خاص شکل میں سمجھنے کے لئے قرآن کریم کا یہ نظریہ شریعت اسلامی کے عمومی پہلو کے لئے ایک بنیادفراہم کرتا ہے کیونکہ شریعت اسلامی اپنے عمومی پہلوؤں اورطریقوں میں اسی لحاظ سے ایک دوسرے سے متاثر اوراثرانداز ہوتے ہیں کہ جس لحاظ سے قرآن اوراسلامی نظریہ معاشرہ اوراس کے عناصراوران عناصر کے کرداراوردوخطوط کے درمیان متبادل تعلقات پرنظررکھے ہوئے ہیں۔

اور یہ نظریات جسے ہم نے پڑھااورنصوص قرآنی سے جومجموعہ ذکرہوااس کی روشنی میں جس نتیجہ پرہم پہنچے ہیں یہی نظریات درحقیقت شریعت اسلامی کے عمومی پہلو کا بنیادی اوراصولی موقف ہیں کیونکہ دوخطوط یعنی انسان کااپنے جیسے انسان سے تعلق کا پہلواورانسان کاطبیعت سے تعلق کا پہلوکے درمیان استقلال نسبی شریعت اسلامی کے ثابت

عنصراورشریعت میں ثابت اس منطقہ کے لئے بنیاداورقواعدتشکیل دیتا ہے۔یہ عمومی شریعت منصوص احکام پرمشتمل ہے کہ جس کی سرشت شریعت اسلام میں دائمی ہے،جبکہ دو پہلوؤں یعنی انسان کاطبیعت سے تعلق کا پہلواورانسان کااپنے جیسے انسان سے تعلق کا پہلومنطقہ تفاعل اورنرم گوشہ ہے کہ جسے ہم نے اپنی کتاب''اقتصادنا''میں منطقہ فراغ نام رکھا ہے۔ یہی منطقہ فراغ شریعت اسلامی میں نرم گوشہ اورمتحرک عناصرکی بنیادرکھتا ہے شریعت اسلامی میں یہ ملائم اورمتحرک عناصران دوخطوط کے درمیان اثراندازاوراس ملائمت کاتشریعی انعکاس ہےاوروہ پہلے والے شریعت اسلامی میں عناصرثابت اورغیرمتحرک ہیں وہ ان دوخطوط کے درمیان اس استقلال نسبی کاانعکاس ہے یہاں سے ہے کہ ہمارا یہ اعتقاد ہے کہ معاشرے میں شریعت اسلامی کی کامل صورت درحقیقت دوپہلوپرمشتمل ہے: کچھ ثابت عناصراور کچھ متحرک اورملائم عناصرپرمشتمل ہیں اورمتحرک اورملائم عناصرجسے حاکم شرعی کے لئے رکھا ہےاس حاکم شرعی کے لیے کہ جس کے سامنے اسلامی عمومی حالات ہوتے ہیں تاکہ وہ ان متحرک عناصرکواسلام کے عمومی حالات اورشرائط کے تحت پورا کریں۔یہ بحث مزیدبحث طلب ہے۔تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ اسے اورطول دیا جاسکتا ہے۔انشاءاللہ مناسب موقع ومحل آنے پراس بحث پراحاطہ کریں گے۔اوراسلام کے تشریعی پہلوکواسکے نظری پہلو سے جوڑیں گے جوکہ ہم نے قرآن کریم سےاجتماعی عناصر کے بارے میں نکالا ہے۔

تاریخ کے تین ادوار:۔

اسکے بعدایک اوربحث اسلامی نظریات کے تحت تاریخ کےادوار کے بارے میں باقی رہ جاتی ہےاوروہ بحث یہ ہے کہ تاریخ میں انسان کا زمین میں کیا کرداررہا ہے؟

قرآن کریم نے انسانی حیات کواس زمین پرتین دورمیں تقسیم کیا ہے پہلا اسکا دور حظانت ہے یعنی اسکی پرورش کا دور ہے دوسرادوروحدت ہےاورتیسرادورانتشارواختلاف ہے۔یہ تین ادوارجن کے بارے میں قرآن نے خبردی ہے ہردور کے حالات اور

خصوصیات اور امتیازات کو جو ایک دوسرے سے جدا ہیں بیان کی ہیں۔ اس سلسلے میں ہم بھی ایک کلی اور عمومی نظریہ اس زاویئے کے بارے میں نکالیں گے اور بحث کریں گے لیکن یہ تمام بحث و گفتگو ایک دن میں اور ایک ہی بحث میں ممکن نہیں ہے لہٰذا بہتر یہ ہے کہ ہم اسکو ایک اور موقع کیلئے چھوڑیں۔ ابھی ہم فکری میدان سے نکل کر میدان قلب میں داخل ہوتے ہیں۔

حب اللہ وحب دنیا

اب ہم فکری میدان سے نکل کر میدان قلب کی طرف منتقل ہوتے ہیں۔ منطقِ عقل سے نکل کر منطقِ وجدان کی طرف منتقل ہوتے ہیں یعنی ہم چاہتے ہیں کہ کچھ لمحات اپنے دلوں کے ساتھ گزاریں نہ فقط اپنے عقول کے ساتھ، اپنے وجدان اور دلوں کے ساتھ کچھ دیر گزاریں۔ اپنے قلوب کو قرآن کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں بجائے اس کے کہ ہم اپنی فکر و عقل کو قرآن کے سامنے پیش کریں۔ اپنے دلوں کو قرآن کے سامنے پیش کرتے ہیں تا کہ دیکھیں کہ اس میں محبت کسی کیلئے ہیں؟ کس چیز کی محبت ہے جو ان دلوں کا احاطہ کیئے ہوئے ہے اور وہ کون ہے جو اس دل کا مرکز و محور بنا ہوا ہے۔ خداوند متعال ایک دل میں بیک وقت دو ولائتیں (محبتیں) جمع نہیں کرتے، محبت دو قطبی محبت جمع نہیں ہوسکتی اس میں یا حب اللہ ہوگی یا حب دنیا ہوگی یہ دونوں ایک ساتھ ایک دل میں جمع نہیں ہوسکتیں۔ آیئے ہم اپنے دلوں کی آزمائش کریں اپنے دلوں کی طرف رجوع کریں تا کہ اس کا امتحان کرلیں آیا اس میں حب اللہ ہے یا حب دنیا ہے۔ اگر حب اللہ ہے تو خداوند متعال سے دُعا کریں کہ وہ اسے اور راسخ کردے اور اگر نعوذ باللہ حب دنیا ہے تو ہمیں اس مہلک بیماری سے نجات دے۔

حب اللہ وحب دنیا کے درجات:۔

ہر حب کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ دل کو اپنا مرکز بنائے اور ان دو مقاموں اور مرتبوں میں سے ایک مقام اور مرتبہ کو اخذ کرتا ہے۔

پہلا درجہ

یہی محبت اس انسان کے شعور عواطف، آرزوئین اور خواہشات کا مرکز اور بنیاد ہے۔ انسان کبھی کسی کام کے خاطر اس دائرے سے مختصر وقت کیلئے نکلتا ہے لیکن جلد ہی پلٹ کر اسکی طرف دوبارہ آجاتا ہے کیونکہ یہی اسکی بنیاد و مرکز ہے مثلاً کبھی کوئی باتیں کرے، کوئی کام کرے، کھانے پینے، سماجی تعلقات وغیرہ میں مصروف ہونے کی وجہ سے اسکی طرف سے ہٹتا ہے لیکن جلد ہی دوبارہ اسکی طرف پلٹ جاتا ہے کیونکہ یہ محبت اسکی بنیاد ہے۔ یہ پہلا درجہ ہے۔

دوسرا درجہ

محبت محور ہے انسان کے پورے وجدان کا۔ یہ محبت مرکز ہے کُلی طور پر کوئی چیز اسے اپنی طرف راغب نہیں کرسکتی۔ وہ جس طرف دیکھتا ہے اسے اپنا محبوب قبلہ وکعبہ دکھائی دیتا ہے جہاں دیکھیں وہی محبوب ہے یہ محبت کا دوسرا درجہ ہوا۔

یہ دونوں درجات، حب اللہ وحب دنیا دونوں میں پائے جاتے ہیں۔ حب اللہ سبحانہ تعالیٰ ایک شریف حب ہے خدا محوری میں یہ دونوں درجے پائے جاتے ہیں۔ یہ پہلے درجہ کی حب اللہ مومنین، صالحین اور وہ پاک وپاکیزہ لوگ جنہوں نے اپنے نفس کو اس دنیا کی پست گندگیوں سے پاک وصاف رکھا ہے ان میں پایا جاتا ہے۔ انھوں نے حب اللہ کو اپنے عواطف، شعور، شہوات اور آرزوؤں کا مرکز کل قرار دیا ہے لیکن وہ کبھی کوئی حاجت کوئی جائز لذت لینے یا کسی سے ملنے کیلئے یا کسی مباح کام کی وجہ سے اپنے محور سے ہٹتے ہیں لیکن جلد ہی اپنے اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اپنے محور و مرکز کی طرف پلٹ جاتے

ہیں یعنی جوں ہی ثانوی کام سے فارغ ہوتے ہیں خدا کی طرف پلٹ جاتے ہیں۔
اس ذکر شدہ حب اللہ کے دوسرے درجہ میں انبیاء اور آئمہ علیھم افضل الصلاۃ والسلام آتے ہیں۔ حضرت علیؑ جنکی قبر مطہر کے جوار میں ہم موجود ہیں یہ عظیم انسان کیا فرماتے ہیں آپ سب جانتے ہیں آپؑ فرماتے ہیں: ''میں نے کسی چیز کو نہیں دیکھا ہے کہ اس سے پہلے، اسکے ساتھ اور اسکے بعد خدا کو نہ دیکھا ہو'' حب اللہ کا دوسرا درجہ اس دل میں احاطہ کیے ہوئے ہے۔ آپؑ کا پورا وجدان حب اللہ میں محو ہے۔ آپ خدا کے علاوہ کسی چیز کو نہیں دیکھتے۔
جب ایسا انسان لوگوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو خدا کی مخلوق سمجھ کر دیکھتا ہے۔ اسے جب کوئی نعمت نظر آتی ہے تو خدا نظر آتا ہے یعنی ہمیشہ خدا سے ربط رہتا ہے اسکا محبوب و معشوق ایک ہی ہے۔ آرزوؤں اور خواہشات میں مرکز وہی ہے۔ خواہشات نفسانی اسے غافل نہیں کرسکتیں۔ اسے خدا کے علاوہ کوئی اور چیز نظر ہی نہیں آتی۔
یہ دو درجات کی تقسیم بندی جو ہم نے حب اللہ میں کی ہے یہ دونوں درجے حب دنیا میں بھی موجود ہیں جو ہر برائی کی سر برآور ہے۔ جس کے بارے میں پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ حب دنیا تمام برائیوں کی جڑ ہے (بحارانوار جلد۱۵ صفحہ ۲۵۸)۔ حب دنیا کے بھی دو درجے ہیں۔

حُبِّ دنیا کے دو درجات:۔

پہلا درجہ یہ ہے کہ یہ حُبّ دنیا انسان کا مرکز و محور بن جاتا ہے یہی حبّ دنیا اس کے تعلقات اور تصرفات، رفتار و سلوک کی بنیاد ہے۔ یہ حرکت کرتا ہے جب یہ حرکت اس کی ذاتی مصلحت میں ہو اور قعود اختیار کرتا ہے جب یہ اس کی ذاتی مصلحت میں ہو اور یہ عبادت کرے گا جب یہ عبادت اس کی ذاتی مصلحت میں ہو اور اس طرح دنیا اس کی بنیاد بن جاتی ہے لیکن کبھی ممکن ہے کہ وہ اس دنیا سے منہ موڑ بھی لے۔ کچھ اچھے کاموں میں مصروف ہوجائے خدا کیلئے نماز پڑھ لے خدا کے لئے روزہ رکھے لیکن جلد ہی پلٹ کر اسی مرکز اور محور کی طرف آئے گا۔ وہ اس شیطانی احاطہ سے چند لمحات کیلئے نکلا ہے اور جلد ہی

پلٹ کر اسی حب دنیا کی طرف جائے گا یہ اس مہلک بیماری یعنی حب دنیا کا پہلا درجہ ہوا۔
حُب دنیا کا دوسرا درجہ بہت مہلک ہے یہاں حب دنیا نے انسان کو اندھا بنا رکھا ہے۔ بصیرت اور روشنائی کے تمام راستے اس پر بند ہوئے ہیں۔ وہ دنیا کو اسطرح دیکھتا ہے جسطرح سیّد الموحدّین امیر المومنینؑ کو ہر کام میں خدا نظر آتا تھا آپؑ کو کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی کہ جس سے پہلے اس کے ساتھ اور اس کے بعد خدا نظر نہ آئے۔ اسی طرح یہ شخص ہر چیز میں دنیا کو دیکھتا ہے۔ کوئی چیز نظر نہیں آتی کہ جس سے پہلے جس کے ساتھ اور جس کے بعد اسے دنیا نظر نہ آئے حتٰی کہ عبادت و معنویت کو بھی اسی دنیا کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اسکی نماز، روزہ، علمی گفتگو سب دنیا میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ وہ ہر فعل میں اسی زاویئے سے سوچتا ہے۔ اس کیلئے ممکن نہیں کہ کوئی چیز نظر آئے اور اس میں دنیا نہ ہو کہ اس سے کتنی دنیا بنے گی کتنا مال و متاع حاصل ہوگا کہ جس کے ساتھ مختصر ایام سے زیادہ زندگی نہیں گزار سکتے۔ یہ حب دنیا کا دوسرا درجہ ہے۔
حُب دنیا کے دونوں درجے مہلک ہیں لیکن پہلے کی بہ نسبت دوسرا درجہ زیادہ مہلک ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''دنیا ہر برائی کی جڑ ہے'' امام جعفر صادق علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا ''دنیا کی مثال سمندر کے پانی جیسی ہے جتنا زیادہ پیئے گا اتنا پیاس میں اضافہ ہوگا اور پیاس نہیں بجھے گی'' سمندر کے پانی سے جتنا زیادہ پیئیں گے اتنا زیادہ پیاس لگے گی ایسا نہیں کہہ سکتا کہ اس دنیا میں سے اس حصّہ کو حاصل کرو پھر اس سے منہ موڑ لو تو پھر وہی حصہ حاصل کرو پھر خدا کی طرف موڑو یہاں ایسا نہیں ہوسکتا بلکہ دنیا میں آپ جتنا بھی مال دنیا حاصل کریں گے دنیا کے اس پست جاہ و مقام میں سے وہ جاہ و مقام حاصل کریں گے۔ آپ کی پیاس اتنا ہی بڑھی گا لہٰذا فرمایا ہے: ﴿الدنیا کماء البحر، الدنیا رأس کل خطیئة﴾
پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''اگر کوئی شخص صبح کرے اور اسکی تمام توجہ و ہمت دنیا کیلئے ہو وہ خدا سے کبھی ربط حاصل نہیں کرسکتا'' یعنی جس دل میں دنیا ہے اسکا خدا سے

ربط ہونا ممکن نہیں یعنی ایک دل میں دو محبتیں جمع نہیں ہوسکتیں جو دنیا سے محبت کرتا ہو، جو دنیا کی فکر میں زندگی گزارتا ہو، جس کی سب سے زیادہ توجہ دنیا پر ہو اس کا خدا سے ربط نہیں ہوسکتا چونکہ ایک دل میں ایک قلب میں دو محبتیں ساتھ جمع نہیں ہوسکتیں۔

حب دنیا ہر برائی کی جڑ ہے۔ یہ حب دنیا ہی ہے جو نماز و روزہ کو معنویت سے نکالتی ہے بلکہ ہر عبادت کو معنویت سے خالی کرتی ہے۔ اس عبادت کا کیا معنی و مفہوم باقی رہتا ہے جب اس انسان کے دل پر حبّ دنیا چھائی ہوئی ہو۔

ہم سب جانتے ہیں لوگوں نے حضرت امیر المومنینؑ سے کیا رویہ اختیار کیا۔ ان لوگوں نے نماز روزہ نہیں چھوڑے تھے، وہ شراب نہیں پیتے تھے، کم از کم یہ تو بتا سکتے ہیں کہ ان لوگوں میں سے اکثر اس طرح کے کام انجام نہیں دیتے تھے لیکن ان نمازوں کا کیا فائدہ ،ان روزوں کی کیا قیمت، ان شراب سے بچ کر رہنے کی کیا ارزش جب انکے دل پر حب دنیا غالب تھی؟

اس عبدالرحمٰن بن عوف کی نماز کی کیا قیمت؟ وہ صحابی جلیل القدر تھے، اسلام کی طرف سبقت کرنے والوں میں سے تھے کہ جس وقت کافر و مشرک رسولؐ کے خلاف تھے یہ ایمان لائے۔ رسول سے تربیت پائی وحی کے ساتھ زندگی گزاری، قرآن کے ساتھ زندگی گزاری، آیات کے ساتھ ساتھ رہے، لیکن کس چیز نے اسے اس لائن پر لگا دی جب مسلمانوں پر خداوند متعال نے فتح کے دروازے کھولے اور ان کے پاس قیصر و کسریٰ کے خزانے جمع ہوئے اس وقت اس مرد مسکین نے کیا کیا؟ اس بیچارے کا دل حُبّ دنیا سے بھرا تھا یہ نماز پڑھتے تھے لیکن دل میں دنیا کی محبت بھری ہوئی تھی، جب علی علیہ السلام اور عثمان میں سے ایک کو انتخاب کرنے کا موقعہ آیا، یا عثمان خلیفہ ہونگے یا حضرت علی علیہ السلام مسلمانوں کا خلیفہ ہونگے یہ شخص جانتا تھا اگر خلافت علیؑ کو ملے تو ہمیشہ کیلئے مسلمان سعادت کی زندگی گزاریں گے اور یہ بھی جانتا تھا اگر عثمان کو ملے تو ہمیشہ کیلئے فتنہ وفساد کے دروازے

کھل جائیں گے اور یہ بات خود عمر سے بھی انھوں نے سنا ہے لیکن اسکے اختیار کے لمحوں میں اس پر حبّ دنیا غالب تھی لہٰذا اس نے اپنے ہاتھ کو عثمان کے ہاتھ پر رکھا اور علی علیہ السلام کے ہاتھوں کو بیعت کرنے والوں کے انتظار میں کھلا چھوڑا اور عثمان کو خلیفہ بنایا اور حضرت علی علیہ السلام کو خلافت سے محروم کیا۔

اب اگر کوئی یہ کہے کہ یہ تو چھوٹی سی بات تھی یہ کسی شخص کے نماز ترک کرنے کی طرح ہے۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو خلیفہ بلا فصل بنایا تھا یہ بات صحیح ہے حضرت علی علیہ السلام سے وابستگی اہم واجبات میں سے ہے لیکن اگر بالفرض محال نہیں ہوتا کہ اگر پیغمبر اکرم نے علیؑ کے بارے میں کوئی سفارش نہ بھی کی ہوتی اور فرض کریں علیؑ کے بارے میں کوئی نصوص و فرمان نہیں تھا، غدیر نہیں ہوئی تھی، حدیث ثقلین کا بھی وجود نہیں، تب بھی کیا عبدالرحمٰن بن عوف کا یہ کام قابل فہم تھا؟ کیا عبدالرحمٰن کا یہ موقف صحیح تھا؟ ہم اگر ان سب نصوص سے چشم پوشی بھی کریں لیکن حبّ اللہ اور حبّ الدنیا کے حوالہ سے، اسلام کے بارے میں دل میں درد رکھنے کے حوالہ سے، دین اور مسلمانوں کے بارے میں غیرت رکھنے کے حوالہ سے کیا پھر بھی عبدالرحمٰن کا موقف صحیح تھا کہ حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں کو بیعت کئے بغیر کھلا چھوڑ دیں اور اس امانت کو اٹھانے کیلئے ایک غیر صالح شخص کی بیعت کریں۔ عثمان بن عفان کی بیعت کریں؟ پس یہاں مسئلہ صرف نص ہونے کا نہیں ہے بلکہ یہاں مسئلہ حبّ دنیا کا ہے، دنیا سے وابستگی کا ہے، امانت میں خیانت کا ہے، دنیا انسان کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔ اس دنیا سے محبت نے عبدالرحمٰن بن عوف سے اسکی نمازوں اور دیگر اچھے کاموں کے معنی چھین لئے ان نیک کاموں کی روح چھین لی اور حقیقی شرافت کا معنی اس سے چھین لیا۔

حب دنیا ہر برائی کی سر برآوردہ ہے۔ جبکہ حُب اللہ ہر کمال کی بنیاد ہے۔ حب اللہ انسان کو شرافت وعزت کا درس دیتی ہے۔ استقامت و نظافت کا درس دیتی ہے۔ تمام کمزوریوں پر غلبہ کا درس دیتی ہے۔ یہ حب اللہ ہی ہے جس نے ساحروں کو ایک آن میں

صراط مستقیم پر لگایا اور وہ فرعون سے کہنے لگے:

﴿**قالوا لن نؤثرک علٰی ماجآء نامن البینات والّذی فطرنا فاقُض مآانت قاضٍ انما تقضی ھٰذہ الحیات الدنیا**﴾ ’’ان لوگوں نے کہا کہ ہمارے پاس جو کھلی نشانیاں آچکی ہیں اور جس نے ہم کو پیدا کیا ہے ہم اس پر تیری بات کو مقدم نہیں کر سکتے اب تجھے جو فیصلہ کرنا ہو کر لے تو فقط اس زندگانی دنیا ہی تک فیصلہ کر سکتا ہے‘‘ (طٰہٰ/۷۲)

ان لوگوں نے کیسے ایسی بات کہہ دی؟ کیونکہ حبّ اللہ ان کے دلوں میں شعلہ زن ہوئے تھے لہٰذا بہت ہی شجاعانہ انداز میں کہا: ﴿**فاقُض مآانت قاضٍ انما تقضی ھٰذہ الحیات الدنیا**﴾

حب اللہ ہی ہے جس نے مولا علیؑ کو ایسی شجاعت دکھانے کا موقع دیا مولا علیؑ کی یہ شجاعت حب اللہ ہی کی وجہ سے تھی۔ علیؑ کی شجاعت درندگی نہیں جیسے شیر کی شجاعت وغیرہ بلکہ آپؑ کی شجاعت ایمان اور حب اللہ کی شجاعت ہے۔ کیسے؟ اس لئے کہ آپ نے تنہا میدان جنگ میں ہی اسکا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ کبھی آپ نے برداشت کر کے اس شجاعت کا مظاہر کیا۔

علیؑ وہ تھے جو ۶۰ سال کی عمر میں کمر باندھ کر میدان جنگ میں اترے اور تن تنہا خوارج کے چار ہزار لشکر پر حملہ کیا۔ یہ میدان جنگ میں علیؑ کی شجاعت کا بلندترین نمونہ ہے۔ یہ شجاعت حب اللہ کی وجہ سے تھی کہ علیؑ چار ہزار کے لشکر سے متاثر نہیں ہوئے۔

اسکے علاوہ علیؑ کی شجاعت کا دوسرا نمونہ تب نظر آتا ہے جب آپ نے اپنے حق سے دستبرداری کرتے ہوئے اسلام کی خاطر خاموشی اختیار کی۔ علیؑ اس وقت جوانی کے عالم میں تھے۔ آپ کے پورے جسم سے اُٹھتی جوانی تھی لیکن اسلام نے کہا خاموش ہو جاؤ، اپنے حق سے دستبردار ہو جاؤ، دین کی بنیاد کو بچاؤ، جب تک یہ لوگ ظاہراً شریعت کے تحفظ کی ذمہ داری لے رہے ہیں خاموش رہیں۔ تو جب تک اسلام اور دین کی ظاہری شعائر اور ظواہر محفوظ رہے آپؑ خاموش رہے۔ یہ مولا علیؑ کی شجاعت کی ایک کرن ہے جو

شیر جیسی شجاعت نہیں ہے بلکہ یہ مومن کی شجاعت ہے جسے حب اللہ نے سپر کیا ہے۔

مولا علیؑ کی شجاعت کا ایک نمونہ آپؑ کے منع کرنے اور ردّ کرنے میں واضح ہوتا ہے یہ اس وقت جلوہ گر ہوا خلیفہ ثانی کے قتل کے بعد جب ایک شخص نے مشروط قسم کی بیعت کرنے کی پیش کش کی جو کتاب خدا و سنت رسولؐ کے خلاف تھی تو علیؑ نے اسے رد کیا۔ علیؑ جیسا مرد عظیم کیا کرتا ہے؟ یہ مرد عظیم جس خلافت کے لئے تڑپتا تھا وہ خدا کے لئے تھا نہ کہ اپنے نفس کیلئے لہٰذا فرمایا: ﴿**اما واللّٰہ لقد تقمّصا فلان [ابن ابی قحافہ] وانّہ لیعلم انّ محلّی منہا محلّ القطب من الرّحا**﴾ ’’آگاہ ہو جاؤ کہ خدا کی قسم فلان شخص (ابن ابی قحافہ) نے قمیص خلافت کو کھینچ تان کر پہن لیا ہے حالانکہ اسے معلوم ہے کہ خلافت کی چکی کیلئے میری حیثیت مرکزی کیل کی ہے‘‘ (نہج البلاغہ خطبہ/۳)۔ اس انسان کو یہ تکلیف ہو رہی تھی کہ خلافت ان کے ہاتھ سے جا رہی ہے۔ اگر ایک انسان صرف اسی ایک رخ کو پڑھے تو ضرور کہے گا کہ یہ شخص اقتدار کی کتنی خواہش رکھتا ہے۔ لیکن یہ وہ علیؑ ہیں جب انھیں مشروط پیش کش کی گئی دنیا کی ریاست دی گئی وہ مسترد کرنا بھی کسی اور وجہ سے نہیں تھا فقط اس لئے تھا کہ اس میں کتاب خدا اور سنت رسول کے خلاف شرائط تھیں۔ یہاں سے پتہ چلا کہ علیؑ جو خلافت کیلئے تڑپتے تھے تو وہ خود ان کی ذات کیلئے نہیں تھا بلکہ خدا کیلئے تھا۔

یہ وہ شجاعت نہیں جسکا مظاہرہ صرف میدان جنگ میں ہو بلکہ صبر کرنے کے دن شجاعت صبر ہے اور مسترد کرنے کے دن مسترد کرنے کے ذریعہ شجاعت کا مظاہرہ ہوا ہے اور اسکی بنیاد حبّ اللہ تھی نہ کہ صرف وجود خدا پر ایمان کیونکہ وجود خدا پر ایمان تو سبھی رکھتے ہیں بلکہ اس میں تو یونان کے فلاسفہ ارسطو، افلاطون وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اگر کوئی کام آتا تو ان لوگوں نے دین کے ساتھ کیا کیا اور دنیا کے ساتھ کیسے رہے؟

یہ عقیدہ تنہا کافی نہیں بلکہ ایسے کام کیلئے اعتقاد کے علاوہ حبّ اللہ کی بھی ضرورت ہے تب ایسے مواقف پیدا کر سکتے ہیں ہم دوسروں کی نسبت اس دنیا کو چھوڑنے کے زیادہ سزاوار ہیں۔ ہمیں اس سے پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ اولاً ہم نے اپنے آپ کو ایسی جگہ کھڑا کیا

ہے کہ ہم لوگوں کو خدا و آخرت کا راستہ دکھائیں گے اب یہ دیکھنا ہے کہ اس دنیا میں ہماری کیا ذمہ داری ہے اگر کوئی آپ سے یہ سوال کریے کہ کیا کام کرتے ہو یا آپ کے وجود کا کیا مقصد اور ہدف ہے؟ تو آپ کیا جواب دیں گے؟ آپ جواب دیں گے میں لوگوں کو آخرت کی طرف رہنمائی کرتا ہوں خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں عالم غیب کی طرف راغب کرتا ہوں تو پھر کیوں آپ کی اپنی دنیا آخرت سے کٹی ہوئی ہے؟ اور جب خود آپ کی دنیا آخرت سے کٹی ہوئی ہو تو اس صورت میں لوگوں کی دنیا آخرت سے نہیں ملے گی۔ بلکہ آپکی دنیا سے ملے گی اب اگر ایسی صورت میں ہم لوگوں کو اپنے سے باندھتے ہیں تو ہم مرشد نہیں رہے بلکہ راہزن میں تبدیل ہو گئے لیکن کونسے راستے کے راہزن اس راستہ کے جو خدا کی طرف جاتا ہے اور اس راستے پر بیٹھ کر لوگوں کو لوٹتے ہیں اور ان راہزنوں جیسے نہیں ہیں جو لوگوں کو شہروں میں لوٹتے ہیں بلکہ ہم لوگوں کو خدا کی طرف جانے سے روکتے ہیں اور اس راستہ کو بند کرتے ہیں اس صورت میں ہم خدا اور لوگوں کے درمیان پردہ ہوئے لوگوں اور قیامت کے دن کے درمیان ہم حاجب ہیں، ہر وہ انسان جس کے دل پر حب دنیا غالب ہے وہ خود ہلاک ہوگا۔ اگر ہم طلباء کے دلوں پر دنیا غالب ہوئی تو ایک طرف تو ہم خود ہلاک ہونگے اور ساتھ ہی دوسروں کو ہلاک کریں گے کیونکہ ہم مسئولیت و ذمہ داری کی جگہ پر کھڑے ہیں، ہم لوگوں کو خدا سے جوڑنے کے عنوان سے کھڑے ہیں لیکن ہمارے دل میں خدا نہیں تو ہم کیسے لوگوں کو خدا سے جوڑیں گے۔

ہم لوگوں سے زیادہ اولیٰ وسزاوار ہیں کہ اس بیماری سے پرہیز کریں کیونکہ ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم وارث انبیاء و اولیا ہیں۔ ہم پیغمبرؐ کے راستے پر چلنے والے ہیں ہم علیؑ حسنؑ وحسینؑ کے راستے پر چلنے والے ہیں۔ کیا ہم اس نسبت کو حاصل کرنے کی خواہش نہیں رکھتے؟ تو پھر ہمیں چاہیئے کہ اس بارے میں ہم دوسروں سے زیادہ اس نکتہ کا خیال ولحاظ رکھیں کیونکہ ہم ان ہستیوں کے اقوال کو بہتر سمجھتے ہیں اور ان ہستیوں کے کردار سے زیادہ واقف ہیں۔ کیا پیغمبر اکرمؐ نے نہیں فرمایا کہ ہم انبیاء اپنی وراثت میں سونا، چاندی اور زمین

نہیں چھوڑتے بلکہ علم وحکمت چھوڑتے ہیں۔ مولا علیؑ نے نہیں فرمایا کہ تم پر حکمرانی اور تمھاری خلافت میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی سوائے اس کے کہ اس سے حق قائم ہو اور باطل ختم ہو جائے۔ کیا علیؑ نے یہ چیز اپنی پوری حیات پر منطبق نہیں کی۔

علی ابن ابی طالبؑ خدا کیلئے کام کرتے تھے نہ کہ دنیا کیلئے کیونکہ اگر نعوذ باللہ علیؑ دنیا کیلئے یہ سب کچھ کرتے تو آپ کہہ سکتے تھے میں وہ بدقسمت انسان ہوں جس نے اپنے خون کو پہلے دن سے پیغمبرؐ کے حوالے کیا۔ ساری عمر دین کے دفاع میں گزاری، بغیر کسی تردد کے آگے بڑھتے رہے، موت کو کچھ نہیں سمجھا، علیؑ کا خون ہمیشہ بہنے کیلئے تیار تھا، وہ پیغمبرؐ کی وفات کے بعد بھی انکے مطیع وفرمانبردار رہے۔ اسلام کیلئے سب سے زیادہ مصیبتیں جھیلیں۔ اب اگر ہم دیکھیں کہ دنیا کے حوالے سے مولا علیؑ کو کیا ملا۔ کیا یہ مرد عظیم ایک عرصہ تک گوشہ نشین نہیں رہے، کیا ہزار مہینے مسلمانوں کے منابر سے علیؑ کو سب وشتم نہیں کیا گیا؟ وہی مسلمانوں کے منابر جو علیؑ کے جہاد سے، خون سے اور قربانیوں سے قائم ہوئے انہی سے علیؑ پر سبّ شتم ہوئی۔

لہٰذا علیؑ کو اس دنیا سے کچھ نہ ملا۔ نہ کوئی گھاس پھوس، نہ مال ودولت نہ کوئی منصب اور نہ ہی کوئی کنیت۔ لہٰذا دنیا داروں کے لحاظ سے علیؑ کو کچھ نہ ملا لیکن ان سب کے باوجود جب ابن ملجم نے آپؑ کے سر اقدس پر تلوار کا وار کیا تو آپؑ نے کہا: ''رب کعبہ کہ قسم میں کامیاب ہو گیا'' (بحار، ج۳۷، ص۵۹۔ الاستیعاب بھامش الاصابۃ، ج۳، ص۵۹)۔

اگر علیؑ اس دنیا کے لئے کام کرتے تو کہتے: میں بدقسمت انسان ہوں کیونکہ میں نے پوری عمر جہاد میں، قربانیاں دینے میں، خدا سے محبت کرنے میں گزاری لیکن ان سب کے بدلے میں کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ لیکن آپؑ ایسا نہیں فرماتے بلکہ فرماتے ہیں: ﴿فزت ورب الکعبہ﴾ ''خدا کی قسم میں کامیاب ہو گیا'' کیونکہ آپؑ اپنے دنیا کیلئے یہ کام نہیں کر رہے تھے، یہ سب خدا کیلئے انجام دے رہے تھے کیونکہ علیؑ کا وجود خدا کیلئے تھا، دین کیلئے تھا اس لئے کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ تو جب خدا سے ملاقات کا وقت قریب آیا تو کہا

کہ میں کامیاب ہوگیا۔ یہ وہ لمحات تھے جن میں علی خدا سے ملنے والے تھے۔علیؑ نے جو کچھ اس راستے میں برداشت کیا اسکا اجر ملنے والا تھا۔

تو کیا یہ امامؑ ہمارے لئے مثلِ اعلیٰ نہیں؟ کیا امام کی حیات ہمارے لئے قابل پیروی نہیں؟ کیا ہماری شریعت کے مصادر کتاب وسنت نہیں؟ کیا قول معصوم،فعل معصوم اور تقریر معصوم یہی سنت نہیں ہے ہمیں حبّ دنیا سے پرہیز کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ہمارے پاس دنیا نہیں ہے تاکہ ہم اس سے محبت کریں ہم کس چیز سے محبت کریں؟ کیا دنیا سے محبت کریں؟ ہم طلبہ!!! یہ دنیا کیا ہے کہ جس سے ہم محبت کریں اوراپنی تمام کوششوں کو اس میں ڈال دیں اور خدا کی رضایت اور خوشنودی کو چھوڑ دیں؟ اس چیز کو چھوڑ دینا چاہیئے جس کے پاس دیکھنے کی آنکھ نہیں ہے جس کے پاس سننے کیلیئے کان نہیں ہے جو بشر کے خیالات پر کوئی اعتراض نہیں کرسکتا۔ کیا ہے یہ دنیا؟ کیا چیز ہے؟ یہ دنیا' ہماری یہ دنیا وہمیات کا ایک مجموعہ ہے، سارے وہمیات وخیالات ہیں لیکن ہماری دنیا دوسروں کی نسبت زیادہ خیالی ہے۔ یہ وہمیات کا ایک مجموعہ ہے۔ ہم نے دنیا سے ایک محدود مقدار کے علاوہ کیا پایا ہے؟، ہم اُن میں سے نہیں ہیں جنھوں نے دنیا کی مال ودولت کو غارت کیا کہ جن کے بارے میں چند دن پہلے ہم نے گفتگو کی، ہم ایسے انسان نہیں ہیں کہ جن کی دہلیز پر جب دنیا آئی ہو تو انھوں نے آخرت کو آگے لاتے ہوئے دنیا کو چھوڑ دی ہو۔

دیکھیں ہارون الرشید کی دنیا کتنی بڑی تھی۔ ہمیں اپنی نفس کا اس سے موازنہ کرنا چاہیئے۔ ہم اس ہارون رشید کی دن رات سب وشتم کرتے ہیں کیونکہ وہ حبّ دنیا میں غرق تھا لیکن آپ لوگ جانتے ہی ہیں کہ وہ کس دنیا میں غرق تھا، وہ کتنے عالی شان محل میں زندگی گزارتا تھا، ہارون رشید کے لئے کتنی عیش وعشرت حاصل تھی، اس کی ریاست، خلافت اور سلطنت پوری دنیا پر چھائی ہوئی تھی، یہ تھی ہارون رشید کی دنیا۔

ہم کہتے ہیں کہ ہم ہارون رشید سے زیادہ افضل ہیں، ہم اس سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہیں عجبا! کیا ہارون رشید کی دنیا ہمیں ملی ہے کہ جسے ہم نے چھوڑ دیا ہوتا کہ ہم

اس سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہوجاتے۔ اے میرے فرزندو، عزیزو، اے اولادِ علیؑ آیا ہارون جیسی دنیا ہمارے سامنے آئی ہے۔ نہیں ہمارے سامنے جو دنیا آئی ہے نحیف وکمزور، محدود اور ذلیل ہے۔ ہماری دنیا جلد ہی پاش پاش ہونے والی دنیا ہے، بہت جلد ختم ہونے والی دنیا ہے، ہماری دنیا ایسی دنیا ہے جس میں ہم اپنے پاؤں پھیلا نہیں سکتے جس طرح ہارون رشید پاؤں پھیلا سکتا تھا۔ ہارون نے ایک دفعہ بادل کی طرف متوجہ ہوکر کہا کہ اے بادل تو جہاں برسے گا مجھے وہاں سے خراج آئے گا لہٰذا اتنی بڑی دنیا کیلیئے ہی اس نے موسی ابن جعفرؑ کو قید کیا۔ کیا ہم نے تجزیہ کیا ہے کہ اتنی بڑی دنیا ہمارے ہاتھ آئے تو ہم موسی ابن جعفرؑ کو قید نہیں کریں گے؟ کیا ہم نے اپنے نفس کا تجزیہ کیا ہے، کیا ہم نے یہ سوال اپنے نفس سے کیا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کو اپنے نفس سے اس سوال کو کرنا چاہیئے۔ اس دنیا کو اپنے اور اپنے خدا کے درمیان میں رکھو۔ ہارون رشید کی دنیا نے اُسے موسی بن جعفرؑ کو زندان میں ڈالنے کا حکم دیا کیا ایسی دنیا ہمیں ملی ہے تاکہ ہم یہ بتائیں کہ ہم اس سے زیادہ متقی اور پرہیزگار رہیں؟

یہ دنیا کیا ہے؟ ایک وہمی تصور ہے اس میں کوئی حقیقت نہیں حقیقت وہی ہے جس میں رضوان اللہ ہے۔ ہم طلباء کو علی کی سیرت پر چلنا چاہیئے ہم میں سے کوئی اگر دنیا حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ سب سے زیادہ بدبخت انسان ہے کیونکہ ہماری کوشش آخرت کیلیئے ہونی چاہیئے۔ ہمارے دلوں میں حب دنیا کی بجائے حب اللہ ہونی چاہیئے۔ یہ دنیا قابل اعتناء نہیں۔

ہمیں آئمہ طاہرین نے ہمیشہ سکھایا ہے کہ موت کو یاد کریں۔ حب دنیا کے مرض کی بہترین دوا یاد موت ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ یہ دنیا فانی ہے ہمیں ایک دن مرنا ہے ہمیں ہروقت اس کی اپنے لئے بھی فکر کرنا چاہیئے اور حبّ دنیا کا سب سے زیادہ اچھا علاج یہی ہے کہ یہ سوچے کہ ممکن ہے ابھی ان دو لحظوں کے درمیان موت آجائے۔ ہمارے دوست، احباب، والدین اس دنیا سے جاچکے ہیں۔ جتنی انہوں نے زندگی گزاری ہم اس سے زیادہ زندگی نہیں گزار سکیں گے۔ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ہم بھی اتنی ہی زندگی گزاریں گے۔ ہم میں

سے ہر ایک کو اس کے لئے تیار رہنا چاہیئے کیونکہ ہمارے عزیز دوسری جگہ منتقل ہو چکے ہیں۔ انکی خواہشات میں کوئی چیز باقی نہیں رہی ہیں۔ان کی ساری آرزوئیں ختم ہو چکی ہیں۔ اگر انھوں نے آخرت کے لئے کام کیا ہے جو ملکیت مقتدر کے پاس جا چکے ہیں، صدق وصفا کی طرف جا چکے ہیں وہی اچھا اجر دے گا اور اگر انہوں نے دنیا کیلئے کام کیا تو انکی دنیا ان سے کٹ گئی ہے ختم ہو چکی ہے۔

یہ ہمارے لئے عبرت ہے۔ یہ وہ عبرتیں ہیں جسے ہمارے آئمہ اطہار علیھم السلام نے ہمیں سکھائی ہیں۔ہمیں اپنے اندر سے خواہشات دنیا کو ختم کرنا چاہیئے۔ یہ دنیا کیا چیز ہے؟ یہ دنیا شاید چند دنوں کی ہے، شاید چند مہینوں یا چند سالوں کی ہے۔ہم کیوں اسے ایک طویل زندگی کی بنیاد دے کر اس میں زندگی کرنے کی لالچ کریں اور حرص کھائیں، ہم اگر اس دنیا کیلئے دفاع کریں تو شاید دس دن ،ایک مہینہ، دو مہینہ سے زیادہ دفاع نہیں کر سکیں گے، ہم نہیں جانتے کہ ہم کس چیز کیلئے دفاع کر رہے ہیں، ہم نہیں جانتے کہ ہماری اتنی قدرت ہوگی کہ ہم اس قدر غلطیوں کو اٹھا سکیں، اس قدر گناہوں کے بوجھ کو اٹھا سکیں، ہمارے خدا اور دین کے سامنے اتنے سارے تقصیرات لئے ہوئے، ہم ان سب کو کس چیز کا دفاع کرنے کی خاطر اٹھا رہے ہیں، دس دن ،ایک مہینہ، چند مہینہ کے لئے دفاع کرنے کے لئے؟ یہ سستا سامان ہے۔

آئیں خدا سے دعا کریں کہ وہ ہمارے دلوں کو پاک کر دے! ہماری ارواح کو پاک کر دے! ہماری ہمت میں اضافہ فرمائے! ہمارے دلوں میں اپنی محبت اور خشیت بھر دے! ایمان راسخ عنایت کرے اور ہمیں کتاب خدا پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

چہارشنبہ ۵ رجب ۱۳۹۹ھ

قرآن میں عمل (کام) صالح کا تصور

﴿اجعلتم سقاية الحآج وعمارة المسجدالحرام كمن اٰمن بالله واليوم الاٰخر وجاهد في سبيل الله لايستوٗن عندالله والله لايهدي القوم الظٰلمين ﴾ ''کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد الحرام کی آباد کاری کو اس شخص کے برابر قرار دیا ہے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان لایا اور جس نے راہ خدا میں جہاد کیا؟ اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے اور اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا'' (توبہ/ ۱۹)

﴿ما كان للمشركين ان يعمروا مسٰجدالله شٰهدين علٰى انفسهم بالكفر اولٰٓئک حبطت اعمالهم وفي النارهم خٰلدون. انمايعمر مسٰجدالله من اٰمن بالله واليوم الاٰخر واقام الصلوٰة واٰتى الزّكوٰة ولم يخش الاالله فعسٰٓى اولٰٓئک ان يكونوا من المهتدين ﴾ ''مشرکین کو یہ حق حاصل نہیں کہ مساجد کو آباد کریں درحالیکہ وہ خود اپنے کفر کی شہادت دے رہے ہیں ان لوگوں کے اعمال برباد ہو گئے اور وہ آتش میں ہمیشہ رہیں گے۔اللہ کی مسجدوں کو یقیناً وہی لوگ آباد کر سکتے ہیں جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہوں اور نماز قائم کرتے ہوں نیز زکوٰۃ ادا کرتے ہوں اور اللہ کے سوا کسی سے خوف نہیں کھاتے ہوں امید ہے کہ یہ لوگ ہدایت پانے والوں میں سے ہو جائیں گے'' (توبہ/ ۱۷، ۱۸)

﴿من عمل صالحًا فلنفسه ومن اسآء فعليها ثم الٰى ربكم ترجعون ﴾ ''جو نیکی کرتا ہے وہ اپنے لئے کرتا ہے اور جو بُرائی کا ارتکاب کرتا ہے اس کا وبال اسی پر ہے پھر تم اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے'' (جاثیہ/ ۱۵)

﴿ان الذين اٰمنوا وعملوا الصٰلحٰت سيجعل لهم الرحمٰن ودًّا ﴾ ''جو لوگ ایمان لائے ہیں اور نیک اعمال بجالائے ہیں ان کے لئے رحمٰن عنقریب دلوں میں محبت

پیدا کرے گا‘‘ (مریم/۹۶)

اس وقت ہم چند لحظہ ان آیات کے نورانیت اور روشنی کے سایہ میں گزاریں گے۔

ہم یہ جاننا نہیں چاہتے کہ اسلامی اقتصاد کے نقطہ نظر سے عمل (کام) کی کیا قدر و قیمت ہے اور ہم یہ بحث بھی کرنا نہیں چاہتے کہ سرمایہ داری مارکیٹ میں عمل انسانی کے بارے اسلام کا کیا موقف ہے وہ عمل انسانی جو سرمایہ داری مارکیٹ میں عمل (کام) کی اجرت کسی شے کی خرید وفرخت کی طرح پیش ہو رہی ہے اور یہ بازار کی دیگر اشیاء کی طرح طلب ورسد کے قانون کے آگے زانو ٹیکے ہوئے ہیں۔

ہم ان میں سے کسی ایک پر بھی بحث کرنا نہیں چاہتے بلکہ ہم اس کو ایک وسیع بحث کے لئے ہماری کتاب ''اقتصادنا'' پر چھوڑتے ہیں کیونکہ جن آیات کریمہ کے زیر سایہ ہم یہ چند لحظات گزار رہے ہیں (جن سے ہم کوئی مفہوم الھام لینا چاہتے ہیں) ان سے اسلامی نقطہ نظر سے عمل (کام) کے اقتصادی پہلو کے بارے میں کوئی کشف نہیں ہوتا بلکہ یہ عمل انسانی کے لئے ایک اعلیٰ ارفع ہمہ جانبہ قانون کو بتا رہا ہے جو کلی طور پر انسان کے عمل کی وضاحت کریں اور اجرت والے عمل جو خالص اقتصادی بحث سے متعلق ہے یہ آیات ان سے مختص نہیں ہے۔

پس ہم اس وقت اسلامی نقطہ نظر سے عمل (جو بھی عمل ہو) کی قیمت انسانیت اور جن اقدار پر وہ ایمان رکھتے ہیں اس نظر سے بیان کریں گے نہ اس اقتصادی نقطہ نظر سے کہ جس میں خریدے ہوئے کام کے بارے میں بحث کرتے ہیں جس میں محور پیداوار ہے اور مقام تقسیم میں اس کا حصہ۔

دوسرے الفاظ میں ہم آپ کو یہ بتا دیں کہ ہم ابھی یہ پڑھنا چاہ رہے ہیں کہ بشری عمل کی اخلاقی حوالہ سے کیا قدر و قیمت ہے نہ کہ اس کی اقتصادی حوالہ سے قدر و قیمت۔

پس وہ کون سے انسانی عمل (کام) ہے جن پر تعجب کیا جاسکے اور احترام کے لائق ہوں؟ یا وہ کون سے قواعد وضوابط ہیں کہ جن کا اتباع کرتے ہوئے ہم اس عمل یا اس عمل کی

قیمت کو کشف کر سکیں! اخلاقی اور معنوی اعتبار سے اس کی کیا اہمیت اور احترام کی کون سی درجہ سزاوار ہے؟

یہی وہ سوالات ہیں جن کا ہم اسلامی نقطہ ونظر سے جواب دینا چاہتے ہیں۔ ہم اس جواب کے حصول کو ان حقائق پر چھوڑتے ہیں جو ان آیات کریمہ سے ثابت ہوتے ہیں جو ہم نے اپنی گفتگو کی ابتداء میں سنے تھے اور جواب ہم اتنی مقدار میں چاہیں گے جو ہمارے محدود مقالہ سے مناسب ہو۔

اس سوال کا جواب جس مذہب سے بھی ہو حقیقت میں ان اخلاقی اقدار سے نکلیں گے جو یہ شخص اپنائے ہوئے ہے یہی مفاہیم طبیعت اہداف عامہ کے دائرے میں اس قیمت کو یقینی بنائیں گے جو یہ مذہب حاصل کرنا چاہ رہے تھے اور انہی قدر و قیمت سے وہ اقدار جس کی ایجاد کی کوشش کر رہے تھے ایجاد کریں گے یا بشریت کو اس سطح پر عروج دیں گے۔

عمل کی قیمت گزاری میں سرمایہ داری نقطہ ونظر:۔

سرمایہ داری تمدن اس حیثیت سے کہ وہ اجتماعی زندگی کے مصالح کے بانی ہیں اس کا ذیلی نظر انسان کے ایک دوسرے سے تعلقات پر ہے یہ ہر وہ کام کو ایک شریف اور احترام کے سزاوار عمل سمجھتے ہیں جو معاشرے کی مصلحت کا ضامن ہو اور انسانوں کے درمیان اجتماعی تعلقات کا مظہر ہو اور یہ تعلقات آزادی اور متبادل منفعت کی بنیاد پر قائم ہوں اس کا احترام اتنا ہی ہوگا جتنا اس میں خیر اور بھلائی ہو۔ اجتماعی اور عمومی زندگی کے میدان میں اس کا پھل جتنا زیادہ ہوگا وہ کام اس اندازہ میں قدر و قیمت کے لحاظ سے بڑا اور اسی اخلاقی حوالہ سے زیادہ تعریف کا مستحق ہوگا۔ یعنی عمل اس کے منافع کے حوالہ سے تولا جائے گا نہ کہ واقع نفسی کے اعتبار سے کہ جس سے خود یہ کام سرزد ہوا ہے جب کہ سرمایہ داری تمدن میں نفع کی رخ اپنی طغیان اور جنونی شکل میں ہو تو وہاں عمل کو اسی نفع کی سمت میں اچھا سمجھے گا حتی وہاں اس پر کام کرنے والے کو بھی اچھا سمجھے گا گرچہ اس کام کی محرکات انانیت یا ذاتی مفاد ہی کیوں نہ ہوں جیسا کہ ڈاکٹر کسیس کارل کے بارے میں مشہور ہے۔

پس اگر ایک بڑا سرمایہ دار سرمایہ داری عرف کے مطابق کوئی خدمت انجام دیے مثلاً کوئی اسکول بنائے اور سردیوں میں فقراء کے لئے سردی سے تحفظ کے وسائل فراہم کریے یا حکومت کو کسی مشکل وقت میں بغیر سود کے قرضہ دیدے۔ لیکن یہاں عمل (کام) اس درجہ اور مرتبہ تک نہیں پہنچتا جہاں ایک سیاسی مرد میدان اور مدبّر اپنے ملک کو سیاسی چنگل سے آزاد کرنے کیلئے کوشش کرتا ہے اور اس کی کھوئی ہوئی عزت کو دوبارہ اسے عطا کرتا ہے کیونکہ اس عمل کی مختلف پہلوؤں کے لحاظ سے یہ بہت بڑا ہے اور اس کا انسانی زندگی کے لئے منفعت بہت زیادہ ہے۔

لیکن وہ عمل جسے ایک سرمایہ دار انجام دیتا ہے کہ جو اپنے مفعول سے محدود ہے اور کچھ محدود مدت کے لئے ہوتا ہے جیسے اس نابینا کی حاجت کی طرح ہے کہ جو راستہ میں بھٹکا ہوا ہے آپ کا دل اس کے لئے تڑپتا ہے اور آپ اس کا ہاتھ پکڑ کر جس طرف وہ جانا چاہتا ہے اس طرف لے جاتے ہیں تو یہ کام بھی اچھا ہے لیکن سرمایہ داری عرف میں یہ کام اس عمل کے برابر نہیں جسے ایک سرمایہ دار انجام دیتا ہے کیونکہ ان کے نزدیک کام وہی اچھا ہے جو اہلیت اور ضخامت کے اعتبار سے نتیجہ خود کام کے برابر ہو۔

مارکسیزم کی نظر میں کام کی قیمت:۔

مارکسیزم کام کی قدر و قیمت کرنے میں کچھ حد تک سرمایہ داری فکر سے متفق ہیں اور کچھ اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ اجتماع میں دو طبقہ کے درمیان ایک جنگ جاری ہے جو کہ معاشرے کی مصلحت کو متناقض قرار دیا ہے یہاں کچھ مصالح ایسے ہیں جن کا قدیمی طبقہ دفاع کرتا ہے جس کی ضرورت آج دھیرے دھیرے ختم ہو رہی ہے اور یہ گروہ تاریخ کی حرکت میں رکاوٹ بن رہا ہے۔ ان کے مقابل میں کچھ دوسرے مصالح ہیں جو جدید طبقہ یا طبقات کے لئے ہے کہ جس کی جڑیں گزشت زمان کے ساتھ رشد و نمو پا رہی ہیں یہاں تک کہ وہ درجہ کامل تک پہنچ کر اپنے قدم پر خود کھڑیے ہونگے اور قدم قدیم پر طبقہ سے جنگ میں ہونگے اور اپنے حقوق اور مصالح کو طلب کرتے رہیں گے۔

پس اس وقت مسئلہ بعض فردی اعمال کو استثناء کرنے کے بعد نافع اور غیر نافع کا نہیں ہے بلکہ مسئلہ یہ ہے کہ کونسا عمل طبقہ جدید کے لئے نافع اور کون سا غیر نافع ہے یا اس کے ساتھ معارض ہے۔ لہٰذا مارکسیزم کی نظر میں ہر وہ عمل جو نئے گروہ کی مصلحت میں ہو اور ان کے لئے کسب کا ذریعہ ہو وہ اچھا اور قابل تعریف عمل ہے اور یہی تاریخ کو آگے بڑھنے میں کردار ادا کرتا ہے اور جو عمل پرانے گروہ کی مصلحت میں ہو اور اجتماع کو مزید پیچھے لے جاتا ہو اور اس طرح اس جنگ کو وہ طول دے رہا ہو.....وہ ناپسند اور بے کار عمل ہے۔ جب تک وہ ان عالی اہداف سے متفق نہ ہو جس کا مارکسیزم معتقد ہے اور اس کے وجود کو وہ ضروری سمجھتا ہے اور یہ اہداف نئے طبقہ کی مدد اور تاریخ کے راستہ میں رکاوٹ قدیم طبقہ کو دبانا ہے۔ پس مارکسیزم کی نظر میں مصلحت اور منفعت طبقاتی ہے۔ ان کے اخلاق اور ان کے فکر کے پروان چڑھنے میں اگر وہ عمل مدد کریں تو اچھا ہے ورنہ نہیں۔

اسی وجہ سے لینن نے اپنا وہ مشہور مقولہ بنایا ہے: ہمارے ہاں اجتماع سے ہٹ کر آداب نامی کوئی چیز نہیں۔ اجتماع سے ہٹ کر سارے آداب جھوٹ ہیں پس آداب وہی ہیں جو انقلابیوں اور مزدوروں کی منفعت میں کام آئیں۔

عمل کی قیمت گزاری میں اسلام کا نقطہ و نظر

اسلام عمل کی قیمت گزاری میں دوسروں سے بنیادی فرق رکھتا ہے۔ جو نظریّہ ہم نے اس بارے میں پہلے بیان کئے ہیں ان سے بنیادی فرق رکھتا ہے۔ آپس میں اس اختلاف کی برگشت وہ اہداف عالیہ اور بنیادی مقاصد ہیں کہ جن کا اسلام تحقق ہونے کا خواہشمند ہے۔ اسلام انہی اہداف سے اپنی اخلاقی اقدار کو اخذ کرتا ہے اور انہی اہداف و مقاصد عالیہ کے ذریعہ سرمایہ داری اور مارکسیزم سے فرق رکھتا ہے کیونکہ اُنکے اہداف محدود دائرہ کے اندر گھومتے رہتے ہیں۔

اسلام ہمیشہ عمل کے محرک کو اہمیت دیتا ہے نہ کہ اس کی منفعت کو۔ وہ عمل کی قدر و قیمت کو دافع سے لیتا ہے نہ کہ منافع سے۔ نیت کے بغیر کوئی عمل نہیں اور جب تک

نیت صالح نہ ہو عمل صالح نہیں ہوسکتا چاہے اس عمل کا منافع کتنا زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ اسلام اجتماعی تعلقات کے صرف خارجی مظاہر کو نہیں دیکھتا۔ اسلام فقط اجتماعی راحت اور عیش اور حیات انسان کی جانب کو کوئی اہمیت نہیں دیتا کیونکہ اسلام یہ ایمان رکھتا ہے کہ یہ پہلو اور وہ مظاہر ایک گہرے اور خطرناک صورت کی عکاسی کر رہے ہیں جو انسان کے داخل میں ہوتا ہے۔ جب تک کوئی گروہ اس حقیقت کو حاصل نہ کرے اور اسے اپنے اندر ایک خاص ڈھانچے میں ڈال کر رشد و نمونہ کریں وہ معاشرے میں قیادت نہیں سنبھال سکتا۔ پس اسلام کی نظر میں یہ مہم نہیں کہ لوگوں کے درمیان تعلقات ایک خاص انداز میں اچھی طریقہ سے ہوں یعنی ایسے تعلقات جن سے اجتماع کو فائدہ ملے بلکہ اسلام کی نظر میں اہمیت اس چیز کو حاصل ہے کہ ایک پاک و پاکیزہ انسان وجود میں آئے اور آپس کے تعلقات اس اندرونی نورانیت کے سائے میں ہو۔ مختصراً ہم یہ بتادیں کہ اسلام چاہتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو اسلامی طرز عمل پر قائم کرے، اسی بنیاد پر وہ انسان کے تربیت کا خواہاں ہے تاکہ ہر چیز سے پہلے اس کی اندرونی کیفیت اور روحی حالت اسلام کے مفاہیم کے مطابق ہو جبکہ سرمایہ داری نظام اس لحاظ سے بالکل خاموش ہے اور اُس نے انسان کو خود اس پر چھوڑا ہے۔ اُس نے لوگوں کے درمیان تعلقات قائم کرنے اور اس کے نتائج اور فوائد کو اہمیت دینے پر اکتفا کیا ہے لیکن فکری محرکات کی طرف کوئی توجہ بھی نہیں دیا ہے اور روحی رصدگاہیں کہ جو ان تعلقات کے پیچھے پوشیدہ ہیں یا وہ تعلقات جو انہی روحی رصدگاہوں کے پیچھے پوشیدہ ہیں ان کی طرف اس نظام سرمایہ داری نے کوئی توجہ نہیں دیا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام عمل کی قیمت اس کے محرک کو قرار دیتا ہے اور ان مقدمات اور فکری انظار کو قرار دیتا ہے جن کے نطق کے ذریعے اس عمل کی بیج بوئی جاتی ہے ان کی طرف توجہ کی ہے۔ لیکن اسلام کے علاوہ باقی نظاموں نے عمل کی قدر و قیمت کو اس نتائج میں فوائد، معاشرے کی حالات اور تأثرات کو بتایا ہے۔

عمل صالح کی حد بندی

پس عمل صالح کا وہ فکری عمومی دائرہ جسے اسلام نے معین کیا ہے وہ ایمان باللہ اور ایمان بہ آخرت ہے اور اس کے عوامل و اسباب: اسکے عواطف اور نیک رجحانات ہیں جو اس فکر کی چار دیواری سے ہم آہنگ ہوں، جن میں روحی اعتبار سے اس فکر سے وحدت پایا جاتا ہو۔ ان دونوں کے ملنے کے بعد انسان مسلم وجود میں آتا ہے اور عمل صالح وہ عمل ہے جو فکر کی اس چار دیواری میں ان عواطف اور نیک رجحانات سے وجود میں آتا ہے۔

اسی وجہ سے قرآن کریم نے ان دو اعمال کے درمیان موازنہ اور مقایسہ کو کلی طور پر ردّ کیا ہے جو ایمان عمومی کی چار دیواری میں انسان سے سرزد ہوتا ہے جس کے اسباب و عوامل الٰہی ہوتے ہیں اور دوسرا وہ عمل ہے کہ جو اس چار چوب سے بہت ہی باہر ہے اور اس کے عوامل و اسباب کچھ اور ہوتے ہیں لہٰذا یہ عمل جس کا نتیجہ اور منافع کتنا ہی کیوں نہ ہو اس کا عمل الٰہی کے ساتھ موازنہ نہیں ہوسکتا:

﴿اجعلتم سقاية الحاج وعمارة المسجدالحرام كمن اٰمن بالله واليوم الأخر وجاهدفي سبيل الله لايستؤن عندالله والله لايهدى القوم الظّالمين﴾ ''کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد الحرام کی آبادکاری کو اس شخص کے برابر قرار دیا ہے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان لایا اور جس نے راہ خدا میں جہاد کیا؟ اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہوسکتے اور اللہ ظالم قوم کو ہدایت نہیں کرتا'' (توبہ/ ۱۹)

اس آیت کریمہ کی تفسیر اور سبب نزول کے ذیل میں آیا ہے کہ شیبہ بن عبدالدار اور عباس بن عبدالمطلب دونوں اپنی کعبہ کی خدمت اور حاجیوں کی خدمت کے اجتماعی عمل پر فخر و مباحات کر رہے تھے شیبہ نے کہا کہ کعبہ کی چابی ہمارے پاس ہے لہٰذا ہم رسول اکرمؐ کے بعد سب سے اچھے لوگ ہیں جبکہ عباس نے کہا کہ حاجیوں کی مہمان داری اور مسجد الحرام کی دیکھ بھال ہمارے ذمہ ہے لہٰذا ہم پیغمبرؐ کے بعد سب سے افضل ہیں۔ ان کی نشست کے پاس سے مولا امیر المومنین حضرت علیؑ کا گذر رہا۔ انھوں نے دیکھا وہ دونوں اس عاطفہ

میں غرق تھے۔ان دونوں نے اپنی گفتگو کو علیؑ کے سامنے دہرایا اور اپنی فضیلت کا معیار دور جاہلیت کے اصول اور معیار کو گردانا تو علیؑ جو قرآن کے تربیت شدہ تھے،جنھوں نے اپنی زندگی پر قرآنی مفاہیم کا احاطہ کیا ہوا تھا فرمایا: کیا تم دونوں سے بہتر کسی شخص کی راہنمائی کروں تو انھوں نے کہا وہ شخص کون ہے آپؑ نے فرمایا جس نے تم دونوں کو اسلام میں داخل کیا،خدا پر ایمان لایا اور خدا کی راہ میں جہاد کیا۔تو آپ کی یہ بات ان دونوں کو ناگوار گذری اور انھوں نے کہا کہ ہم اپنا فیصلہ پیغمبرؐ سے کروائیں گے۔تو خداوند عالم نے یہ آیت نازل کی۔

(تفسیر نور الثقلین ج۲ص۱۹۳/۱۹۴)

تاکہ یہ بتا دیں کہ عمل کو ایمان کے دائرے میں الٰہی اسباب سے انجام پانا چاہیئے اور جو عمل اس دائرے سے باہر ہو اس سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا چاہے وہ عمل کتنا ہی مفید، کتنا ہی قدر و قیمت کا حامل کیوں نہ ہو۔کیونکہ اسلام میں عمل صالح کی بنیاد اس کی اپنی چار دیواری اور عوامل کے ذریعے انجام پانا ہے نہ کہ اسکے باہر کے مظاہر اور نتائج۔

اسی وجہ سے اسلام نے ربا کو حرام قرار دیا ہے اور اس عبادت کو جسے ایک عابد ایمانی دائرے سے نکل کر انجام دیتا ہے یا الٰہی تصور کے باہر انجام دیتا ہے اسے جرم وشرک قرار دیا ہے۔چاہے اس عمل کا معاشرے پر کتنا ہی اثر کیوں نہ ہو۔تو اس کے بعد ہمیں اس پر تعجب نہیں کرنا چاہئے کہ کبھی مسجد کی تعمیر بھی ایک باطل اور بیہودہ کام میں بدل جاتی ہے جب اسلامی دائرے سے باہر ہوگی۔اسلامی محرکات کے باہر انجام پائے تو یہ عمل صالح نہیں ہوگا جیسا کہ اس آیت کریمہ میں ذکر ہے:

ماکان للمشرکین ان یعمروا مسٰجدالله شٰهدین علٰی انفسهم بالکفر اولٰٓئک حبطت اعمالهم وفی النارهم خٰلدون. انمایعمر مسٰجدالله من اٰمن بالله والیوم الاٰخر واقام الصلٰوة واتی الزّکٰوة ولم یخش الاالله فعسٰٓی اولٰٓئک ان یکونوامن المهتدین ﴾ "مشرکین کو یہ حق حاصل نہیں کہ مساجد کو آباد کریں درحالیکہ وہ خود اپنے کفر کی شہادت دے رہے ہیں ان لوگوں کے اعمال

برباد ہو گئے اور وہ آتش میں ہمیشہ رہیں گے۔اللہ کی مسجدوں کو یقیناً وہی لوگ آباد کر سکتے ہیں جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہوں اور نماز قائم کرتے ہوں نیز زکوٰۃ ادا کرتے ہوں اور اللہ کے سوا کسی سے خوف نہیں کھاتے ہوں امید ہے کہ یہ لوگ ہدایت پانے والوں میں سے ہو جائیں گے"(توبہ/۱۷،۱۸)

اسی طرح اسلام نے چُھپا کر صدقہ کی طرف رغبت دلائی ہے اور بعض نیکیوں کو چھپا کر کرنے کی ہدایت کی ہے تاکہ اسکے عمل صالح کی شرائط پوری ہوسکیں۔اسلام چاہتا ہے کہ انسان اپنے عمل صالح کو تمام دھوکہ کے میدانوں سے دور رکھے تاکہ اسکے عمل کی قدر وقیمت اور معنویت باقی رہے اور اسکا نفسیاتی تصور سالم رہے۔جبکہ مغربی معاشرے میں یا دیگر غیر اسلامی معاشروں میں دکھاوے اور دھوکہ کے تمام تر وسائل استعمال کیئے جاتے ہیں تاکہ لوگوں کو سودمند کاموں کی طرف رغبت دیں حتی اس کی تعریف وتوصیف سے اس عمل کی ساری قیمت گر جاتی ہے۔اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ حقیقی معنوی و روحانی محرکات جو اسلامی معاشروں میں پائے جاتے ہیں وہ ان معاشروں میں نہیں ملتے۔اسلامی معاشروں میں خدا پر ایمان،معاد پر ایمان اور دنیا کا عالم آخرت سے ارتباط کا پہلو موجود ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب سب بشریت میں اجتماع اور تمدن کی زندگی کا آغاز شروع ہوا ہے تاریخ میں اخلاقی اقدار دین سے وابستہ رہا ہے۔

اس اسلامی فکر کے روشنی میں کبھی معاشرہ میں ایک حقیر اور مختصر سا کام اس عمل کی نسبت بلند وبالا درجہ کے ہوتا ہے جسے تاریخ نے چلایا ہے۔کبھی یہ شعور جو ایک اندھے پر شفقت کے لئے دل میں پیدا ہوتا ہے جب اسے راستے میں گرتا ہوئے دیکھے تو اسکا ہاتھ پکڑ لے تاکہ اسے راستے پر لگائے،خدا کی رضا کی خاطر،تو اس کا یہ عمل اس عمل سے ہزار گنا بہتر ہے کہ جس پر اجتماعی مصلحتیں مرتب ہوتی ہیں جن کے اسباب وعوامل مادی خواہشات ہوں اور وہ اسلامی دائرے سے باہر ہوں چنانچہ سورۂ قصص آیت ۸۳:

﴿**تلک الدار الاٰخرة نجعلها للّذین لایریدون علوًا فی الارض**

ولا فسادًا والعاقبة للمتقین ﴾ ''آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کے لئے بنا دیتے ہیں جو زمین میں بالا دستی اور فساد پھیلانا نہیں چاہتے اور (نیک) انجام تو تقویٰ والوں کے لئے ہے''

اس طرح اسلام نے ہر انسان کے سامنے راستہ کھلا رکھا ہے کہ وہ اپنی طاقت و قدرت کے مطابق ایک سودمند عمل انجام دے تاکہ انسان ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے اور اخلاقی اور روحانی کمالات اسے حاصل ہوں۔ اسلام نے معاشرہ پر یہ فرض عائد کر دیا ہے کہ وہ انسانوں کی قدردانی اور اتنی مقدار میں ان کی قدردانی کرے جس مقدار میں ان کے اعمال میں روحانی اور نفسانی قوت موجود ہو نہ کہ ان اعمال کی قدردانی کریں جو دکھاوے کے لئے ہوں اور اندر سے خالی ہوں خواہ کتنا بڑا ہی کیوں نہ ہو۔

بعض ذہنوں میں یہ بات آتی ہے کہ غیر اسلامی معاشروں میں اجتماعی عمل کی قدر و قیمت اسلامی معاشرہ سے جسے قرآن نے مقرر کیا ہے زیادہ ہے کیونکہ ہر چیز سے پہلے یہ ضروری ہے کہ معاشرہ کی مصالح زیادہ ہوں اور ان مصالح کی حمایت بھی ہو جائے لہٰذا جو بھی کام اس ہدف کے ساتھ ہو وہ ہماری مصلحت کے لحاظ سے اچھا عمل ہے ہمیں چاہئے کہ قدردانی کریں اور اس کی تعریف کریں تاکہ اور بھی لوگ ایسے کام انجام دیں ہمیں ان محرکات اور شرائط سے کیا غرض ہے جو اس عمل کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں اور جنھوں نے اس کام کرنے والے کو اس کے انجام دینے پر اکسایا ہے۔ جو چیز قابل قدر ہے وہ یہ عمل ہے جسے اس شخص نے انجام دیا ہے۔ اس نے ہمارے بچوں کیلئے ایک مدرسہ بنایا ہے اسکی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے کیونکہ یہ قدردانی اور تعریف شاید اسے اس کام میں اور زیادہ حوصلہ بڑھائیں تو اس سے ہمارے منافع میں اضافہ ہوگا۔ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونا چاہئے کہ اس پر سرمایہ لگانے والے کی اس کام میں شخصی مصلحت ہے یا اسکی خواہشات نے اسے اس عمل کی دعوت دی ہے جب تک یہ خواہشات اور اس کی شخصی مصلحت اسے اچھے امور اور معاشرہ کی خدمت کی طرف ورغلائے ہمیں ایسی بات نہیں کرنی چاہئے۔

لیکن اس طرح کا سطحی نظریہ کہ جو اعمال کی ظاہری حد تک محدود ہوتا ہے اور اس کی گہرائی میں نہیں جاتا یہ نظریہ ایک لحاظ سے رسالت اسلامی کی طبیعت سے ہی مختلف ہے اور دوسری طرف سے اسلام کے اس مفہوم سے مختلف ہے جس کے تحت اسلام عمل اور روحی اور فکری ہماہنگی کے درمیان کلی طور پر مرتبط ہے تو اس لحاظ سے بھی وہ نظریہ اس سے مختلف ہے۔ پس پہلی صورت میں اسلام فقط انسان کے باہر کے سلوک کو منظم نہیں کرتا بلکہ اسلام ایک پیغام ہے جس کا ہدف ہر چیز سے پہلے انسان کا بنانا ہے اور اسی کے ذریعے وہ انسان کو ایک لائق تحسین زندگی بخشتا ہے:

﴿**یاایّھا الّذین اٰمنوا استجیبوا للّٰہ وللرّسول اذا دعاکم لما یحییکم واعلموا انّ اللّٰہ یحول بین المرء وقلبہ وانّہ الیہ تحشرون** ﴾ ''اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہو جب وہ تمہیں حیات آفرین باتوں کی طرف بلائیں اور جان لو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہے اور یہ بھی کہ تم سب اسی کی طرف جمع کئے جاؤ گے'' (انفال/۲۴)

اسلام چاہتا ہے کہ وہ انسان کو ایک ایسی زندگی دے جو اسکے اندر کو بنائے صرف اسکے بیرونی مظاہر کو نہ دیکھے اور ایسے پیغام کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ انسان کی داخلی حالت کو چھوڑ دیں اور اس کی طرف صرف خارجی مظاہر کے لحاظ سے نظر کریں۔

اسلام عمل کو اس نظر سے دیکھتا ہے کہ جس فکری اور روحی چار دیواری اور ماحول میں اس عمل کا بیج بویا گیا ہو لہٰذا ممکن نہیں کہ ماحول کے مزاج اور اس کی فکری چار دیواری سے اسے خالی کریں۔

اسلام مقتضی حال کا منکر نہیں:

وہ اعمال جو غیر صالح فکری اور روحی ماحول اور دائرے میں انجام پاتے ہیں وہ کبھی مفید اور فائدہ مند کام ہوتے ہیں اگر چہ یہ اعمال عام طور پر شخصی اور برے مقاصد کی بنیاد پر انجام پاتے ہیں ......لیکن اگر ہم ایسے غیر صالح ماحول اور دائرہ میں عمل کی

نشوونما اور پھلنے اور پھولنے کی اجازت دیدیں کہ جو ایسے غیر اسلامی عرف میں ایسے اخلاق اورقوانین کے سایہ میں ہوتے ہیں ......تو کون ہمیں ضمانت دیگا کہ انسان ہمیشہ ایسے نافع اورفائدہ منداعمال انجام دیتے رہیں گے؟!اور یہ کیسے ممکن ہیں کہ ہم ایسے مفیداورفائدہ منداعمال کے منتظر رہیں جب کہ وہ اعمال اس کے دنیاوی اورفردی مصالح سے ٹکراتے ہوں؟!

اسی طرح ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ عمل کا انسان کے داخل سے مربوط ہوناہی وہ حقیقی راستہ ہے کہ جس پر چلنے میں مفید عمل کی استمرار، رشدونمواورلوگوں میں اس کے لئے حوصلہ افزائی پائی جاتی ہیں۔

قرآن میں آزادی

﴿قُلْ یٰاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً اَرْبَاباً مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾ ''کہہ دیجئے: اے اہل کتاب! اس کلمے کی طرف آجاؤ جو ہمارے اورتمہارے درمیان مشترک ہے، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اوراس کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ بنائیں اوراللہ کے سوا آپس میں ایک دوسرے کو اپنا رب نہ بنائیں پس اگرنہ مانیں تو ان سے کہہ دیجئے: گواہ رہو ہم تو مسلم ہیں۔'' (آل عمران ۶۴)

﴿زیّن للنّاس حبّ الشّھوات من النّسآء والبنین والقناطیر المقنطرۃ من الذّھب والفضّۃ والخیل المسوّمۃ والانعام والحرث ذالک متاع الحیاۃ الدّنیاواللّٰہ عندہ حسن المآب .قل اؤنبّئکم بخیرٍ مّن ذالکم للّذین اتّقواعندربّھم جنّاتٌ تجری من تحتھاالانھار خالدین فیھاوازواجٌ مّطھرۃٌ وّرضوانٌ مّن اللّٰہ واللّٰہ بصیرٌ بالعباد﴾ ''لوگوں کیلئے خواہشات نفس کی رغبت مثلاً عورتیں، بیٹے، سونے اور چاندی کے ڈھیر لگے خزانے، عمدہ گھوڑے، مویشی اورکھیتی زیب

وزینت بنادی گئی ہیں مگر یہ سب دنیاوی زندگی کے سامان ہیں اوراچھاانجام تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ کہہ دیجئے: کیا میں تمہیں ان چیزوں سے بہتر چیز نہ بتادوں؟: جولوگ تقویٰ اختیار کرتے ہیں ان کیلئے ان کے رب کے پاس باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے نیز ان کیلئے پاکیزہ بیویاں اوراللہ کی خوشنودی ہوگی اوراللہ بندوں پرخوب نگاہ رکھنے والا ہے'' (آل عمران/۱۴تا۱۵)

﴿وسخّرلکم مّافی السّماوات ومافی الارض جمیعًامّنہ انّ فی ذالک لاٰیاتٍ لّقومٍ یّتفکّرون﴾ ''اور جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اس نے اپنی طرف سے تمہارے لئے مسخر کیا غور کرنے والوں کیلئے یقیناً اس میں نشانیاں ہیں'' (جاثیہ/۱۳)

﴿ھوالّذی خلق لکم مّافی الارض جمیعًاثمّ استویٰ الی السّمآء فسوّاھنّ سبع سماواتٍ وھوبکلّ شیءٍ علیمٌ﴾ ''وہ وہی اللہ ہے جس نے زمین میں موجود ہر چیز کو تمہارے لئے پیدا کیا، پھر آسمان کا رخ کیا تو انھیں سات آسمانوں کی شکل میں بنادیا اوروہ ہر چیز کا خوب جاننے والا ہے'' (بقرہ/ ۲۹)

﴿لآاکراہ فی الدّین قدتبیّن الرّشدمن الغیّ فمن یّکفربالطّاغوت ویؤمن باللّٰہ فقداستمسک بالعروۃ الوثقالاانفصام لھاواللّٰہ سمیعٌ علیمٌ﴾ ''دین میں کوئی جبر واکراہ نہیں، بتحقیق ہدایت اورضلالت میں فرق نمایاں ہو چکا ہے، پس جو طاغوت کا انکار کرے اوراللہ پرایمان لے آئے بتحقیق اس نے نہ ٹوٹنے والا مضبوط سہارا تھام لیا اوراللہ سب کچھ خوب سننے اورجاننے والا ہے'' (بقرہ/ ۲۵۶)

آزادی انسان کے اندراصلی عاطفہ ہے:۔

آزادی کا تصوران مفاہیم میں سے ہے جہاں سے تمام انسانوں کے احساس اور شعورایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ یہ انسان کا اصلی عاطفہ ہے جو انسان کو آزادی سے جوڑتا ہے۔ یہ کوئی ایسی صفت نہیں جو تاریخ انسانی میں گزشتہ زمان کے بعد پیدا ہوئی ہو۔ نہ یہ

آزادی آج کے دنیا کے سوشولزم اور سرمایہ دارانہ نظام کا پیدا کردہ تحفہ و ہدیہ ہے اور نہ ہی آزادی آج کے نظام اشتراکیت کی پیداوار ہے۔ گرچہ دور جدید کے ترقی کے داعیوں نے اس صفت آزادی کو خود انسانوں کا استحصال کرنے کیلئے استعمال کیا ہے لیکن درحقیقت یہ آزادیِ انسان' انسان کے اندر سے نکلی ہے، اسکے عاطفہ میں ہے۔ تاریخ کے ہر موڑ پر اسکی شعاعیں نظر آئیں گی۔ انسان کی خلقت کے آغاز میں اسکے کرشمے مرکوز ہیں۔ دراصل انسان نے تاریخ میں ہمیشہ اپنے ابتدائی دور سے لیکر دور حاضر تک اس آزادی کے حصول کیلئے جنگیں لڑی ہیں۔ گرچہ یہ جنگیں اپنی شکل وصورت، طور وطریقہ اور اقتدار حاصل کرنے کے مقاصد واھداف میں مختلف ہی کیوں نہ ہوں۔

انسان کا یہ عمومی ظاہری عاطفہ جسکی تعبیر ہمیں خلقت انسانی کے اندر سے ملی ہے وہ اسکا ارادہ ہے۔ لہٰذا انسان اپنے جسمانی اور نفسیاتی ساخت میں ارادہ سے مجہز ہے۔ اسی ارادہ کی وجہ سے وہ آزادی کا خواہشمند ہے کیونکہ یہی آزادی ارادہ کے مالک ہونے کا عملی مظہر ہے اور اسی وجہ سے وہ اپنے اردہ کو اپنی مصلحت کی خاطر استعمال کرسکتا ہے۔ انسان کو یہ برا لگتا ہے کہ اس کے اعضاء و جوارح معلق ہو جائیں اسی طرح اسے اسکی آزادی کو چھیننا بھی برا لگتا ہے۔

آزادی کی حد بندی:۔

لیکن انسان ابتداء سے ہی اس چیز کا معتقد ہے کہ ایک عادی انسان جو ایک مربوط معاشرہ میں زندگی گزارتا ہو اس کیلئے غیر محدود آزادی نہیں دی جاسکتی کیونکہ ایک فرد کی غیر محدود آزادی معاشرے میں دوسروں کی آزادی سے متصادم ہوتی ہے اور اس کے نتیجہ میں اجتماعی نظام تناقضات اور تصادم کی سرحد تک پہنچتا ہے۔ رفتہ رفتہ اسکے اعضاء و جوارح خراب ہوتے ہیں۔ لہٰذا اپنے حصہ کی آزادی کے حصول کیلئے ضروری ہے کہ وہ دوسروں کی آزادی میں دخل اندازی سے دور رہے۔ اسکے لئے ضروری ہے کہ اپنی آزادی کے کچھ حصے سے دستبردار ہو جائے اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوگا کہ معاشرہ کے نظم و انتظام

اور اس میں تصرفات کے کنٹرول کیلئے جو قوانین وضع ہوئے ہیں ان کو تقویت ملے گی اور معاشرہ اس لحاظ سے ترقی کرے گا۔

یہاں سے واضح ہوا کہ آزادی مطلق ایک خیالی فکر ہے۔ انسان جب اجتماعی زندگی کا آغاز کرتا ہے تو اسکے لئے ضروری ہے کہ اپنی آزادی کے تحفظ کیلئے دوسروں کی آزادی کا بھی تحفظ کرے۔

آزادی مغربی تمدن میں:۔

مغرب کے جدید تمدن نے اس محدود آزادی کی حد کو کافی حد تک کم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے لوگوں کو انکی شخصی زندگی سے متعلق جتنا ممکن ہو آزادی دیا جائے کیونکہ شخصی زندگی کی آزادی وہی آزادی ہے جو دوسروں کی آزادی سے متصادم نہیں ہے لہٰذا ہر انسان کی آزادی وہاں تک باقی رہتی ہے جہاں سے دوسروں کی آزادی شروع نہیں ہوتی اور جب دوسروں کی آزادی شروع ہو تو اس کی آزادی کی انتہا ہے۔
معاشرے میں تمام افراد کو شخصی طور پر اتنی آزادی دینے کے بعد یہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ اس کا طریقہ استعمال کیا ہوگا، اس سے کیا نتائج برآمد ہونگے اور اس کا فکری اور عملی عکس العمل کیا ہوگا۔ جب تک ہر انسان اپنی تصرفات اور طور وطریقے میں اپنے میدان میں اپنے ارادہ کے نافذ کرنے پر قادر ہے اوپر ذکر شدہ دوسری چیزیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ لہٰذا ایک شرابی کیلئے کوئی قید نہیں کہ وہ کتنی شراب پیئے اور اپنی حس و بیداری کو آخری حد تک قربان کرے کیونکہ یہ اسکا حق ہے کہ وہ اپنی شخصی زندگی میں اس آزادی سے استفادہ کرے جہاں تک کہ اسکی آزادی دوسروں کا راستہ نہ روکے یا کسی بھی صورت میں دوسروں کی آزادی کیلئے خطرہ کا باعث نہ بنے۔

انسانیت نے اس آزادی کا نغمہ گا گا کر خود کو سکرات میں مبتلا کیا ہے۔ اور اسکے سائے میں ایک عرصہ سے مدہوش زندگی گزاری ہے۔ اس انسان نے پہلے ہی یہ احساس کیا تھا کہ وہ تمام قیود کو منہدم کرے گا۔ یہ عظیم حقیقت ہے جو گہرائی میں ہزاروں سال دبی

رہنے کے بعد پہلی بار نکل سکی۔ جب یہ پہلی مرتبہ آزاد ہوئے اور انھیں یہ موقع ملا کہ بغیر کسی خوف و پریشانی کے اس کی روشنی میں آگے بڑھیں۔

لیکن انکا یہ لذت بخش خواب زیادہ عرصہ تک نہ چل سکا۔ انسان آہستہ آہستہ بیدار ہونے لگا وہ درک کرنے لگا کہ اُسے آزادی کے نام سے ایک بڑی زنجیر میں جکڑا گیا ہے اور صحیح معنوں میں آزادی کے نام سے انسان کی خواہشات کو ختم کر دیا ہے۔ کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا اب بھی انسان کو ایک ایسی گاڑی میں چلا رہے ہیں جو ایک محدود مسافت کی طرف حرکت میں ہے۔ نہ وہ اپنی خواہشات کا مالک ہے اور نہ ہی کوئی تبدیلی لاسکتا ہے۔ اسکی تمام نظریں اسی محدود راستے پر لگی ہیں۔ وہاں پر کوئی ہے جو انسان سے یہ کہہ رہا ہے کہ یہ سواری ان تمام قید و بند کے ساتھ جو آپ کے ہاتھ میں لگی ہیں آپ کی آزادی کی سواری ہے اور آپ آزاد ہیں۔

آزادی اس انسان کیلئے دوبارہ کیسے قید بنی، کسطرح یہ محدود راستے کی طرف جانے والی سواری اسے قید و بند کی طرف لیکر جارہی ہے؟ لیکن کسطرح انسانیت اس تلخ اور ناگوار انجام سے ہوش میں آئے؟ یہ وہ حقیقت ہے جسکی اسلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے تشخیص کی تھی۔ اسلام نے انسان کو سطحی اور سرسری آزادی فراہم کرنے پر اکتفاء نہیں کیا جس میں آج کے اس نئے دور کے مغربی انسان پھنسے ہیں۔ بلکہ اسلام اسے بلندی پر لے کر گیا اور انسانیت کے لئے آزادی کا ایک گہرا مفہوم پیش کیا اور اسے انسانیت کی آزادی کا ایک انقلابی اعلان قرار دیا۔ یہ انقلابی اعلان صرف ظاہر شکل کی قید و بند پر نہیں ہے بلکہ یہ فکری اور نفسیاتی جڑوں پر ہے۔ اس آزادی کے ساتھ اسلام نے یہ ضمانت دی ہے کہ وہ اسے اعلیٰ وارفع نوع آزادی دے گا جو پوری تاریخ میں نمونہ رہے گی۔

آزادی اسلام کے سائے میں:۔

آزادی جو مغربی تمدن میں ہے اسکی ابتداء آزادی سے ہوتی ہے اور انتہا ہر قسم کی بندگی اور قید پر ہوتی ہے جیسا کہ بیان ہوا جب کہ اسلام میں آزادی اس آزادی کے

برخلاف ہے اور صحیح معنوں میں آزادی کا تصور اسلام میں موجود ہے کیونکہ اسلام میں آزادی خدا کی بندگی سے شروع ہوتی ہے اور انتہا دیگر تمام ذلت و بندگی سے آزادی دلانے پر ہوتی ہے:

﴿قل یٰاھل الکتاب تعالوا الیٰ کلمةٍ سوآءٍ بینناوبینکم الّانعبدالّاالله ولانشرک بہٖ شیئًاوّلایتّخذبعضنابعضًاارباباًمّن دون الله فان تولّوافقولوااشھدوابانّامسلمون﴾ ''کہہ دیجئے: اے اہل کتاب! اس کلمے کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ بنائیں اور اللہ کے سوا آپس میں ایک دوسرے کو اپنا رب نہ بنائیں پس اگر یہ مانیں تو ان سے کہہ دیجئے: گواہ رہو ہم تو مسلم ہیں'' (آل عمران/۶۴)

دیکھیں قرآن کریم نے ہر قسم کی بندگی سے آزادی کو اس بات پر قائم کیا جو صرف خدا کی بندگی ہے۔

انسان کا اپنے رب سے تعلق ہی محکم و پائیدار بنیاد ہے جو انسان کو دیگر لوگوں، کائنات اور طبیعت کے تمام تعلقات کے مواقع پر آزادی دلاتی ہے۔

انسان کی داخلی آزادی:۔

اسلام اپنی آزادی کا عمل اسکی داخلی کیفیت سے شروع کرتا ہے کیونکہ اسلام یہ سمجھتا ہے کہ انسان کو آزادی دینے کا مطلب یہ نہیں کہ اس سے یہ کہا جائے: یہ ایک راستہ ہے جسے ہم نے آپ کیلئے خالی کر دیا ہے آپ اس پر اطمینان سے چلیں، یہ صحیح نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں انسان اس وقت آزاد ہوتا ہے جب وہ اپنے راستہ کا خود انتخاب کریں اور راستے کے تعین کیلئے اپنی رائے کا تحفظ کر سکے اور اپنی جہت و سمت اختیار کرنے میں خود مختار ہو۔ یہ اس وقت ممکن ہے کہ انسان سب سے پہلے ان شہوات اور خواہشات سے آزاد ہو جنہوں نے اسکے نفس پر قبضہ کیا ہے تاکہ خواہشات ایک ایسا آلہ بن جائیں جو انسان کو اس کی ضروریات کی طرف اشارہ کریں نہ کہ یہ ایسی قوت بن جائیں جو انسان کے ارادہ کو اپنے

قابو میں لے کر اسے دھکیل دیں کہ جہاں انسان کی کوئی قوت اور طاقت نہ ہو۔ اگر انسان خواہشات کے پیچھے رہے تو اس نے اپنی آزادی کو پہلے مرحلہ میں ہی کھو دیا، اسکے لئے باہر کی کوئی چیز تغیر نہیں لاتی ہے۔ اسکے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے ہیں کیونکہ جب تک انسانی عقل واقدار اس حیوانی حکومت کی اسیری میں ہیں وہ اسیر ہی رہے گا، آزاد نہیں ہوگا۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بنیادی جو چیز انسانی آزادی کو حیوانی آزادی سے ممتاز کرتی ہے وہ انسان کا ارادہ ہے اگر چہ انسان اور حیوان دونوں اپنے ارادہ کو استعمال کرتے ہیں لیکن حیوان کا ارادہ ہمیشہ اس کی شہوات اور غریزہ کے سامنے مسخر ہے لیکن انسان کو خداوند متعال نے ایک ایسی قدرت سے نوازا ہے جس کی تحت وہ اپنے شھوات پر غلبہ پیدا کرسکتا ہے اور عقل کو حاکم بنا سکتا ہے یہیں سے انسانی حریّت کی تفسیر واضح ہو جاتی ہے اسی تفسیر میں اس کی انسانیّت کا راز چھپا ہے۔

اگر ہم انسان کو صرف ظاہری زندگی اور عملی سیرت میں منجمد سمجھیں اور اس کیلئے تمام ضروریات اور وسائل فراہم کریں اور اس کے شھوات کو پورا کرے جیسا کہ مغربی نئ تمدن نے انسان کے ساتھ کیا ہے ایسی صورت میں ہم نے آہستہ آہستہ انسانی حریّت کا خاتمہ کریں گے وہ بھی صرف اُس حریّت کیلئے جو شھوات حیوانی کیلئے تھی اور اس کی خاطر انسانی آزادی کو اسی کے اندر ختم دیں گے اور ہم اس شہوات نافذ کرنے کا وسیلہ قرار دیں گے اور جب یہ انسان درمیان راہ متوجہ ہوتا ہے تو وہ اپنے نفس کو ہمیشہ محکوم پاتا ہے نہ حاکم اور اپنے ارادہ میں بے بس دیکھتا اور صاحب ارادہ نہیں ہوتا ہے اس کے بالمقابل اگر ہم اس قدرت سے شروع کریں جس میں انسانی آزادی کا راز چھپا ہوا ہے اگر ہم انسانی آزادی کو رشد ونمو دیں اسے غذا دیں تو ہم نے ایک انسان کامل کی پرورش کی ہے نہ کہ ایک حیوان کی اور ہم نے اسے یہ احساس دلایا ہے کہ زندگی اس حیوانی سفر میں اپنی رسالت پیغام وذمہ داری کو سمجھنا ہے۔ ایسی حیوانی زندگی جس میں خواہشات اسے چلاتی ہیں۔ ایسے اعلیٰ اقدار جس کے حاصل کرنے کے مقابل یہ پست اور کم قیمت والے اہداف ومقاصد کچھ بھی

نہیں ہے جو انسان اپنی مادی زندگی میں حاصل کرتا ہے اگر ہم نے انسان کو سمجھایا اُعلی اقدار کی عظمت کیا ہے تو ہم نے انسان کو اس کے شہوات وخواہشات نفسی سے آزاد اور اس کو اسارات کی زندگی سے آزادی دلایا ہے اور اسے اپنے ارادہ کا مالک بنایا ہے اور ہم نے ایک قدرتمند آزاد انسان کو پیدا کیا جس کے پاس (لایاہاں) کہنے کی قدرت موجود ہے اس کا منہ بند اور اس کے ہاتھوں کو باندھے بغیر۔ قرآن نے انسان کو اُس شہوت سے جو اس کے ہاتھوں کو بند کرتی ہے اور پست لذّات سے جو اپنے مقیاث اور اصول کے تحت چلاتی ہیں اور اس مادّی وزمینی زندگی کے محدود اہداف سے نکال کر وسیع وعریض بلند وبالا اہداف کی طرف نکالا۔ چنانچہ سورۂ آل عمران آیت نمبر ۱۴،۱۵ میں ﴿زین للناس حب الشھوات﴾ آیا ہے یہی معرکہ اسلام کی نظر میں انسان کی آزادی کی بنیاد ضرورت اور نقطہ نظر ہے۔

انسان کے ہر قسم کی آزادی دھوکہ، جھوٹ، غلط اور ناجائز آزادی کے نتیجے میں آخرکار وہ اسی آزادی کے ہاتھوں قید وبند ہوگا ہم اس آیت کریمہ کی روشنی میں یہ بھی پاتے ہیں کہ جس طریقہ سے قرآن نے مدد لی ہے تاکہ انسانیّت کو شہوت وخواہشات سے نکالنے اور لذّتوں کی بندگی وغلامی سے آزاد کرنے یہی طریقہ ہے جس کے ذریعہ سے انسان کی تمام میدانوں میں تربیت کی جاسکتی ہے اسلام نے انسان کو زمین ومادہ کی بندگی اور لذّتوں کی غلامی جو جلد ہی ختم ہوتی ہے اس سے آزادی دلایا ہے اور آسمانوں، جنّت، اعلیٰ اقدار اور رضایت خدا سے مربوط کیا ہے ہم جانتے ہیں توحید ہی انسان کی سند ہے وہی انسان کو ہر قسم کی اندرونی بندگی سے آزادی دلاتا ہے ہمارے لئے ایک یہ ہی مثال کافی ہے تا اسلام کا عطا کردہ آزادی کے واضح نتائج کو درک کریں۔ کتنا فرق ہے اس حقیقی آزادی میں جو قرآن نے دیا ہے اور ان جعلی آزادیاں میں جس کی سرپرستی وقیادت نئ مغربی تمدن نے کیا ہے جسے قرآن نے آزاد کیا ہے وہ اس قدرت کے مالک ہے کہ جب قرآن نے ایک ہی کلمہ میں امت اسلامی کو شراب سے پرہیز کرنے کا حکم دیا ہے تو کہا ''شراب نہیں ہے'' تو اسی وقت شراب اس انسان کی زندگی کے قاموس سے محو ہوا جب کہ اس سے پہلے شراب اس

کی زندگی میں تھا اور اس کی زندگی کے ضروریات میں شامل ہوتا تھا کیونکہ اب یہ انسان اپنے ارادہ کا مالک ہے وہ شہوات کے مقابلہ میں خود کو آزاد جانتا ہے محرکات اور دفاعات کے مقابلہ میں وہ خود مختار ہے ایک ہی مختصر کلمہ سے وہ حقیقی معنوں میں حریّت کا مالک بنتا ہے۔ اس میں صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ اپنے کردار، سلوک میں خود مالک رہے۔

وہ امت جسے مغربی تمدن نے ایجاد کیا ہے اور اسے شخصی آزادی دیا ہے خاص طریقے سے آزادی کو اسے سمجھایا ہے اور مطمئن کیا ہے مغربی انسان کسی قسم کے ارادہ کا مالک نہیں اور نہ وہ اپنے وجود پر حاکم ہوسکتا ہے کیوں کہ اسے وہ ابھی تک اندرونی آزادی نصیب نہیں ہوئی ہے کیوں کہ وہ اپنے شہوات اور لذّتوں کے سامنے تسلیم ہوا ہے اور ایسا انسان اپنی وہ شخصی آزادی کے اندر محدود ہوتا ہے حتی کہ وہ اس میں کھو جاتا ہے۔ شراب کے خلاف سب سے بڑے تحریک چلانے والے حکومت آمریکا ہے اسے یہ قدرت حاصل نہیں ہوا کہ اُمت آمریکا کو اس شراب سے نجات دلائے حتی کہ حکومت آمریکا نے وہ تمام مادّی ومعنوی طاقتوں سے مختلف تنظیمیں اور اجتماعات کو نوازا تا کہ معاشرے کو شراب سے پاک کرے یہ واضح وروشن ناکامی اس انسان مغربی کے پاس بنیادی حقیقی آزادی کے فقدان کی نشانی ہے وہ صرف یہی کلمہ (لا) کہنے کی قدرت واستطاعت نہیں رکھتا چاہے جتنا بھی عقلی طور پر قانع کیا جائے کہ شراب مضر ہے وہ جس طرح انسانِ قرآنی (لا) کہتا ہے نہیں کہہ سکتا جب اس کی عقل کہتا ہے کہ یہ کلمہ لا پڑھے وہ نہیں پڑھ سکتا ہے لہٰذا وہ اپنے آپ کو شراب کی آزادی سے آزاد نہیں کرسکا کیوں کہ اس نے مغربی تمدن کے اندر زندگی گزاری ہے اور جب تک وہ اس ماحول وعقیدہ میں زندگی گزارتا رہے گا اس میں یہ خلل وفقدان باقی رہے گا۔

انسان کی آزادی اجتماعی دائرے میں:۔

قرآن کریم انسان کی اندرونی جنگ سے فارغ ہونے کے بعد اجتماعی میدان میں آزادی کی خاطر داخل ہوتا ہے۔ جسطرح قرآن کریم نے انسان کے اندرونی بتوں کو جو اسکی داخلی آزادی کو سلب کیئے ہوئے تھے توڑ دیا اسی طرح اجتماعی میدان میں جن بتوں کے

سامنے انسان خاضع وعبادت گزار بنا ہوا تھا ان سے آزاد کروایا:

﴿قل یٰاھل الکتاب تعالوا الٰی کلمةٍ سوآءٍ بیننا وبینکم الّا نعبد الّا اللّٰہ ولا نشرک بہ شیئًا وّلا یتّخذ بعضنا بعضًا اربابًا مّن دون اللّٰہ فان تولّوا فقولوا اشھدوا بانّا مسلمون﴾ ”کہہ دیجئے: اے اہل کتاب! اس کلمے کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ بنائیں اور اللہ کے سوا آپس میں ایک دوسرے کو اپنا رب نہ بنائیں پس اگر یہ مانیں تو ان سے کہہ دیجئے: گواہ رہو ہم تو مسلم ہیں“ (آل عمران/٦٤)

خدا کی عبادت وبندگی تمام انسانوں کو ایک موقع ومیدان میں اپنے خالق ومعبود کے سامنے کھڑا کرتی ہے۔ کسی بھی قوم وملت کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسری قوم وملت کو استعمال کرے اور انھیں اپنی بندگی میں لے۔ نہ معاشرے کے کسی گروہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دوسرے گروہ کے حقوق کو غصب کرے اور اسکی آزادی کو ختم کرے۔ اور اسی طرح کسی انسان کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے نفس کو دوسروں کیلئے بت کے طور پر نصب کرے۔

ہمیں ایک اور دفعہ یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ آزادی کے حصول کیلئے قرآن جنگوں میں سے اس دوسرے جنگ میں بھی اسی راہ اور طریقہ کو اپناتے ہوئے نظر آتا ہے جسے اس نے پہلے طریقہ میں اپنایا تھا اور قرآن کریم تمام جنگوں میں اسی طریقہ کو اپناتا ہے اور وہ طریقہ اور راستہ توحید ہے۔ جب انسان صرف خدا کی بندگی کا اقرار کرتا ہے اسکی عبودیت کو قبول کرتا ہے تو ایسی صورت میں وہ ہر قسم کی بت پرستی جعلی الوہیت، کسی بھی انسان یا موجود کے سامنے خاضع وبندگی کو مسترد کرتا ہے۔ وہ اپنا سر آزادی سے بلند کرتا ہے اور ہر قسم کی بندگی کو مسترد کرتا ہے۔ یہ دنیا کی کسی بھی قوت اور بتوں میں سے کسی بھی بت کے سامنے خاضع ہوکر اپنے اندر حقارت کا احساس پیدا ہونے نہیں دیتا کیونکہ انسان کی زندگی میں جو بت پرستی کا مظاہرہ ہے اسکے دو اسباب ہیں۔ ایک شہوت کی بندگی ہے جو انسان کو آزادی کے درجہ سے

تنزل دے کرایک انسانی بت کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے کہ جس سے اس کی شہوات کی اشباع ہوتی ہے اور اسے یہ شہوات فراہم ہوتی ہیں اور دوسرا سبب وہ بت پرستی ہے جس کے ضعف و ناتوانی سے وہ آگاہ نہیں ہے اس سے جاہل ہے لیکن جب اسلام نے انسان کوشہوات کی بندگی سے آزادی دلائی اوران فریب دینے والے اصنام سے پردہ چاک کرلیا تو اسکا حتمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اس بت پرستی پر غالب آئے گا اور اسکے اندر سے بت پرستی کی تمام شکل وصورت محو ونا پید ہوجائیں گی۔

انسان کا داخلی طور پر شہوات سے آزاد ہونے اور خارجی طور پر بتوں سے آزاد ہونے کے بعد (چاہے یہ بت امت کی صورت میں ہوں یا گروہ کی صورت میں یا فرد کی صورت میں) میدانِ عمل میں آزادی کا دور آتا ہے۔ یہاں سے اسلام کا مغربی نئے تمدن سے راستہ جدا ہوتا ہے کیونکہ مغربی تمدن انسان کے فردی میدان عمل میں کوئی حد معین نہیں کرتا۔ان کے پاس فردی آزادی کی حدود دوسروں کی آزادی تک ہیں جبکہ اسلام سب سے پہلے اس چیز کا اہتمام کرتا ہے کہ فرد مسلمان کو عملی طور پر شہوات کی بندگی،صنم پرستی سے آزادی دلانے کے بعد انسان کیلئے تصرف اور خودمختاری کا موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ جس طرح چاہے تصرف کرے اس شرط کے ساتھ کہ یہ تصرف اور خودمختاری خدا کی معین کردہ حدود سے تجاوز نہ کرلے جیسا کہ خداوند عالم فرماتا ہے:

﴿هو الّذی خلق لکم مّافی الارض جمیعًاثمّ استویٰ الی السّمآء فسوّاهنّ سبع سماواتٍ وهو بکلّ شیءٍ علیمٌ﴾ ''وہ وہی اللہ ہے جس نے زمین میں موجود ہر چیز کو تمہارے لئے پیدا کیا' پھر آسمان کا رخ کیا تو انھیں سات آسمانوں کی شکل میں بنادیا اور وہ ہر چیز کا خوب جاننے والا ہے'' (بقرہ/۲۹)

﴿وسخّر لکم مّافی السّماوات ومافی الارض جمیعًامّنه انّ فی ذالک لاٰیاتٍ لّقومٍ یّتفکّرون﴾ ''اور جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اس نے اپنی طرف سے تمہارے لئے مسخر کیا غور کرنے والوں کیلئے یقیناً اس میں نشانیاں

ہیں'' (جاثیہ/۱۳)

اس طرح ساری کائنات کوانسان کے اختیار میں دیا ہے اور اسے آزادی دی ہے لیکن یہ آزادی حدود میں رہ کر ملنے والی آزادی ہے کہ جس کی حد داخلی لحاظ سے شہوات کی بندگی سے آزادی ہے اور خارجی طور پر بت پرستی سے آزادی ہے۔لیکن شہوت پرستی میں آزادی ،زمین سے چپک جانا اور اس جیسے دوسرے امور میں آزادی،انسان کی حقیقی آزادی سے شانہ خالی کرنا وغیرہ ہے امّا بندوں کی عبادت ،ان سے قرب حاصل کرنے اور مصلحت کے پیچھے دوڑنے کی آزادی اور انسانی زندگی میں خدا کی طرف سے معین شدہ ذمہ داری اور مسئولیت سے فرار کرنے میں آزادی یہ سب ایسی آزادی ہیں جن کی اسلام اجازت نہیں دیتا کیونکہ اس قسم کی آزادی انسان میں ہر قسم کی آزادی کے حقائق کوختم کرنے اور نابود کرنے کے برابر ہے۔اسلام اس قسم کی آزادی کوقبول نہیں کرتا،اسلام آزادی کے نام سے انسان کوحیوانیت کے فروغ کا مرکز بنانا نہیں چاہتا۔ بلکہ اسلام آزادی کو اسکی فکری وروحی زندگی کا ایک جز کے طور پر سمجھتا ہے کہ جس پر انسانیت کی بنیاد قائم ہو۔

دین میں جبر نہ ہونے کا معنیٰ

﴿لاٰاکراه فی الدّین قدتّبیّن الرّشدمن الغیّ﴾ ''دین میں کوئی جبر واکراہ نہیں ہدایت گمراہی سے الگ اور واضح ہوچکی ہے'' (بقرہ/۲۵۶)

بعض لوگوں کوقرآن کریم کی اس آیت کریمہ کے بارے میں ایک غلط سوچ لاحق ہوئی ہے اور یہ گمان کرتے ہیں کہ قرآن نے انسان کو دین اپنانے میں آزاد چھوڑا ہے اور اس پر دین کے حوالے سے کسی قسم کی جبر واکراہ نہ ہونے کی سوچ دی ہے۔اس سوچ کے تحت یہ آزادی وہ ہے جسکا مغربی تمدن قائل ہے لیکن یہ ایک غلط سوچ ہے۔وہ اسلام جو انسان کو بت پرستی سے نکال کر توحید کی راہ پر استوار کرنے کیلئے آیا ہے اس کیلئے یہ ممکن نہیں کہ وہ انسان کو اپنی بنیاد سے تنزل کی اجازت دیدے اور وہ زمینی بندگی اور بت پرستی میں غرق ہوجائے ۔ اسلام عقیدۂ توحید کوایک شخصی وانفرادی سلوک کے طور پر نہیں مانتا لیکن

مغربی تمدن کے نزدیک یہ ایک شخصی اورانفرادی طور وطریقہ ہے جبکہ اسلام میں تمام تمدن کی بنیادعقیدۂ توحید ہے۔مغربی جمہوریت شخصی آزادی کی کتنی ہی بات کیوں نہ کرے اسے یہ ممکن نہیں کہ خودآزادی سے استفادہ کرتے ہوئے آزادی کے خلاف بغاوت کرے اورڈکٹیٹرشپ اورآمریت کوفروغ دیے۔اسی طرح اسلام کیلئے بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنے بنیادی اصول کے خلاف کسی بھی سرکشی کوقبول کرے۔

قرآن جب دین میں جبرواکراہ کوردکرتا ہے تو وہ اس حوالے سے ہے کہ رشدوگمراہی الگ ہوچکی ہے،حق وباطل میں تمیزظاہر ہوچکی ہے تو ایسی صورت میں جب حق کے مینار بلند ہیں،راستے روشن ہیں،ہرکسی کیلئے ظلمت وتاریکی اور روشنی میں فرق نمایاں ہوچکا ہے تو وہاں دین میں جبرواکراہ کامفہوم نہیں رہتا کیونکہ دین جامد کلمات نہیں جسے زبان پر دھرایا جائے،کوئی تقلیدی رسومات نہیں جواعضاء وجوارح سے انجام دی جائیں بلکہ یہ ایک عقیدہ ہے،ایک عمل ہے اورایک خاص قسم کی فکر رکھتا ہے۔

مواقع تغیر

قرآن نے انسان کو بت پرستی سے آزادی دلائی:۔

جس معاشرہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پرقرآن نازل ہواوہاں کے لوگوں کااللہ کے بارے میں یہ عقیدہ تھا کہ وہ خالق ہے وہی پورے عالم کامدبّر ہے جب ان سے پوچھا جاتا تھا کہ تمہیں کس نے خلق کیا ہے تو کہتے کہ خدا نے:

﴿**ولئن سالتهم من خلق السمٰوٰت والارض ليقولن الله**﴾''اوراگرآپ ان سے پوچھیں:آسمانوں اورزمین کوکس نے پیدا کیا؟تو کہیں گے:اللہ نے''(زمر/ ۳۸)

لیکن انہوں نے اپنی فکری کمزوری کی بنیاداورنبوت کا فاصلہ ہونے پر یہ فرض کیا کہ کوئی ایک وہمی واسطہ ان کے اورخدا کے درمیان میں موجود ہے اورانہوں نے ان واسطوں کے

بارے میں یہ بھی خیال کیا کہ یہ نفع ونقصان کی قدرت رکھتے ہیں۔ان واسطوں کوانہوں نے پتھروں سے بتوں کی صورت میں اتارااوران بتوں کوخدا کی عبادت میں شریک گردانا یعنی خدا کی عبادت اوردعا کرنے میں بھی ان کوشریک گردانا۔یہ واسطے کا تصوران کے ذہن میں رفتہ رفتہ اس اعتقاد پر منتہی ہوا کہ یہی واسطہ ہی خدا ہے اوریہی واسطہ کائنات کی تدبیر میں خدا کا شریک ہے۔یہاں تک کہ واسطہ اورخدا کے درمیان تمیزختم ہوگئی۔اس طرح بت پرستی بدترین شکل اختیارکرگئی اورعرب شرک وبت پرستی میں ڈوب گیااورانہی بتوں کومعبود گردانا یہاں تک کہ ہر قبیلے اورشہر کیلئے ایک خاص بت بنایا جاتا تھا بلکہ ہرگھر کے لئے ایک خصوصی بت بنایا۔مورخ کلبی کہتے ہیں: مکہ کے ہرگھر میں ایک بت ہوتا تھا جس کی وہ پوجا کرتے تھے اورجب یہ لوگ کسی سفر پر جاتے تو سب سے آخر میں اس بت کوہاتھ سے مس کرکے چومتے تھے جب سفر سے واپس آتے تو سب سے پہلے اسی بت کومس کرتے تھے اورخانہ کعبہ اوراس کے گردونواح میں ۳۶۰ بت موجود تھے۔

بت پرستی اپنے عروج کوپہنچی ہوئی تھی یہاں تک کہ عرب نے عمومی طور پر پتھر کومقدس سمجھنا شروع کیا کیونکہ اس سے بت بنایا جاتا تھااوراس کوایک قدسیت وتقدس اورالٰہی رنگ دیدیا تھا۔صحیح بخاری میں ابی رجاءعطاردی سے نقل ہوا ہے کہ اس نے کہا:''ہم پتھر کی پرستش کرتے تھے جب ہم اسی سے اچھے پتھر پاتے جس کی ہم پرستش کررہے ہیں تو اس کوچھوڑ کر دوسرے کاانتخاب کرتے جب کبھی پتھر نہ ملتے تو مٹی جمع کرتے اوراپنی بھیڑ یا بکری کے دودھ کودوھ کراس پر ڈالتے اوراسے بت بنالیتے تھے۔''

کلبی لکھتے ہیں کہ جب کوئی سفر پر جاتا تھا اورکسی جگہ قیام کرتا تو چار پتھر اٹھاتا اوران میں بہتروخوبصورت پتھر کوربّ کے لئے انتخاب کرتا اورباقی تین دیگ کے لئے چولھے کے طور پر استعمال کرتے اورجب اس جگہ سے کوچ کرتے توانہیں چھوڑ جاتے تھے۔عرب نے پتھر کی عبادت پر اکتفانہیں کیا بلکہ اس کی مختلف اقسام وانواع بنالئے۔وہ ملائکہ،جن اورستاروں کی پرستش کرتے تھے۔ان کااعتقاد تھا کہ ملائکہ خدا کی بیٹیاں ہیں اور

جن خدا کے شریک ہیں کیونکہ ان کا ایمان تھا کہ جن قدرت مند ہیں لہٰذا جن کی بھی پرستش کرتے تھے۔روایت ہے کہ قبیلہ حمیر سورج کی پرستش کرتے تھے۔قبیلہ کنانہ چاند کی پوجا کرتے تھے۔لخم اور جذام مشتری کی عبادت کرتے تھے۔قبیلہ اسد عطارد کی عبادت کرتے تھے۔قبیلہ طے ستارے سھیل کی عبادت کرتے تھے۔

عرب میں موجود یہود ونصارا ان مشرکین کی کثرت کے مقابلے میں کچھ نہیں کرسکتے تھے۔وہ خود تحریف اور باطل کے شکار ہوئے اور ان کا مذہب صرف شعار اور نشانیوں تک محدود ہو گیا تھا۔جب عالمی مسیحیت رومی بت پرستی میں گھل گئی تو ایک قسم کے شرک میں غلطاں صورت میں نمودار ہوئی۔

بلاد عرب میں نصرانیت ویہودیت کے دو نسخے ہیں۔ایک یہودیوں کا جو شام میں ہیں اور دوسرا نصاریٰ کا جو روم اور شام میں ہیں یہ دونوں ادیان انحراف کا شکار ہوئے۔

یہ تھی بلاد عرب میں شرک وبت پرستی کی صورت حال۔یہ کافی ہے کہ ہم جاہلیت عرب یا اس وقت کی جاہلیت جس میں عرب پستی میں گر گیا اور وہ خود دوسروں میں گھل گیا اور انسان عزت وشرافت وکرامت سے اتنا پستی میں گر گیا کہ وہ پتھر کی پوجا کرنے لگا اور اپنے وجود آرزو اور دکھ کو ایک مٹی کے ٹکرے سے جوڑنے لگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بت پرستی اور بندگی کا احساس اور معبود کے سامنے ذلت کا احساس اور ان کے سامنے سجدہ کرنا یہ سب انسان کے نفس کے اندر فکری اور روحی اثرات رکھتے ہیں یہاں تک کہ انسان کی عزت وکرامت کھو جاتی ہے اور اس کے اندر موجود قدرت وطاقت منجمد ہو جاتی ہے۔

اس کے اندر ہر قدرت اور طاقت کے سامنے خاضع وخاشع ہونا، تسلیم ہونا حاوی ہونا ہے گر چہ کائنات میں سب سے پست اور گری ہوئی کیوں نہ ہوں۔

پوری دنیا میں عقیدہ اور عبادت کی وضعیت بلاد عرب سے اچھی تو نہیں تھی کیونکہ بت پرستی اپنی مختلف شکل وصورت میں پوری دنیا پر چھائی ہوئی تھی لیکن وہ یا عملاً تھی جیسے

ہندوستان، چین اور ایران یا بطور غیر مستقیم پوشیدہ جیسے کہ یورپ کے مسیحی جن میں رومامی بت پرستی سرایت کر چکی تھی اور نصرانیت کے راستے مٹ چکے تھے۔

بتوں کی پوجا کرنا، بادشاہوں اور دینی سرابرہوں کی پوجا کرنا ہر جگہ پر رائج ہو گیا تھا۔کوئی انسان ایسا نہیں ملتا تھا جو اپنے جیسے یا اپنے سے پست موجود کی پرستش نہ کرتا ہو یا اس انسان کی عبادت کرتے تھے کہ عبادت اسی کی ہونی چاہئے اور اطاعت اور بڑائی کا بھی حق اسی کو حاصل ہے۔

اس جلتے ہوئے بت پرستی کے ماحول میں قرآن آیا تا کہ انسان کو اس گہرے غار سے اٹھایا جائے اور اسے بت پرستی اور ذلت وخواری سے آزادی دے دیں اور مختلف شکل وصورت اور غلط بندگی میں مبتلا انسان کو نجات دلائے اور اس کے بدلے میں عبادت وبندگی خالص خدائے واحد اور لاشریک کے عقیدے پر استوار کرے۔اور انسان کی کھوئی ہوئی عزت وکرامت کو واپس لائے۔

دیکھیں ان آیات قرآنی کی طرف توجہ کریں کہ کس طرح قرآن تاکید کرتا ہے کہ عبادت صرف خدا کے لئے مختص ہے اور انسان کو خدا کے علاوہ کسی بھی معبود کی بندگی سے آزاد ہونے کا شوق دلاتا ہے:

﴿**یٰایھا الناس ضرب مثل فاستمعوا له. ان الذین تدعون من دون الله لن یخلقوا ذبابًا ولو اجتمعوا له. و ان یسلبهم الذباب شیئًا لایستنقذوه منه. ضعف الطالب والمطلوب. ماقدروا الله حق قدره. ان الله لقوی عزیز**﴾ ''اے لوگو! ایک مثال دی جاتی ہے اسے سنو: اللہ کے سوا جن معبودوں کو تم پکارتے ہو وہ ایک مکھی بنانے پر بھی قادر نہیں ہیں خواہ اس کام کے لئے وہ سب جمع ہو جائیں اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو یہ اس سے اسے چھڑا بھی نہیں سکتے طالب اور مطلوب دونوں ناتواں ہیں۔لوگوں نے اللہ کی ویسی قدر نہیں کی جیسی قدر کرنی چاہئے تھی، اللہ یقیناً بڑا طاقت والا غالب آنے والا ہے'' (حج/۷۳تا۷۴)

﴿قل یاھل الکتٰب تعالوا الٰی کلمۃٍ سوآءٍ بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہٖ شیئًا ولا یتخذ بعضنا بعضًا اربابًا من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون﴾ ''کہہ دیجئے: اے اہل کتاب! اس کلمے کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے، وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ بنائیں اور اللہ کے سوا آپس میں ایک دوسرے کو اپنا رب نہ بنائیں پس اگر نہ مانیں تو ان سے کہہ دیجئے: گواہ رہو ہم تو مسلم ہیں'' (آل عمران/۶۴)

﴿اتخذوآ احبارھم ورھبانھم اربابًا من دون اللہ والمسیح ابن مریم ومآ امروآ الا لیعبدوآ الٰھًا واحدًا لآ الٰہ الا ھو سبحٰنہ عما یشرکون﴾ ''انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور راہبوں کو اپنا رب بنالیا ہے اور مسیح بن مریم کو بھی حالانکہ انہیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ خدائے واحد کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ ذات ان کے شرک سے پاک ہے'' (توبہ/۳۱)

قرآن کریم بت پرستی کے انواع واقسام پر غالب آیا اور انہی مشرکین میں سے ایک امت نہ صرف خدا پر ایمان لائی بلکہ ایک ایمان حقیقی ان کے رگ وپے میں دوڑنے لگا جو اس کی زندگی کے تمام شعبوں پر چھایا ہے۔

اس ایمان کے لئے قرآن نے اس وقت کے انسانوں کے نفوس میں ایک ایسا بیج بویا کہ جس دن سے ان کے دل میں ایمان گھسا وہ کئی انسانوں میں تبدیل ہوا۔ اس کے شعور میں عاطفہ، قوت نفس میں بلند اہداف اور کرامت وعزت کا احساس ہونے لگا۔ اس آنے والی دو مثالوں میں ہم آپ کو یہ مطالب واضح وروشن کرسکیں گے:

۱۔ابی موسیٰ نے نقل کیا ہے: جب ہم نجاشی بادشاہ کے پاس پہنچے تو وہ اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے اور عمرو بن عاص اس کے بائیں طرف تھا عمارہ اس کے دائیں طرف اور قسیسین ان کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ عمرو اور عمارہ نے نجاشی سے کہا کہ یہ لوگ آپ

کے لئے سجدہ نہیں کرتے۔ جب ہماری باری آئی تو ہم سے قسیسین اور راہب نے کہا کہ بادشاہ کے لئے سجدہ کرو تو جعفر نے کہا: ہم خدائے لاشریک کے علاوہ کسی کے لئے سجدہ نہیں کرتے۔ (البدایہ والنہایہ۳:۸۹)

۲۔سعد وقاص: جنگ قادسیہ سے پہلے ربعی بن عامر کو ایک پیغام کے ساتھ اپنا نمائندہ بنا کر ایران کے قائدِ لشکر وامیر رستم کے پاس بھیجا۔ جب ربعی اس کی مجلس میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ مجلس آبریشم ودیباج کے تکیوں سے آراستہ ہے اور وہ سونے کے تخت پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے سر پر ایک قیمتی دُرِ یاقوت سے مزین تاج ہے اس حالت میں ربعی پھٹے ہوئے بوسیدہ کپڑوں میں ایک زرہ اور چھوٹے قد کے گھوڑے کے ساتھ اس کے پاس پہنچے۔ اپنے گھوڑے پر سوار رہے اور اسی طرح بساط قائد کی طرف بڑھے نزدیک جب پہنچے تو اپنے گھوڑے کو کسی ستون سے باندھا اور اپنے اسلحۂ جنگ اور زرہ وخود کے ساتھ امیر کے سامنے حاضر ہونا چاہا تو نگہبانوں نے کہا کہ اسلحہ یہاں چھوڑ و تو اس نے کہا کہ ایسی حالت میں جانے دوگے تو جاؤں گا ورنہ واپس چلا جاؤں گا۔ جب انہوں نے رستم سے کہا تو اس نے اجازت دے دی اور ربعی اپنے نیزہ پر تکیہ کرتے ہوئے رستم کے پاس پہنچے رستم نے پوچھا کیوں آئے ہو؟ انہوں نے کہا خدا نے ہمیں اٹھایا ہے تا کہ اس کے بندوں کو کسی بندے کی پرستش سے نکال کر خدا کی پرستش میں لائیں اور اس تنگ دنیا سے ایک وسیع عالم میں اور اس ظلم وجور کے ادیان سے نکال کر اس عدل وانصاف والے دین اسلام کی طرف دعوت دے دیں (البدایۃ والنھایہ، ج۷، ص۴۶)

اسی طرح قرآن نے ایمان کے بیج بو کر مسلمانوں کو توحید، عبودیتِ خالص کے احساس کی تربیت دی اور ان لوگوں کو پتھروں کی پوجا کرنے اور اپنے قوم کے بڑے لوگوں کے سامنے خاضع ہونے سے نکالا۔ اس طرح انکی ایک امت واحدہ تشکیل دی جو غیر خدا کے سامنے خاضع نہیں ہوتی ہے اور نہ زمین پر کسی قوت کے سامنے ذلیل ہوتی ہے اور نہ کسی جبروت بادشاہ کے سامنے خاضع ہوتی ہے اور وہ اپنے اہداف کے ساتھ تغیر عالم کی طرف

بڑھتے تھے اور انہی مشکلات میں روئے زمین پر انسانوں کو توحید کا سبق سکھایا اور ان کو بت پرستی سے نجات دلانے جاہل معبود اور جاہلی ارتباط سے نجات دلانے کے لئے اٹھے۔

قرآن نے عقول کو آزاد کیا

افسانے اور خرافات گوئی عرب میں رائج تھے کیونکہ ان کی فکری سطح گری ہوئی تھی اور جہالت ان سب پر چھائی ہوئی تھی اور وہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ نفس انسان ایک پرندہ کی صورت جسم انسان میں چھپا ہوا ہے اور جب انسان مرجاتا ہے یا قتل کیا جاتا ہے تو یہ پرندہ جدا ہوجاتا ہے یہاں تک کہ وہ ایک بوم کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ جب وہ بوم چیختا ہے تو وحشت طاری ہوجاتی ہے اور وہ جہاں خرابہ اور قبرستان ہو اُنہی جگہوں میں رہتا ہے۔ یہ لوگ غیلان اور بوم کی کہانی پر ایمان رکھتے تھے اور گمان کرتے تھے کہ یہ غیلان خلوت میں انہیں آواز دیتے ہیں اور ترنم کرتے ہیں لیکن خود ان کے خواص کے لئے مختلف صورت میں نمودار ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ لوگ ان سے مخاطب ہوتے تھے اور بعض اوقات ان کی مہمانی بھی کرتے تھے اور ان کے لئے شعر بھی کہتے ہیں جسے ایک دوسرے کو نقل کر کے یاد کرتے تھے۔

ان کا عقیدہ تھا کہ انہی چہروں سے وہ شیطان کو اپنے راستے اور سفر سے دور کرسکتے ہیں اور اس کے علاوہ یہ اور بھی غلط عقائد رکھتے تھے جن کے یہ لوگ معتقد تھے۔

جب قرآن پیغام اسلام لایا تو ان غلط خرافات اور عقائد کے خلاف جنگ کی اور ان اوہام وخیالات کو اس طریقے سے ان کی عقل وفکر سے نکالا اور مٹایا کہ انہیں صحیح فکر کرنے، تدبیر کرنے، عقل پر اعتماد کرنے اور اندھی تقالید کو چھوڑنے کا پیغام دیا اور بغیر تفحص اور تحقیق کے گذشتگان کی وارثتی فکر پر جامد رہنے سے منع کیا:

﴿**واذاقيل لهم اتبعوامآانزل الله قالوابل نتبع مآالفيناعليه اٰبآء نااولو كان اٰبآؤهم لايعقلون شيئًاولايهتدون**﴾ ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے نازل کردہ احکام کی پیروی کرو تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اس طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباء واجداد کو پایا ہے' خواہ ان کے آباء واجداد نے نہ عقل سے کام

لیا ہو نہ ہدایت حاصل کی ہو'' (بقرہ/۱۷۰)

قرآن کی طرف سے یہ دعوت ہر اس گذشتہ اور وراثتی افکار کے سامنے پیش ہوئی اور نئی انداز میں منطق وعقل سے ان کی آزمائش کی۔ اسلام کی ہدایت کی روشنی میں ان تمام خرافات کو ناپید کرتے ہوئے ان کی غلطی کے بارے میں پردہ اٹھایا اور جاہلیت کے عقائد کو ختم کیا اور عقل کو ان سے آزاد کر کے فکر سلیم کی طرف ان کو متوجہ کیا۔

قرآن کریم نے خاص طور پر اس کائنات کے بارے میں فکر کرنے اس کے اسرار کے بارے میں غور وفکر کرنے اور خدا کی نشانیاں جو کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں ان کو کشف کرنے کی طرف رغبت دلایا ہے اور گذشتہ لوگوں کی خرافات اور افسانوں کے بدلے اس اچھی حالت میں رہنے کی طرف انسان کو متوجہ کیا ہے:

﴿**قل انظروا ماذا فی السمٰوٰت والارض وماتغنی الاٰیٰت والنذر عن قومٍ لایؤمنون**﴾ ''کہہ دیجئے: آسمانوں اور زمین میں نظر ڈالو کہ ان میں کیا کیا چیزیں ہیں اور جو قوم ایمان لانا ہی نہیں چاہتی ہو اس کے لئے آیات اور تنبیہیں کچھ کام نہیں دیتیں'' (یونس/۱۰۱)﴾

﴿**افلم یسیروا فی الارض فتکون لھم قلوب یعقلون بھآ اواٰذان یستمعون بھا فانھا لاتعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور**﴾ ''کیا ان لوگوں نے زمین پر سیر نہیں کی ہے کہ ان کے پاس ایسے ایسے دل ہوتے جو سمجھ سکتے اور ایسے کان ہوتے جو سن سکتے اس لئے کہ درحقیقت آنکھیں اندھی نہیں ہوتی ہیں بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں'' (حج/۴۶)

﴿**افلاینظرون الی الابل کیف خلقت**﴾ ''کیا یہ لوگ اونٹ کی طرف نہیں دیکھتے کہ اسے کس طرح پیدا کیا گیا ہے'' (غاشیہ/۱۷)

﴿**قل سیروا فی الارض فانظروا کیف بدا الخلق ثم اللہ ینشیء النشاۃ الاٰخرۃ ان اللہ علٰی کل شیءٍ قدیر**﴾ ''آپ کہہ دیجئے کہ تم لوگ زمین میں

سیر کرو اور دیکھو کہ خدا نے کس طرح خلقت کا آغاز کیا ہے اس کے بعد وہی آخرت میں دوبارہ ایجاد کرے گا بیشک وہی ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے'' (عنکبوت/۲۰)

قرآن نے کائنات اور اس میں موجود اسرار کے مطالعہ کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس مطالعہ کو ایمان باللہ سے ربط دیا ہے اور اعلان کیا ہے علم ایمان باللہ کے لئے بہترین راہنما ہے ۔ انسان کی کشف میں جتنا اضافہ ہوگا حقائق سامنے آئیں گے اتنا ہی ایمان کو قوت ملے گی ۔ اور اتنا ہی وہ آیات الٰہی کے بارے میں زیادہ آگاہی حاصل کرے گا ۔ خدا کی مصنوعات کے استحکام اور تدبیر کے بارے میں آگاہ ہونگے :

﴿سنریهم ایٰتنا فی الأفاق وفی انفسهم حتٰی یتبین لهم انه الحق اولم یکف بربک انه علٰی کل شیءٍ شهید﴾ ''ہم عنقریب اپنی نشانیوں کو تمام اطراف عالم میں اور اور خود ان کے نفس کے اندر دکھلائیں گے تاکہ ان پر یہ بات واضح ہوجائے کہ وہ برحق ہے اور کیا تمہارے پروردگار کے لئے یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ ہر شے کا گواہ ہے (حم سجدہ :۵۳)

اور سب کا دیکھنے کے ساتھ مقابلہ کرنے کی قدرت پیدا کی ۔ اس شہوت کی دھوکہ بازی اور اقسام وانواع کی خواہشات کے مقابلے میں تحمل اور استقامت دکھا سکتے ہیں اس سلسلہ میں قرآن نے جو تعلیم وتقریظ کی روشنی میں مسلمانوں کو تربیت دی اس کے چند نمونے ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں :

﴿زین للناس حب الشهوٰت من النسآء والبنین والقناطیر المقنطرة من الذهب والفضة والخیل المسومة والانعام والحرث ذٰلک متاع الحیاة الدنیا والله عنده حسن المأب. قل اؤنبئکم بخیرٍ من ذٰلکم للذین اتقوا عند ربهم جنات تجری من تحتها الانهار خالدین فیها وازواج مطهرة ورضوان من الله والله بصیر بالعباد﴾ ''لوگوں کیلئے خواہشات نفس کی رغبت مثلاً عورتیں ، بیٹے' سونے اور چاندی کے ڈھیر لگے خزانے ، عمدہ گھوڑے ، موشی اور کھیتی زیب

وزینت بنادی گئی ہیں مگر یہ سب دنیاوی زندگی کے سامان ہیں اور اچھا انجام تو اللہ کے ہی پاس ہے ۔ کہہ دیجئے : کیا میں تمہیں ان چیزوں سے بہتر چیز نہ بتادوں ؟ : جو لوگ تقویٰ اختیار کرتے ہیں ان کے لئے ان کے رب کے پاس باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے نیز ان کے لئے پاکیزہ بیویاں اور اللہ کی خوشنودی ہوگی اور اللہ بندوں پر خوب نگاہ رکھنے والا ہے'' (آل عمران/۱۴/۱۵)

یہ اور اس جیسے دوسرے نمونوں کی ترتیب سے قرآن اور اسلام کو یہ قدرت حاصل ہوئی ہے کہ انسان کو اس کے اندر کے شہوات سے جو اس کے نفس میں پیدا ہوئی ہیں آزاد کرائیں ۔

وہ خواہشات جو انسان کے نفس میں گردش کر رہی تھیں اور اسے اس کی خواہشات کی سمت لے جارہی تھیں کوئی طاقت وقدرت نہیں جو انسان کے ارادے کو مسخر کرے جب تک اس کے مقابلے میں کوئی دوسری طاقت وقدرت موجود نہ ہو ۔ اسی وجہ سے پیغمبرؐ نے انسان کو اس داخلی شہوت سے آزاد کرنے کے عمل کو جہاد اکبر کہا ہے ۔

اگر ہم اسلام میں خمر کے حرام ہونے کے واقعہ کا ملاحظہ کریں گے تو اس کی روشنی میں ہمیں یہ ممکن ہوگا کہ قرآن انسان مسلم کی خواہشات کی غلامی سے آزاد کرانے میں کس حد تک کامیاب ہوا اور انسان مسلم کے ارادے کو کس طرح تربیت دی اور اسے ان خواہشات کے مقابلے میں کھڑا کیا ۔ عرب جاہلیت کے دور میں شراب پینے میں بہت بری طرح سے غرق ہوئے تھے یہاں تک کہ ان کی زندگی کی ضروریات بن گئی تھی اور زندگی کا معمول وعادات بنی ہوئی تھی ۔ اگر آپ ملاحظہ کریں گے تو ان کی تاریخ وادب شعر کا بڑا حصہ شراب کی تعریف میں ملے گا ۔ یہیں سے آپ کو اس کا بھی اندازہ ہوگا کہ عربی زبان میں شراب کی مختلف اقسام وصفات اور نام بیان ہوئے ہیں ۔ شراب کی دکانیں ہمیشہ کھلی رہتی تھیں اور ان پر جھنڈے لگے رہتے تھے ۔ شراب کی تجارت کو اتنا فروغ ملا کہ اس وقت کلمہ تجارۃ خمر کی خرید وفروخت کا مرادف بن چکا تھا ۔ جب یہ قوم شراب خوری میں اس

طرح ڈوبی ہوئی تھی اس حالت میں آیت نازل ہوئی:

﴿یاایھاالذین امنوآانماالخمروالمیسروالانصاب والازلام رجس من عمل الشیطٰن فاجتنبوہ لعلکم تفلحون﴾ ''اے ایمان والو! شراب اور جوااور مقدس تھان اور پانسے سب ناپاک شیطانی عمل ہیں پس اس سے پرہیز کروتا کہ تم نجات حاصل کرسکو'' (مائدہ/۹۰)

قرآن نے ان سے فرمایا کہ شراب سے پرہیز کروتو مسلمانوں نے اپنی شراب کی مشکوں کوختم کیا، پھاڑنا شروع کیا، چاقو چھری سے ٹکرے ٹکرے کیا کہ شاید اس میں بچا ہوا نہ ہو۔یہ امت مسلمان ایک لحظہ میں تبدیل ہوئی شراب سے جنگ کر کے خودکو شراب کے استعمال سے بلندوبالاتر بنایا۔ یہ سب کیسے ہوا کیونکہ یہ امت اپنے ارادے کے خود مالک تھی شہوت کے مقابلے میں آزاد تھے وہ اس حیوانی شہوات کے مقابلے میں مزاحمت کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے وہ اطمینان سے واضح وروشن صورت میں اس موقف کی طرف دعوت دیتے تھے مختصر الفاظ میں ہم یہ بتادیں کہ وہ حقیقی آزادی سے بہرہ مند تھے اوراپنے طور وطریقے میں ایسی حقیقی آزادی کے حکم میں ہوتے تھے۔

اس کامیاب تجربے سے جوقرآن نے حرمت شراب کے بارے میں کیا ہے اس کے مقابلے میں ہمیں ایک اوردنیا ملتی ہے جواپنی تمدن میں بہت بلند پائے پر فائز ہے۔وہ یورپی تمدن ہے اس کی تمدن وثقافت نے شراب کوختم کرنے کا ایک تجربہ کیا۔امریکہ نے بیسویں صدی میں اپنی قوم کوشراب کے نقصان سے بچانے کی ایک مہم چلائی اور۱۹۲۰ء میں ایک قانون بنا کرشراب کوحرام قرار دیا۔اس قانون کے نفاذ کیلئے مختلف ذرائع وابلاغ سے تبلیغ شروع کی سینما گھروں ،ڈراموں سے،ریڈیو سے اور کتابیں لکھ کراور مجلّات کے ذریعے شراب کے نقصان کواجاگر کیا اوراس بارے میں دقیق اعدادوشمار پیش کئے اورانھوں نے شراب کے خلاف تبلیغات میں جورقم خرچ کی ہیں وہ ۶۵ ملین ڈالر ہیں۔شراب کے نقصانات اوراس سے روکنے کے لئے ۹۰ کروڑ صفحات لکھے گئے اوراعدادوشمار بتاتے ہیں

کہ قانونِ حرمت شراب کے اعلان ہونے کی پہلی دہائی دسمبر۱۹۳۳ء تک دوسوآدمیوں کوسزادی۔نصف ملین انسانوں کوزندان کیااوراس قانون کے خلاف کرنے والوں پرڈھیر سارے ملین ڈالرجرمانے وصول کئے اورمخالفت کرنے والوں کی املاک کوقومی ملکیت میں لیا جس کی مقدار۴۰۰ملین بنتی ہے۔آخرمیں امریکی حکومت مجبور ہوئی کہ شراب کی حرمت کا جوقانون بنایا تھااسے ختم کیا جائے لہٰذاوہ ۱۹۳۳ء کے آخرمیں اٹھالیااور یہ تجربہ ناکام ہوا۔اس تجربہ کی ناکامی کاواحدسبب یہ ہے کہ مغربی تمدن والے جہاں اپنی آزادی کی آوازبلند کرتے ہیں وہاں وہ یہ قدرت نہیں رکھتے کہ خودکوشراب سے آزادکریں وہ انسان کووہ حقیقی آزادی نہیں دے سکتے جوآزادی قرآن نے انسان مسلم کودی ہے۔ وہ ایسی آزادی ہے جوشہوات وخواہشات کے مقابلے میں دی ہے وہ آزادی حیوانی شہوات کے مقابلے میں قوت ارادی سے حاصل ہوئی ہے۔مغربی تمدن والے یہ گمان کرتے تھے کہ انسان ہرطرح سے آزادہو جہاں جانا چاہے جاسکتا ہے جوخرچ کرنا چاہے خرچ کرے اوران کے اندر سے ان خواہشات کوآزادکرنے کاعمل خودانسان پرچھوڑاتو مغربی انسان اپنی خواہشات کے اسیرہوئے، اپنے ارادے کے خود مالک نہیں ہوئے ،وہ خواہشات پرغلبہ نہیں پاسکے خواہ کتابی علم وثقافت کتنا ہی کیوں نہ حاصل کیا ہو۔

درس قرآنی

اراکین مجلّہ الاضواء سے معذرت چاہتا ہوں کہ انکی خواہشات کو پورا نہ کرسکا لیکن ہم اس کوشش میں ہیں کہ ان کے صفحات پر قارئین کرام کیلئے ایک درس پیش کروں۔ یہ ایک تحقیقاتی درس نہیں بلکہ ایک ایسا درس پیش کروں جو ہمارے موجودہ حالات اور زندگی سے متعلق ہو۔ اس حیثیت سے کہ ہم یہاں اسلام کے داعی ہیں اور رسالت اسلام کو پوری انسانیت تک پہچانے کی ذمہ داری کو اپنے دوش پر اٹھائے ہوئے ہیں۔

مجلّہ الاضواء نے مجھے قرآن کریم کے مجموعہ معارف میں سے کسی ایک زاویہ پر بحث کیلئے کہا۔ ہم نے انکا یہ محترم مطالبہ اس وقت وصول کیا جب ہم ایسی مصروفیات میں غرق ہیں کہ انکی طلب کو پورا نہیں کر سکتے۔ گرچہ یہ میرے لئے بہت گراں گزرا۔ میں نے اپنی معذرت کے بارے میں سوچا کہ ایک قرآنی بحث و درس پیش کرنے کیلئے بہت وقت کی ضرورت ہے اس کیلئے فراغت چاہیئے اور بہت زیادہ وقت۔ قرآن میں مستغرق ہونا ضروری ہے۔ لیکن اسکے علاوہ اجتماعی دروس جو ہماری حیات اجتماعی سے متعلق ہوں یہ ایک مختصر عمل ہے اور زیادہ زحمت طلب نہیں ہے اور اسکے لئے قرآن کی گہرائی میں جانے اور اس میں حل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآنی دروس آیات کریمہ میں منتشر ہیں، انسانیت کے حق، عدالت اور خیر کی طرف جانے والے راستے پر روشنیاں پھیلاتی ہیں انسان کے نفس کے اندر پوشیدہ اسرار سے پردہ اٹھاتے ہیں اور نفس انسانی کی قوت وضعف کے نقاط کو واضح کرتے ہیں۔ اور انسان کے داخل میں جو خیر و شر کے راستے ہیں ان پر بات کرتے ہیں کہ خیر کو کس طریقہ سے نمو مل سکتی ہے اور شر اور برائیوں کا اندر سے کیسے خاتمہ کیا جاسکتا ہے۔ جب یہ تمام باتیں قرآن کے اندر موجود ہیں تو ہم کیونکر یہ کوشش نہ کریں کہ بحث و تحقیق کی جگہ پر ایک سادہ درس پیش کریں۔ یہ ساری باتیں میں نے اپنے نفس سے

کیں اس وقت میں سورۂ مبارکہ توبہ کی آیت ۹۴ تلاوت کر رہا تھا:

﴿یعتذرون الیکم اذا رجعتم الیھم قل لاتعتذروا لن نؤمن لکم قد نبّانا اللّٰہ من اخبارکم وسیری اللّٰہ عملکم ورسولہ ثمّ تردّون الی عالم الغیب والشّھادۃ فینبّئکم بما کنتم تعملون﴾ ''جب تم ان کے پاس واپس جاؤ گے تو وہ تمہارے سامنے عذر پیش کریں گے۔ کہہ دیجئے: عذر مت تراشو! ہم تمہاری بات ہرگز نہیں مانیں گے اللہ نے ہمیں تمہارے حالات بتا دیئے ہیں اور عنقریب اللہ تمہارے اعمال دیکھے گا اور اس کا سوال بھی کریگا۔ پھر تم لوگ غیب و شہود کے جاننے والے کی طرف پلٹائے جاؤ گے پھر وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو''

اس آیت کی تلاوت کے دوران میں اپنے نفس پر قابو نہ رکھ سکا، میں نے تلاوت روک دی اور یہ سوچا کہ میں یہاں سے ایک درس اخذ کروں۔

وہ کونسا عذر ہے جسے اسلام کے داعی پیش کرتے ہیں؟

قرآن کریم اس آیت کریمہ میں عذر پیش کرنے والوں کے عذر کے شعلہ کو کاٹتا ہے اور پیغمبر اسلام کو بہ حیثیت داعی یہ موقعہ و اجازت نہیں دیتا کہ آپؐ لوگوں کے عذر کو قبول کریں۔ چنانچہ ایک جنگ سے واپسی پر اُن لوگوں نے عذر پیش کرنا شروع کیا جو آپ کے ساتھ نہیں گئے تھے۔

میں اس آیت کے حضور میں کچھ لمحات ٹھہرا اور اس آیت کے بلند معنی کو شگاف کیا اور اپنے پورے وجود و احساسات کے ساتھ اس پہاڑ جیسی دعوت کے مقابل کھڑے ہو کر اس عذر کو سنا جو منافقین یا رجعت پسند یا مصلحت پسند لوگوں نے جنگ سے پیچھے رہجانے کے سلسلے میں پیش کیا تھا۔ پھر اپنے آپ سے کہا: اس دفعہ قرآن کریم سے ہمارا یہی درس ہوگا اور ہم قرآن کریم سے یہ جان لیں گے کہ وہ کون سے عذر تھے جو اس نورانی قافلہ سے دور رہنے والے متخلفین میں ضعف بشری کی وجہ سے پائے جاتے تھے؟ اور ان عذروں سے کیسے مقابلہ کیا جائے؟

جب ہم انکے اس عذر کا سامنا کرتے ہیں جن کے بارے میں قرآن نے باطل ہونے کا کشف نقاب کیا ہے اور اس عذر کی جڑوں کو فاش کیا ہے جب ہم اسکو دیکھتے ہیں تو ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ جو عذر کل کے لوگ پیش کرتے تھے وہی عذر آج ہم پیش کر رہے ہیں۔ اسکے مضمون اور ذاتی محرکات یا سستی کے عنصر میں یکسانیت ہے۔ اسی طرح آج بھی اسلام کی طرف دعوت میں عذر پیش کرنے والوں اور پیچھے ہٹنے والوں کیلئے وہی مشکلات ہیں جو مشکلات اس وقت کے ایسے لوگوں کے سامنے تھیں اور اس دعوت میں مشکلات دونوں زمانوں میں ہیں۔ اس وقت جب کسی معرکہ میں کامیابی ہوتی تو یہ عذر پیش کرنے والے یہ کہنا شروع کرتے کہ ہم تو آپ کے ساتھ تھے ہماری امنگیں آپ کے ساتھ تھیں:

﴿ومن النّاس منْ يّقوْل امنّابالله فاذااوْذى فى الله جعل فتْنة النّاس كعذاب اللّٰه .ولئنْ جآء نصرٌمّنْ رّبّك ليقوْلنّ انّا كنّامعكمْ . اوليْس اللّٰه باعْلم بمافىْ صدوْر الْعالميْن﴾ ''اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں: ہم اللہ پر ایمان لے آئے لیکن جب اللہ کی راہ میں اذیت پہنچتی ہے تو لوگوں کی طرف سے پہنچنے والی اذیت کو عذاب الٰہی کی مانند تصور کرتے ہیں اور اگر آپ کے پروردگار کی طرف سے مدد پہنچ جائے تو وہ ضرور کہتے ہیں: ہم تو تمہارے ساتھ تھے۔ کیا اللہ کو اہل علم کے دلوں کا حال خوب معلوم نہیں ہے؟'' (عنکبوت۱۰)

اور اگر جنگ میں خسارہ ہوتا تو یہ پیچھے رہ جانے والے کہتے خدا کا شکر ہے کہ ہم ان کے ساتھ نہیں تھے:

﴿وانّ منْكمْ لمنْ لّيبطّئنّ فانْ اصابتْكمْ مّصيْبةٌ قال قدْانْعم اللّٰه علىّ اذْلمْ اكنْ مّعهمْ شهيْدًا﴾ ''البتہ تم میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو (جہاد سے) ضرور کتراتا ہے پھر اگر تم پر کوئی مصیبت آپڑے تو کہتا ہے: اللہ نے مجھ پر خاص فضل کیا کہ میں ان لوگوں کے ساتھ حاضر نہ تھا'' (نساء/۷۲)

اور عذر پیش کرنے والے یہ عذر پیش کرتے کہ راستہ بہت لمبا ہے:

﴿لوْكان عرضًاقريْبًاوّسفرًاقاصدًالّاتّبعوْك ولٰكنْ بعدتْ عليْهمُ الشّقّة .وسيحْلفوْن باللّٰه لو استطعْنالخرجْنامعكمْ يهْلكوْن انْفسهمْ واللّٰه يعْلم انّهمْ لكاذبوْن﴾ ''اگر آسانی سے حاصل ہونے والا کوئی فائدہ ہوتا اور سفر ہلکا ہوتا تو وہ ضرور آپ کے پیچھے چل پڑتے لیکن یہ مسافت انہیں دور نظر آئی اور اب وہ اللہ کی قسم کھا کر کہیں گے: اگر ہمارے لئے ممکن ہوتا تو یقیناً ہم آپ کے ساتھ چل دیتے (ایسے بہانوں سے) وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں اور اللہ کو علم ہے کہ یہ لوگ یقیناً جھوٹ بول رہے ہیں'' (توبہ/۴۲)

یہ وہی عذر ہے جسے اس وقت جنگ سے پیچھے رہ جانے والوں نے کیا اور اسی عذر کو آج کے لوگ دہرا رہے ہیں اور اسے اپنے وقت کی اصطلاح میں پیش کر رہے ہیں۔

گذشتہ لوگوں نے کہا کہ راستہ بہت لمبا اور دشوار ہے اور محدود وسائل سے اس راستہ کو طے نہیں کیا جا سکتا اور اس طویل راستے میں ان رکاوٹوں اور مشکلات پر ہمیں غلبہ حاصل ہونے کی بھی کوئی ضمانت نہیں ہے اور اسکے علاوہ ہمیں کوئی خاطر خواہ نتائج بھی نظر نہیں آرہے۔ وہ تو ابھی منزل کے ابتداء میں ہے تو اسے اس کے آخر کا کیسے پتہ چلے یا اسے راستہ کی آخر تک نظر رکھنا ممکن نہیں ہے پس ایسے حد سے زیادہ تاریک راستے پر ہم کیسے چلیں کہ خار دار بھی ہے اس کی طول وعرض ہماری نگاہوں اور قدرتوں سے بہت زیادہ ہیں۔

امت اس وقت سستی کے عنصر میں مبتلا ہے۔ اسلامی غربت کا حال اس وقت انکے افکار اور عقل پر حاوی ہے۔ اس وقت یہ مسئولیت سے دور رہنے کی عادی ہو چکی ہے۔ وہ ظالم استعمار جو اس امت پر گھات لگائے اپنی کمین گاہ میں بیٹھا ہوا ہے اور مغربی تمدن اپنے تمام تر داعیوں اور حامیوں کے ساتھ مسلمانوں کے راستے کی رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ اس وقت شخص داعی کیلئے ان کو ختم کر کے ان تمام حالات پر قابو پانا ممکن نہیں۔

راستہ بہت طویل ہے، مشکلات زیادہ ہیں، اگر سفر سیدھا ہوتا اور مقصد نزدیک ہوتا اور راستہ قریب ہوتا اور اہداف اتنا محدود ہوتے کہ ہماری نگاہوں کے احاطہ میں آجاتے

تواس وقت عمل کرنے کا موقع فراہم ہوتا۔

راستہ لمبا ہے اس میں کوئی شک نہیں لیکن ایک مسلمان جو دین کی طرف خدا کی طرف دعوت دیتا ہے اس کیلئے یہ کوئی چیز نہیں ہے کیونکہ اسے کوئی مادی فائدہ نظر نہیں آتا جو اسے اس عمل کے آخر میں ملے اور جب فتح یاب ہوجاتے ہیں تو اسے اس انعام کا تاج پہنا یا جاتا ہوتا کہ یہ لمبا سفر کے نہ کرنے کا سبب ہو بلکہ ممکن ہے کہ شاید کبھی راستہ کی انتہا تک پہنچنا اسے نصیب نہ ہو۔ ممکن ہے کبھی یہ صرف چند قدم چل سکے۔ لیکن اسلام میں مسلمان کیلئے ہدف حقیقی راستہ کو طے کرنا نہیں ہے، اسکی انتہا تک پہنچنا نہیں ہے، اسکا ہدف صرف فی سبیل اللہ کام کرنا ہے، اللہ کی خوشنودی کی خاطر کام کرنا ہے اور راستے کی لمبائی، قریبی، آسانی اور مشکلات عبور کرسکتا ہو یا نہ کرسکتا ہو ان سب سے قطع نظر (ورضوان من اللہ اکبر) اس مجاہد کیلئے اس سے بہتر اور کوئی ہدف ہو بھی نہیں سکتا جو اسکی کامیابی کیلئے ضمانت ہو بلکہ مسئلہ یہاں یہ ہے کہ بندہ خدا کی اطاعت کرتا ہے یا نہیں، اسکی نیت کیسی ہے۔ کیونکہ خداوند عالم نیت کی بنیاد پر اجر دیتے ہیں چاہے وہ آخری حد تک پہنچ چکا ہو یا وہ اس طویل راستے کی جس حد تک بھی پہنچ چکا ہو۔

﴿ماکان لاھل المدینۃ ومن حولھم من الاعراب ان یتخلفوا عن رسول اللہ ولا یرغبوا بانفسھم عن نفسہ ذالک بانھم لا یصیبھم ظمأ ولا نصب ولا مخمصۃ فی سبیل اللہ ولا یطؤن موطئا یغیظ الکفار ولا ینالون من عدو نیلا الا کتب لھم بہ عمل صالح ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین. ولا ینفقون نفقۃ صغیرۃ ولا کبیرۃ ولا یقطعون وادیا الا کتب لھم لیجزیھم اللہ احسن ماکانوا یعملون﴾ ''اہل مدینہ اور گرد و پیش کے بدوؤں کو یہ حق حاصل ہی نہیں تھا کہ وہ رسول خدا سے پیچھے رہ جائیں اور اپنی جانوں کو رسول کی جان سے زیادہ عزیز سمجھیں یہ اس لئے کہ انہیں پیاس کی تکلیف ہوگی اور نہ مشقت کی اور نہ راہ خدا میں بھوک کی اور نہ وہ کوئی ایسا قدم اٹھائیں جو کافروں کو ناگوار گزرے اور نہ انہیں

دشمن سے کوئی گزند پہنچے گا مگر یہ کہ ان کیلئے نیک عمل لکھا جاتا ہے بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا ثواب ضائع نہیں کرتا۔ اور (اسی طرح) وہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں خواہ چھوٹا ہو یا بڑا اور جب کوئی وادی (بغرض جہاد) پار کرتے ہیں تو یہ سب ان کے حق میں لکھ دیا جاتا ہے تاکہ اللہ انہیں ان کے اچھے اعمال کا صلہ دے'' (توبہ/۱۲۰،۱۲۱)

کون کہتا ہے راستہ خار دار نہیں ہے یہ وہ راستہ ہے جس پر امت کو نئے سرے سے لگانا ہے اور اس امت کو اس کے مرکز قرآنی کی طرف پلٹنا ہے کہ یہ امت وہاں سے منحرف ہوئی ہے۔ اسے سارے انسانوں کو بنانا ہے اور اسے آسمانی ڈھانچہ میں ڈھالنا ہے۔ لیکن کانٹا اگر اس کے ہاتھوں کو زخمی کرتا ہے جو اسے اکھاڑنا چاہتا ہے آخر میں ان کے ارادہ کو قوی اور تصمیم کو محکم بناتا ہے۔

یہ جو اسلامی دعوت کے راستے میں مشکلات ہیں یہ تاریخ میں انقلابی دعوت دینے والوں کو پیش آئی ہیں۔ اگر دعوت کا ہی سخت ہونا کافی ہوتا تو تاریخ اپنی جگہ منجمد ہوتی۔ اگر رسول اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غار میں چھپ جانے اور جاسوس ان کو ڈھونڈنے اور ان کو ختم کرنے کیلئے صحراؤں میں منتشر ہونے کے وقت یہ خبر دے دی جاتی کہ یہ تنہا بھاگنے اور فرار کرنے والا ایک دن قیصر و کسریٰ کے محل تک پہنچ جائے گا اور دنیائے ترقی اور تمدن سے جنگ لڑے گا اور تاریخ میں سب سے بڑا انقلاب لائے گا تو اس خبر کے پیچھے رہنے والے بولتے کہ یہ تو دیوانہ ہے وہ دیوانہ نہیں واللہ وہ دیوانہ نہیں:

﴿ان ھو الا ذکر للعالمین. ولتعلمن نباہ بعد حین﴾ ''یہ قرآن تو عالمین کیلئے ایک نصیحت ہے۔ اور کچھ دنوں کے بعد تم سب کو اس کی حقیقت معلوم ہوجائے گی''

(ص/۸۷،۸۸)

مصادر و مآخذ

تمهید و ترجمه تفسیر موضوعی امام الشهید الصدر (رضوان الله علیه)

☆معجم المفهرس الفاظِ قرآن کریم — محمد فؤاد عبدالباقی
☆معجم المفهرس الفاظ القرآن الکریم — محسن بیدارفر
☆کشاف الموضوعی القرآن الکریم — دارالقرآن الکریم
☆معجم مفصل لمواضع القرآن — محمد خلیل عیستانی
☆التفسیر و المفسّرون فی ثوبه القشیب — آیت الله هادی معرفت
☆تفسیروالمفسرون — دکتورمحمدحسین ذهبی
☆علوم القرآن عندالمفسرین — مرکزثقافه والمعارف القرآنیه
☆در سهیائی از علوم القرآنی — دکتر حبیب الله طاهری
☆معجم مفردات الفاظ قرآن — راغبِ اصفهانی
☆معجم التعبیرات القرآنیة — محمدادریس
☆ قاموس قرآن — سید علی اکبر قرشی
☆فرهنگ نامه قرآنی — آستان قدس رضوی
☆ترجمه قرآن کریم — علامه شیخ محسن علی نجفی
☆ترجمه قرآن کریم — علامه جوادیؒ
☆ترجمه قرآن کریم — ابوالأعلی مودودی
☆درسهایی از علوم قرآنی — دکتر حبیب الله طاهری

☆روش شناسی تفسیر قرآن — محمود رجبی
☆علوم القرآن عند المفسرین — مرکز الثقافة و المعارف القرآنیه
☆ المدرسة القرآنیة — آیة الله سید محمد باقر الصدرؒ
☆الاتقان فی علوم القرآن — علامه جلال الدین السیوطی
☆معیارها و عوامل تمدن از نظر قرآن — بنیاد باقر العلوم
☆علوم قرآن یا تفسیر موضوعی — آیت الله مرتضی حائری یزدی
☆علوم القرآن — السید محمد باقر الحکیم
☆السنن التاریخیة فی القرآن المجید — الشیخ الزکابی
☆بحوث فی تاریخ القرآن و علومه — ابو الفضل میر محمدی
☆الکون والانسان بین العلم و القرآن — بسام دفضع
☆اسرار الکوب فی القرآن — الدکتور داؤد سلمان السعدی
☆القرآن الکریم و روایات المدرستین — السید مرتضیٰ العسکری
☆بحوث فی اصول التفسیر و مناهجة — فهد بن سلیمان الرومی
☆منهج القرآن فی تطویر المجتمع — الدکتور محمد البهی
☆القرآن الکریم و التوراة و الانجیل و العلم — موریس بوکائی
☆سنتهائی اجتماعی در قرآن کریم — احمد حامد مقدم
☆الٰ القرآن الککریم — امام اکبر محمود شلتوت
☆علوم القرآن حول اعجاز القرآن — ڈاکٹر طٰہٰ الدیوانی
☆مجله رسالة القرآن — ش ٦ ص ١١
☆ظلم و اعتداء اهم آفات مجتمعات — شیخ علی کریمی
☆تفسیر قرآن فی القرن العشرین — سید محی الدین مشعل
☆الشهید الصدر — شیخ محمد ضیاء

☆محمد باقر الصدر — نخبت باحثین
☆موجز علوم قرآن — داؤد عطار
☆تفسیر اسلامی لتاریخ
☆حرکت التاریخ — محمد مهدی شمس الدین
☆قاموس اصطلاحات — وحید الزماں کیرانوی
فرهیگ رائد طلاب
☆مجله معارج
☆قرآن نهج و حضار — محمّد حسین شحازه
☆المقطف من عیون التفاسیر — مصطفی الحصن منصوری
☆التفسیر التیبان — الشیخ طوسیؒ
☆التفسیر المجمع البیان — طبرسی
☆التفسیر الشبّر — سید عبد الله شبّر
☆التفسیر الصافی — فیض کاشانی
☆التفسیر دُرِ المنثور — جلال الدین سیوطی
☆التفسیر الکبیر — علی امام فخرالرازی
☆التفسیر البیان — آیت الله ابوالقاسم الخوئی
☆تفسیر المیزان. — آیة الله محمد حسین طباطبائی
☆تفسیر الفرقان — آیة الله محمد صادقی تهرانی

فہرست مضامین

عرض ناشر ---------- ۱
تمہید ---------- ۷
علوم قرآن میں بنیادی علم خودفہم ودرک قرآن ہے ---------- ۲۴
قانون تاریخ آیات قرآنی کی رو سے ---------- ۳۴
قرآن کریم کے اسماء حُسنیٰ ---------- ۴۳
علوم قرآن ---------- ۴۶
وحی کی مختلف صورتیں ---------- ۴۳
پیغمبر اکرمؐ پر دو دفعہ نزول قرآن ہوا ---------- ۵۵
اسباب نزول قرآن ---------- ۵۹
اسباب نزول کی شناسائی کا فائدہ ---------- ۶۱
تعدد سبب تعدد منزل ---------- ۶۴
قرآن پیغمبرؐ کے زمانے میں جمع ہوا ---------- ۶۷
مکّی اور مدنی آیات میں فرق ---------- ۶۸
مکّی اور مدنی آیات کی پہچان کا طریقہ ---------- ۷۱
ان خصوصیّات کے بارے میں ہمارا موقف ---------- ۷۳
مکّی اور مدنی آیات سے متعلق شکوک وشبہات ---------- ۷۴
مکّی اور مدنی آیات میں حقیقی فرق ---------- ۹۲

اعجاز قرآن ۹۸
قرآن معجزہ ہونے کے کچھ دلائل ۱۰۱
تفسیر ۱۰۸
تاٴویل ۱۱۶
تفسیر و تاٴویل کے فرق کے بارے میں ہمارا موقف ۱۱۷
وہ شرائط جنکا ایک مفسر میں ہونا ضروری ہے ۱۲۲
تفسیر دورِ رسولؐ میں ۱۲۷
تفسیر قرآن میں پیغمبر اکرمؐ کا کردار ۱۳۴
تفسیر کس دور میں وجود میں آئی ۱۴۱
درس اوّل ۱۴۶
تفسیر توحیدی یا موضوعی ۱۵۰
درس دوّم ۱۵۹
تفسیر تجزئی پر منفی اور تفسیر موضوعی پر مثبت غلبہ ہے ۱۵۹
درس سوّم ۱۶۹
قانون تاریخ کے بارے میں قرآنی اہتمام ۱۷۱
تغییر اجتماعی کے دو زاویے ہیں ۱۷۳
درس چہارم ۱۷۹
قرآن میں قانون تاریخ کے بیان کرنے کا طریقہ ۱۷۹
قرآن میں تاریخ کا انکشاف ۱۹۳
درس پنجم ۱۹۵
۱۔ اطراد ۱۹۵
۲۔ قانون تاریخ ربّانی ہے ۱۹۷

۳۔ انسان کا مختار ہونا اور اس کا قانون تاریخ میں کردار ۲۰۱
میدان تاریخ میں قوانین ۲۰۳
درس ششم ۲۰۶
ظواہر تاریخ کی خصوصیّات ۲۰۶
فعل کا اجتماع سے تعلق ۲۰۸
اجتماعی اور فردی عمل میں فرق ۲۱۰
درس ہفتم ۲۱۶
۱۔ پہلی شکل (قضیہ شرطیہ) ۲۱۶
۲۔ فعلیت ناگریز ہے ۲۱۹
۳۔ قانون کی ساخت طبیعی شکل میں ۲۲۲
دین اس شکل کا روشن مصداق ہے ۲۲۵
درس ہشتم ۲۳۱
تعلقات اور انکی نوعیّت و کیفیت ۲۳۳
استخلاف قوانین میں سے ایک قانون ۲۳۶
درس نہم ۲۴۱
داخلی تغیر اور اجتماعی تغیر میں ارتباط ۲۴۴
مُثُل اعلیٰ بناء انسان کا مبداء حرکت ہے ۲۴۵
مُثُل اعلیٰ کی اقسام (اعلیٰ اقدار) ۲۴۸
پست اقدار ۲۴۸
پست اقدار اپنانے کی وجوہات ۲۴۹
درس دہم ۲۵۲
پست اقدار میں دینی رنگ ۲۵۲

پست اقدار کا غروب اور امت کا سقوط ---------- ۲۵۸
اس قوم کے بارے میں تاریخ کا فیصلہ ---------- ۲۵۹
۲۔محدود نظریّہ سے ماٴخوذ اعلیٰ اقدار ---------- ۲۶۱
۳۔مُثل اعلیٰ یعنی مُثل اعلیٰ حقیقی ---------- ۲۷۱
درس یازدہم ---------- ۲۷۳
انبیاء اور مترفین کی جنگ ---------- ۲۸۰
حرکت بشری میں اصول دین کا کردار ---------- ۲۸۵
درس دوازدہم ---------- ۲۸۹
حرکت تاریخ میں تعلقات اجتماعی کا کردار ---------- ۲۸۹
اس مشکل کا اسلامی حل ---------- ۲۹۳
درس سیزدہم ---------- ۳۰۳
تعلقات اجتماعی میں تاٴثیر متبادل ---------- ۳۰۳
درس چہاردہم ---------- ۳۱۷
حب اللہ وحب دنیا ---------- ۳۱۹
حُبِّ دنیا کے دو درجات ---------- ۳۲۱
قرآن میں عمل (کام) صالح کا تصور ---------- ۳۳۲
عمل کی قیمت گزاری میں سرمایہ داری نقطہ ونظر ---------- ۳۳۴
مارکسیزم کی نظر میں کام کی قیمت ---------- ۳۳۵
عمل کی قیمت گزاری میں اسلام کا نقطہ ونظر ---------- ۳۳۶
عمل صالح کی حد بندی ---------- ۳۳۸
اسلام مقتضی حال کا منکر نہیں ---------- ۳۴۲
قرآن میں آزادی ---------- ۳۴۳

آزادی انسان کے اندر اصلی عاطفہ ہے ---------- ۳۴۴
آزادی کی حد بندی ---------- ۳۴۵
آزادی اسلام کے سائے میں ---------- ۳۴۷
انسان کی داخلی آزادی ---------- ۳۴۸
انسان کی آزادی اجتماعی دائرے میں ---------- ۳۵۱
دین میں جبر نہ ہونے کا معنیٰ ---------- ۳۵۴
قرآن نے انسان کو بت پرستی سے آزادی دلائی ---------- ۳۵۵
قرآن نے عقول کو آزاد کیا ---------- ۳۶۱
درس قرآنی ---------- ۳۶۷
مصادر وماٴخذ کتاب تفسیر شہید الصدرؒ ---------- ۳۷۳
فہرست مضامین ---------- ۳۷۶

شہید الصدرؒ کی نظر میں کتب و مجلات کی قدر و قیمت

نجف اشرف میں اس زمانے میں ایسے اسلامی رسالے کی بنیاد رکھی گئی جس کا نصب العین یہ تھا کہ اسلامی مطالب و مفاہیم کے ذریعے جوانوں کی فکر و دانش کو نئے زمانے کی روشنی اور جدید اسلوب سے مخاطب کیا جائے اس رسالے کا نام "الاضواء الاسلامیہ" تھا۔ اس زمانے میں شہید باقر الصدرؒ ہی اس رسالے کا اداریہ تحریر فرماتے تھے جس کا عنوان آپ نے "رسالتنا" (ہمارا پیام) رکھا تھا۔

۱۳۸۳ھ میں اضواء اسلامی کے انتہائی پر مشقت، خاردار اور پر از پیچ و خم راستوں سے گذرتے ہوئے آپ نے اپنی رسالت کو جو کلمۃ اللہ ہے امت اسلامی کے کانوں تک پہنچا دیا۔ یہ تین برس خیر و الطاف، عنایتوں اور برکتوں سے پر زمانہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے۔ اگر چہ عام انسانوں کی عمر کے حوالے سے یہ عرصہ بہت ہی کم عرصہ ہے۔ لیکن دعوت الی اللہ اور فکری مہم پر نکلنے والوں کی یہ عمر عام انسانوں کے بیسیوں برس پر بھاری ہے، وہ بابرکت عمر جو مسلسل جد و جہد سے بھرپور تھی اس کا موازنہ ایک ایسے انسان کی عمر سے کیا جائے جس نے اپنے وقت کا ایک حصہ کھیل کود، خواب غفلت اور راحت و آرام میں گزارے ہوں ایک عادی انسان کی عمر سے اگر وقت کے اس حصہ کو نکال دیا جائے تو شاید بافائدہ اور بامعنی عمر جو کہ گذری ہے عمر اضواء سے زیادہ نہ ہوگی، عمر اضواء کا ایک دن جس میں اسے ہزار مشکلات کا سامنا ہو، اور جس میں اس نے ہزاروں انسانوں کی سماعت حق پر پڑے تالے کھولے ہوں، اور ان پر حق اور علم و نور کی شعاعیں برسائی ہوں، اور ان کی فکر و آرزو کو کلمہ حق سے جوڑ دیا ہو، اس حوالے سے اگر اضواء کے قارئین کی عمر اور اضواء کے ناشرین کی عمر کو شمار کریں، تو ایک ایسے انسان کے مقابل جس نے اپنے ساٹھ ستر برس محض خور و نوش، کھیل کود اور آرام و آسائش میں گذارے ہوں، عمر باقدر ہے یہ روز اول ہی سے عقل و رشد، اپنے واجبات و فرائض کی بروقت ادائگی اور اپنے اہداف صالح کی طرف پیش قدمی کرنے والی عمر تھی ۔ہم اس وقت مجلہ الاضواء کے محترم اراکین کی خدمت میں اپنے نیاز کو اس آیہ کریمہ سے اختتام پذیر کریں گے جو اس فریضے سے لیت و لعل کرکے پیچھے رہنے والوں کی شان میں نازل ہوئی ہے اور اس کی تلاوت کے بعد، وہ حضرات اپنے وقت کی قدر و قیمت اور اندازہ کر سکتے ہیں "اللہ کو ان کا قیام کرنا ناپسند تھا اس لیے اس نے (ان سے توفیق سلب کرکے) انھیں چلنے نہ دیا اور کہہ دیا گیا کہ تم بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو" (توبہ/۴۶)